دہشت گرد
طارق اسمٰعیل ساگر

فہرست

وڈیرا سائیں	۹
سنہرا جال	۳۱
بابا صاحب	۵۹
ہیڈ کوارٹر	۷۲
عفت مآب	۸۹
ٹارچر سنٹر	۹۹
پریس کانفرنس	۱۱۳
ٹریننگ کیمپ	۱۲۵
روایت	۱۳۰
مرحلے وفا کے	۱۷۳
سفر آخر سفر ہے	۱۹۹
احسان شناس	۲۰۷
باغی گروپ	۲۲۸
انقلابی تبدیلی	۲۵۰
شکار اور شکاری	۲۶۵
بےچارہ	۲۹۳
سیکورٹی والے	۳۰۹

قدرت کے کھیل	۳۲۷
پھر......	۳۳۶
انکشاف اور......	۳۵۴
آستین کے سانپ	۳۷۱
انتقام	۳۸۶
جال	۴۰۰
شکنجہ	۴۱۹
مکافات عمل	۴۳۲
قربتیں اور......	۴۶۵
زمین کا کوڑھ	۴۹۸
اغوا	۵۲۱
انجام	۵۳۶

انتساب

یہ کتاب نذر عقیدت ہے ان "چھوٹے افسران"
کو جو "سرکاری امور" کی انجام دہی میں اپنی جانیں ہار کر
"سرکار دربار" کی شان بڑھا گئے

آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے

یہ کتاب جو آپ پڑھنے جا رہے ہیں کسی خاص نقطہ نظر کے تحت نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب کو لکھنے کے لئے مجھے کوئی "تحریک" نہیں ملی۔ کوئی پشت پناہی نہیں ملی۔ البتہ طعن و تشنیع کے بے شمار تیر مجھ پر برسائے گئے کہ بدقسمتی سے ہر دہشت گرد نے یہی جانا گویا میں نے اس ناول میں اس کا کچا چٹھا بیان کیا ہے۔ میں نے بھی یہ جان کر ان تمام دھمکیوں اور بد زبانیوں کو اپنے لئے اعزاز جانا کہ اگر ملکی سلامتی کو درپیش خطرات کی نشاندہی کرنا، اگر ملک دشمنوں کو بے نقاب کرنا، اگر وطن فروشوں اور شیر مادر سے غداری کرنے والوں کے کالے کرتوت بیان کرنا کوئی جرم ہے تو یہ جرم پھر ہر پاکستانی کو بار بار کرنا چاہئے۔

اکتوبر ۹۸ء کے آخری عشرے میں ہماری ملی تاریخ کا بدترین اور سب سے گھناؤنا واقعہ پیش آیا جب حکیم محمد سعید کو کچھ دہشت گردوں نے محض اس لئے گولیوں سے چھلنی کر دیا کہ وہ ان کی ناجائز خواہشات کے سامنے جھکے نہیں تھے، بکے نہیں تھے۔

حکیم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو شہید کرنے والے وہی وحشی تھے جنہوں نے پاکستان کی اقتصادی شہ رگ شہر نگاراں کراچی کو طویل عرصے سے یرغمال بنا رکھا ہے۔ ان لوگوں نے طویل عرصے سے "ناں" لفظ نہیں سنا تھا۔

وہ اپنی ہر ناجائز خواہش کا جواب "ہاں" میں سننے کے عادی ہو گئے تھے۔

اور اس جرم بے گناہی میں حکیم محمد سعید کو انہوں نے مار ڈالا۔

لیکن ـــــ اس مرتبہ وہ شاید بھول گئے کہ جہاں انسانیت بے بس ہو جائے جہاں انسانی ضابطے دم توڑ جائیں وہاں پھر مکافات عمل شروع ہو جاتا ہے۔

اور ـــــ اب وہ مکافات عمل کا شکار ہوں گے۔

میرا ایمان ہے پاکستان کا کوئی شہری، کوئی سیاسی، مذہبی جماعت یا گروہ غدار نہیں اور

کراچی ------- تو پاکستان کے معماروں کا شہر ہے۔ یہاں وہ بزرگ اور بیٹے بستے ہیں جنہوں نے اس ملک خداداد کو بسایا تھا۔ وہ غدار نہیں ہو سکتے۔ وہ دہشت گرد نہیں ہیں۔

دہشت گردوں کے نام نہیں ہوتے، شناخت نہیں ہوتی۔

یہ بے شناخت چہروں والے انسان نما درندے زمین کا کوڑھ ہیں۔ اپنی زمین کو اپنے نظریے کو اور مادر وطن کو چند ٹکوں کے عوض، چند رذیل خواہشات کی تکمیل کی قیمت پر دشمن کے پاس گروی رکھنے والے ان لوگوں کا تعلق پاکستان کی کسی سیاسی مذہبی جماعت سے نہیں۔

ان کی سزا یہی ہے کہ یہ "بے شناخت" اور "بے وطن" رہیں۔

قارئین کرام! اب آپ جان لیجئے کہ اس کتاب کو لکھنے کے پس پردہ صرف ایک ہی تحریک ہے، ایک ہی مقصد ہے، ایک ہی لگن ہے۔

اور ---- وہ ہے پاکستان دوستی۔ یہ کتاب پاکستان دوستوں کے لئے لکھی گئی ہے۔

گر قبول افتد زہے نصیب

طارق اسمٰعیل ساگر۔ لاہور

وڈیرا سائیں

دلّی سے یہاں تک کا سفر مالک رام کے لیے تھکا دینے والا تھا۔

اگر وہ براہ راست ٹرین کے ذریعے آتے تو شاید وہ بوریت محسوس نہ کرتا، لیکن جیپ کے ذریعے مسلسل تین سو میل کے سفر اور اس دوران جاگتے رہنے کی پریکٹس نے اسے کم از کم یہ بات ضرور سکھا دی تھی کہ بعض باتیں جو دورانِ تربیت بظاہر آسان دکھائی دیں عملی زندگی میں وہ مصائب کے پہاڑ کھڑے کر دیا کرتی ہیں۔

جب وہ اکیڈمی میں تھا تو تین تین دن اور رات مسلسل انہیں جگایا اور بھگایا جاتا تھا۔ پہلے پہل تو کچھ دقت محسوس ہوئی تھی۔

لیکن ——

اب وہ اس کے عادی ہو گئے تھے۔

اُس کا تعلق بھارتی فوج کے خصوصی کمانڈو یونٹ "انڈو تبتین" سے تھا جنہیں عرفِ عام میں بلیک کیٹس کہا جاتا تھا۔

تین ماہ کا ایک خصوصی کورس اُس نے کے جی بی کے "سپیٹسناز" کے ساتھ کیا تھا اس دوران انہیں خالی ہاتھوں مسلح دشمن سے نمٹنے، گھیرے میں آکر بچ نکلنے

اور نہتے ہونے کے باوجود دشمن کو بڑی آسانی سے جان سے مار دینے کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔

مالک رام کے اندر جو تھوڑی بہت انسانیت رہ گئی تھی وہ اُس خصوصی کورس نے ختم کر دی تھی۔

اسی دوران انہوں نے سائبیریا کے برفیلے جنگلوں میں کئی کئی روز بھوکے پیاسے رہ کر خالی ہاتھوں جانور مار کر اُن کا خون پی کر گزارہ کیا تھا۔

وہ کوئی ایسا دھارمک قسم کا ہندو نہیں تھا۔ اُس کی جس خوبی نے اُسے "بلیک کیٹ کا کمانڈو" بنایا تھا وہ اُس کا سندھی والدین کے ہاں جنم تھا۔

مالک رام کے والدین تقسیم ہند سے پہلے پاکستانی سندھ میں رہتے تھے اور تقسیم کے چار پانچ سال بعد دل پر پتھر رکھ کر بھارت آئے تھے۔ مالک رام کا جنم بھارت میں ہوا تھا۔

لیکن ——

اُس کے والدین نے ابھی تک اپنا روحانی اور جسمانی رابطہ پاکستانی سندھ سے نہیں توڑا تھا۔ وہ اب بھی اُسے شکارپور کے نزدیک اپنے آبائی گاؤں گھارو کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔

مالک رام کی ماں کے کچھ رشتہ دار ابھی تک پاکستانی سندھ میں آباد تھے اور اُسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے والدین کے ساتھ ایک مرتبہ وہاں گیا تھا۔

کاروباری سلسلے ہی میں پھر وہ لوگ دہلی میں آباد ہو گئے۔

لیکن ——

اپنے والدین کے مزاج کے بالکل برعکس مالک رام کو فوجی زندگی سے لگاؤ پیدا ہو گیا جس کی وجہ وہ انگریزی فلمیں تھیں جو وہ بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا۔

والدین کی خواہش کے برعکس وہ فوجی اور پھر کمانڈو بن گیا۔ اُس کی خصوصی صلاحیتوں کے پیشِ نظر جلد ہی اُس کا تبادلہ آرمی کے سپیشل گروپ میں ہو گیا اور پھر وہ سندھ راجستھان سرحد پر ملٹری انٹیلی جنس ایڈوانس یونٹ سے ایسا منسلک ہُوا کہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

مالک رام، ہندو سے زیادہ مسلمان تھا۔

دہلی میں اُس کے ہمسائے اور سکول کے اکثر ساتھی مسلمان تھے اور اُس کے والدین کا تعلق بھی ہندوؤں کے اُس مخصوص طبقے سے تھا جو مسلمان صوفیا سے زیادہ متاثر ہے۔ اس لیے اُسے اسلامی رسومات کا سب علم تھا۔ اُس کے والدین ہر سال باقاعدگی سے اجمیر شریف عُرس پر جایا کرتے تھے اور مالک رام نے تو بھارت میں اکثر مسلمان صوفیاء کے مزاروں کے "درشن" کیے اور وہاں "متھا ٹیکا" تھا۔

انٹیلی جنس میں اُس کی دلچسپی فطری تھی۔

شاید وہ پیدائشی (SPY) جاسوس تھا۔

اس کے اکثر ساتھی انٹیلی جنس ڈیوٹی سے جان چھڑانے کی فکر میں رہتے تھے، لیکن وہ اُس کے برعکس بڑی خوشی اور دلچسپی سے فرائض ادا کیا کرتا تھا۔ اُس وقت جب بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے اُسے خصوصی بلاوا آیا تو مالک رام نے یہی سمجھا تھا کہ شاید اُسے پھر کسی خصوصی کورس میں شرکت کے لیے بلایا گیا ہے۔

لیکن

اس مرتبہ اُسے کسی خاص مقصد سے بلایا گیا تھا۔

جب وہ بریگیڈیئر صاحب کے کمرے میں داخل ہُوا تو وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ جو مالک رام کے لیے واقعی حیرانگی کی بات تھی کیونکہ عام حالات میں بریگیڈیئر سُود اکیلے نہیں ہوتے تھے۔ ایس ایس جی کا بریگیڈیئر ہونے کے سبب اکثر وہ کسی مشن کی بریفنگ کے سلسلے ہی میں اُن سے ملا کرتا تھا۔

"ہاؤ ڈو یو ڈو کیپٹن" بریگیڈیئر سُود نے کھڑے ہو کر بے تکلفی سے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔

کیپٹن مالک رام ایک لمحے کے لیے گڑبڑا کر رہ گیا اُس نے دونوں ایڑیاں بجا کر سیلوٹ کرتے ہُوئے اپنا ہاتھ بریگیڈیئر کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

بریگیڈیئر سُود نے پہلی مرتبہ اُس کے لیے چائے اور سنیکس منگوائے تھے۔

اُس کے سامنے میز پر فائل رکھی تھی جس پر موجود معلومات پڑھ پڑھ کر وہ مالک رام کے سامنے دہراتا اور پھر اُس کی تصدیق کرتا رہا۔ مالک رام کے لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ فوج میں بھرتی ہونے خصوصاً کمیشن ملنے کے بعد ہر آفیسر کے خاندان، ماضی اور حال سے متعلق مکمل تفصیلات آرمی میں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔

"کیپٹن تم ایک اہم مشن کرنے جا رہے ہو۔"

بالآخر بریگیڈیئر نے اُس کے تجسس کو ختم کر دیا۔

"یس سر!" مالک رام کے لیے مشن کوئی نیا یا چونکا دینے والا لفظ نہیں تھا۔

"تمہیں اپنے والدین کے آبائی وطن جانا ہے۔" بریگیڈیئر سُود نے مسکراتے ہوئے

اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

مالک رام کی آنکھوں میں دُور دُور تک کسی شک و شبہ یا خوف کا شائبہ تک موجود نہیں تھا۔

"رائیٹ سر!"

تھوڑی دیر بعد بریگیڈیئر سُود دیوار سے لٹکے نقشے پر پاکستانی سندھ میں واقع مختلف جگہوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مالک رام کو اُس کے مشن کی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

ہر بات کہنے کے بعد وہ مالک رام کے چہرے کے تاثرات سے اپنی بات کا ردِ عمل تلاش کرتا۔ اُس کی طرف سے "ہاں" کہنے کے بعد اگلی بات کہتا تھا۔

"کوئی سوال؟" بریگیڈیئر سُود نے آخر میں پوچھا۔

"نو سر! میں بالکل کلیئر ہوں۔" مالک رام نے ایڑیاں بجا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹاپ سیکرٹ ہے کیپٹن۔ صرف میرے اور تمہارے درمیان" ——— بریگیڈیئر سُود نے انتہائی مختصر الفاظ میں اُس مشن کی اہمیت کا احساس دلایا۔

"رائیٹ سر!"

"اگلے ہفتے میں کسی بھی دن تمہیں سگنل مل جائے گا ——— اپنی جگہ سے" لانچنگ پیڈ" تک سب کچھ "غیر قانونی" ہوگا۔" بریگیڈیئر سُود نے آخری ہدایت دی۔

"رائیٹ سر!"

"آل دا بیسٹ" "ALL THE BEST" بریگیڈیئر سُود نے دوبارہ گرم جوشی سے

مصافحہ کرتے ہوئے اُسے رخصت کیا۔

"روانگی سے پہلے ہم ایک مرتبہ پھر ملیں گے" ۔۔۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اُسے بریگیڈیئر سود کی آواز سنائی دی۔

کیپٹن مالک رام نے ایڑیاں بجائیں۔ اپنی ٹوپی تک ہاتھ لے جا کر سلیوٹ مارا اور باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اپنی جیپ میں وہ اپنے کیمپ کی طرف جا رہا تھا۔

○

پانچویں روز اُسے بریگیڈیئر سود نے اچانک ایک "سرپرائز وزٹ" دیا تھا۔

سرحد پر واقع اس کمانڈ پوسٹ کے عقب میں اُس روز اچانک ہی ہیلی کاپٹر لینڈ کیا تھا جس سے بریگیڈیئر سود برآمد ہوا۔ کیپٹن مالک رام اور اُس کے جوان بھاگتے ہوئے بریگیڈیئر سود کو "ریسیو" کرنے پہنچے تھے۔

"ہیلو کیپٹن!" بریگیڈیئر نے اپنی چھڑی اپنی دائیں ٹانگ پر مارتے ہوئے مسکرا کر اُسے مخاطب کیا۔

"کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔ ہم تھوڑی دیر بعد واپس جا رہے ہیں۔"

قریباً پندرہ بیس منٹ یہاں گزارنے اور جوانوں سے باتیں کرنے کے بعد بریگیڈیئر سود کیپٹن مالک رام کو اپنے ساتھ لے کر ہیلی کاپٹر میں واپس جا رہا تھا۔ اس مرتبہ ان کی منزل دہلی تھی۔

بھارتی جی ایچ کیو کی خصوصی "آپریشنل برانچ" میں وہ لوگ دو گھنٹے بعد موجود تھے۔

اس کمرے میں "بلیک کیٹس" کے چار اور جوان پہلے سے موجود تھے جنہیں اسی طرح مختلف مقامات سے یہاں جمع کیا گیا تھا۔

بریگیڈیئر سود اب اُن سب کو اکٹھے بریفنگ دے رہا تھا۔

"مالک رام تمہاری کمانڈ کرے گا ۔۔۔ سب نے الگ الگ اپنی اپنی حیثیت میں سرحد عبور کرنی ہے۔ بھارتی سرحد کے اندر ہر ممکن مدد تم سب اپنے خصوصی اختیارات کے تحت حاصل کر سکتے ہو ۔۔۔ سرحد عبور کرنے کے لیے بہترین علاقہ یہ ہے۔"

اتنا کہہ کر بریگیڈیئر سود نے اپنے دائیں ہاتھ لٹکے نقشے پہ چھڑی ایک جگہ رکھی تو وہ الفاظ الیکٹرک عمل سے جلنے لگے۔ اب اُس کی چھڑی یہاں سے چلتی ہوئی ایک اور جگہ پہنچ کر رُک گئی تھی۔

"تمہیں اگلے ۹۲ گھنٹے تک یہاں اکٹھے ہونا ہے" ۔۔۔ اُس نے ایک اور جگہ نقشے پہ چھڑی جمائی۔

"یہاں ہمارے "دوست" استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔ سرحد عبور کرنے کے بعد تمہاری مکمل کمانڈ اور ذمہ داری کیپٹن مالک رام پر ہے۔ اگلی منصوبہ بندی، کام کی تفصیلات سب باتیں سرحد عبور کرنے کے بعد کیپٹن مالک رام تمہیں بریف کریں گے۔ کوئی سوال؟"

اُس نے رُک کر سگریٹ سلگایا۔

پانچوں کمانڈوز پر سناٹا طاری تھا۔

"او کے۔ آل دا بیسٹ۔ اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں صبح چھ بجے سے تمہارا ٹارگیٹ ٹائم شروع ہو جائے گا۔"

اتنا کہہ کر بریگیڈیئر ایک لغلی دروازے سے باہر چلا گیا۔

اُس کی روانگی کے بعد کیپٹن مالک رام نے اپنے جوانوں کے سامنے ہدایات کو دہرایا۔ پانچوں ایک دوسرے سے بخوبی آگاہ تھے۔

بریگیڈیئر سُود نے انتہائی خفیہ پلاننگ کی تھی۔ منصوبے کی تفصیلات کا علم صرف کمانڈر کو تھا۔ جس کے متعلق بھارتی فوج کو علم تھا کہ کیپٹن مالک رام کے جسم کی بوٹی بوٹی بھی الگ کر دی جائے تو بھی وہ کچھ نہیں بتائے گا۔

الگ الگ سرحد عبور کرنے میں یہ حکمتِ عملی کارفرما تھی کہ ایک شخص کی گرفتاری سے سب کی گرفتاری کا خطرہ ختم ہو گیا تھا۔

آپریشن کو خفیہ رکھنے کے پیشِ نظر سوائے مالک رام کے ٹیم کے اور کسی ممبر کو کوئی "سیف ہاؤس" نہیں بتایا گیا تھا۔ تمام رابطوں اور آپریشن کی تفصیلات کا علم بھی صرف مالک رام کو تھا۔ باقیوں نے صرف حکم کی اطاعت کرنی تھی جو اُن کی خصوصی تربیت تھی۔

اس سے پہلے بھی یہ لوگ مختلف نوعیت کے خفیہ آپریشن کر چکے تھے اور ان میں سے اکثر اس سے پہلے پاکستان میں بھی جا چکے تھے۔

اُن کے کمانڈر کے لیے البتہ یہ پہلا موقعہ تھا۔

⊙

بھُل کوٹ نام تھا اس سرحدی قصبے کا جہاں سے وہ دہلی سے مسلسل سفر کر کے پہنچا تھا۔۔۔!!

یہاں موجود آرمی کے ریسٹ ہاؤس پر اس کے استقبال کے لیے بی ایس ایف

کا کمپنی کمانڈر موجود تھا۔

"تم لوگ جاؤ۔" اُس نے اپنے ساتھیوں کو جو دہلی سے یہاں تک آئے تھے بڑی بے رُخی سے کہا۔

دونوں جوانوں نے فی الوقت ڈرائیور سمیت یہاں سے ہٹ جانا ہی غنیمت جانا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جس شخص کے ساتھ انہوں نے دہلی سے یہاں تک ڈیوٹی کی ہے وہ اچھا فوجی تو ہو سکتا۔ انسانیت نام کی کسی چڑیا سے ہرگز واقف نہیں۔

تینوں نے بشکل تن کر سیلوٹ کیا اور کان لپیٹ کر باہر آ گئے۔

"سر! آپ کے لیے کھانا تیار ہے۔" بی ایس ایف کے کمپنی کمانڈر نے کہا۔

"او۔ کے"۔۔۔۔ مالک رام کے لہجے کی تلخی برقرار تھی۔۔۔۔ "مجھے اس علاقے کا تفصیلی نقشہ دے دو اور تم جاؤ۔ میرے لیے کھانا کچھ دیر بعد بھیجنا۔" کمپنی کمانڈر نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا اور چپ چاپ میز پر موجود نقشہ اُس کو تھما کر باہر آ گیا۔

کمپنی کمانڈر کی دوبارہ آمد آدھ گھنٹہ بعد ہوئی تھی۔ اس درمیان مالک رام نے سرحد کے راستے حفظ کر لیے تھے۔

"کھانا تیار ہے سر!"

"او۔ کے" مالک رام نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

کھانے کے دوران وہ کمپنی کمانڈر کو کرید کرید کر یہاں کی سرحدوں کے دونوں اطراف کے حالات دریافت کرتا رہا۔

کھانے کے خاتمے پر وہ اُس کے ساتھ ہی دوسرے کمرے میں اس بڑی میز تک آیا جس کے گرد بیٹھ کر بارڈر سیکورٹی فورس کے مقامی کمانڈر میٹنگ کیا کرتے تھے۔

کیپٹن کمانڈر کا فراہم کردہ نقشہ اُس نے میز پر بچھا کر اپنے ہاتھ کی انگلی اس جگہ رکھی جہاں وہ لوگ اس وقت موجود تھے۔

"تمہارے خیال میں کونسا راستہ محفوظ ترین ہے" مالک رام نے سوال کیا۔

"سر! ہم نے آپ کے لیے اس راستے کا انتخاب کیا ہے۔ میرے جوانوں نے اس طرف "ریکی" کر کے دیکھا ہے یہ راستہ بہت محفوظ ہے"___ کیپٹن کمانڈر نے نقشے میں ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں"___ مالک رام نے صرف ایک لفظ پر اکتفا کیا۔

"میرے جوان اس راستے پر ایکٹو ہیں"___ کیپٹن کمانڈر نے دوبارہ کہا۔

"ہوں"___ دوبارہ وہی جواب ملا۔

شام ڈھلنے تک مالک رام آرام کرتا رہا۔

مقررہ وقت پر جب کیپٹن کمانڈر اپنے دو جوانوں اور جیپ کے ساتھ وہاں پہنچا تو اُسے روانگی کے لیے تیار پایا۔

"انہیں یہیں چھوڑ دو۔ میں جیپ خود ڈرائیو کروں گا"

کیپٹن کمانڈر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"لیکن سر!....." اُس نے کچھ کہنا چاہا۔

"یہ حکم ہے"___ کہتے ہوئے مالک رام نے ڈرائیور سیٹ سنبھال لی۔

"رائیٹ سر!"

کیپٹن کمانڈر حیران تھا کہ وہ پوسٹ کی طرف جانے کے بجائے کسی اور راستہ پر مڑ گیا تھا۔

"سر! یہ راستہ تو....."

"شٹ اپ"___ اُس نے کیپٹن کمانڈر کو اس طرح ڈانٹا کہ اُس کی ریڑھ کی

ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔

اُس نے اپنی زندگی میں ایسا اکھڑ اور بدتمیز آفیسر نہیں دیکھا تھا۔ بی ایس ایف کا کیپٹن کمانڈر ہونے کے ناطے وہ اس علاقے کا بلا شرکت غیرے بادشاہ تھا لیکن وہ اُسے اپنے ہیڈ کوارٹر سے اس سلسلے میں خصوصی احکامات ملے تھے کہ اُس نے کیپٹن صاحب کے حکم کی بلا چون و چراں تعمیل کرنی ہے۔

جس لہجے میں اُسے یہ حکم دیا گیا تھا اس سے وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ کوئی بہت ہی اہم شخصیت ہے۔

سرحد سے چند فرلانگ دُور ہی اُس نے جیپ کھڑی کر دی___!!

"یہاں سے پوسٹ کا فاصلہ کتنی دیر کا ہے"___ اُس نے اچانک ہی کیپٹن کمانڈر سے پوچھا۔

"سر! ___قریباً آدھ گھنٹے کا۔"

"اور پیدل"___ اگلا سوال ہوا۔

"سر! ایک گھنٹے کا"___ کیپٹن کمانڈر نے کہا۔

"آل رائیٹ"___ اُس نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

کیپٹن کمانڈر بے بس اور حیرانگی سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے کیپٹن مالک رام نے اگلے ٹائر کی ہوا نکال دی تھی۔

"دس منٹ بعد ٹائر تبدیل کر کے پوسٹ پر چلے جانا۔ اپنے ساتھیوں کو "الرٹ" رکھنا، انہیں بھی بتانا کہ میں نے سرحد اسی جگہ سے عبور کرنی ہے۔ جو جگہ تم لوگوں نے پلان کر رکھی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر پیدل سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔

کیپٹن کمانڈر کا جی چاہتا تھا اپنا سارا پستول اُس پر خالی کر دے۔

لیکن ــــــ

وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

احکامات بہت سخت تھے۔ اُس کے ہاتھ اور زبان بندھی تھی۔ البتہ اُس کے دل سے بددُعا ضرور نکلی کہ کم از کم سرحد کے دوسری طرف ہی کوئی اُس کو گولی مار دے۔

کمپنی کمانڈر کے لیے سوائے اس کے اور کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا کہ وہ جیپ کا ٹائر خود بدلے اور اپنی پوسٹ تک پہنچے کیونکہ اس جیپ میں ریڈیو یا وائرلیس سسٹم بھی نصب نہیں تھا۔ اس عمل میں اُسے کم از کم آدھا گھنٹہ لگ جاتا۔

اب اُسے اس بات کی سمجھ آنے لگی تھی کہ کیپٹن نے کیوں یہ سب کچھ کیا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بحفاظت سرحد عبور کر جانے تک کسی کو کانوں کان بھی خبر ہو اور پوسٹ پر موجود بی ایس ایف کے لوگ یہی سمجھتے رہیں کہ اس نے یہاں سے ہی سرحد عبور کرنی ہے۔

اپنی قسمت کو کوستا کمپنی کمانڈر بادلِ نخواستہ جیپ کا ٹائر تبدیل کرنے لگا۔

○

سجوار شاہ نے اچانک ہی اپنی جیپ اس جگہ روک دی تھی۔

وہ یہاں تک قریباً چالیس میل کا سفر طے کر چکا تھا اور آج خلافِ معمول اکیلا ہی اس طرف آیا تھا۔ اس کے ساتھی اس کی عادت سے واقف تھے کہ کبھی کبھی سجوار اکیلا ہی نکل جایا کرتا ہے۔

حفاظتی نقطۂ نظر سے یہ بات بڑی خطرناک تھی۔

لیکن ــــــ

خطرات سے کھیلنا جیسے اُس کا مشغلہ تھا۔

ڈیرہ جنوئی سے مراد کوٹ کی طرف جاتے ہوئے اُس نے اچانک ہی جیپ کو کچے راستے پر اُتار دیا تھا۔ بظاہر یہ کچا راستہ تھا لیکن کئی سالوں سے مسلسل استعمال ہونے کی وجہ سے اُس نے گزرگاہ کی حیثیت ضرور اختیار کر لی تھی۔

گھنی اور خاصی بلند جھاڑیوں کے بیچوں بیچ اپنی جیپ کی ہیڈلائٹس روشن کیے وہ چلتا چلا جا رہا تھا۔

جس علاقے میں وہ سفر کر رہا تھا اس علاقے میں تو عام حالات میں پولیس کو دَم مارنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ خصوصاً اس راستے پر تو دن کے وقت بھی چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی۔

سجوار شاہ کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ معمول کے مطابق جیپ چلا رہا تھا۔ قریباً چار یا پانچ میل وہ اسی طرح چلتا چلا گیا جب ایک جگہ اچانک اس کے سامنے سرخ رنگ کی ٹارچ روشن ہوئی۔

سجوار شاہ نے جیپ کی ہیڈلائٹس آف کر کے انجن بند کر دیا۔

جھاڑیوں سے پانچ مسلح نقاب پوش نکل کر اس کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ جیپ کے اندر کی روشنی سجوار شاہ نے جلا لی تھی۔ اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی احترام سے اُن کی نظریں جھک گئیں۔

"مرشد سائیں "ــــ اُن میں سے ایک کے منہ سے نکلا۔

"کیسے ہو بہادل "ــــ سجوار شاہ نیچے اُتر آیا۔

"ٹھیک ہوں سائیں۔ آپ کی نظرِ کرم ہے تو سب اچھا ہے سائیں۔"

"میرے ساتھ آؤ"ــــ سجوار شاہ نے کہا اور ایک اور نقاب پوش کے تعاقب میں چل دیا۔

دونوں تھوڑی دیر بعد بہادل کے اڈے پر موجود تھے۔ بہادل کے اشارے

پھر اُس کے ساتھی وہاں سے چلے گئے تھے۔

"حکم مرشد سائیں" بہادل نے جو اُس کے سامنے زمین پر بیٹھا تھا قریباً ہاتھ باندھتے ہوئے پوچھا۔

"بابا ایک کام کرنا ہے۔ لازم ہو گیا ہے ـــــ جب تک ہم سرکار پر دباؤ نہیں بڑھائیں گے وہ لوگ ہماری بات نہیں مانیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ حکومت کو سودے بازی کے لیے مجبور کرسکوں۔ بابا بہادل! تم تو جانتے ہو کہ ادھر فوج نے ڈیرے ڈال دیے ہیں اور میں نے سُنا ہے کہ وہ لوگ اس علاقے میں بھی کوئی بڑا آپریشن کرنے جارہے ہیں۔ وڈیرہ دودو کے ڈیرے پر پرسوں کچھ آفیسر لوگ آئے تھے بات کرنے ـــــ کوئی بڑا حملہ کرنے والے ہیں یہ لوگ" ـــــ اُس نے بہادل کی آنکھوں میں جھانکا جس نے اپنے "مُرشد سائیں" سے نگاہیں ملتے ہی نظریں جھکادی تھیں۔

"آپ حکم کرو مرشد سائیں۔ میں جانتا ہوں۔ میرے مخبر اس علاقے میں چاروں طرف پھیلے ہیں۔ سائیں! آپ کو تو ہر بات کا علم ہے۔ یہ لوگ بہت سے غلط الزامات بھی میرے کھاتے میں ڈال رہے ہیں ـــــ ہر روز میرے سر کی قیمت بڑھ رہی ہے ـــــ سائیں! تم کیسے بھی کرو مجھے اس جنجال سے نکالو ـــــ اب میری بچیاں بیاہنے کی عمر کو آگئی ہیں مجھے اب کسی کی ماں بہن کو بے آبرو کرتے بہت خوف آتا ہے سائیں" ـــــ یہ بات کہتے ہوئے بہادل کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

"بابا فکر نہیں کرو۔ وڈیرہ جتوئی معاملات کو بہت بگاڑ رہا ہے تم تو جانتے ہو بہادل کہ وڈیرے جتوئی کے حکم سے ہی اس علاقے کی پولیس کوئی رپورٹ کسی ڈاکو کے خلاف اوپر بھیجتی ہے۔"

سجاول شاہ نے اپنی دائیں مونچھ مروڑتے ہوئے بہادل کی طرف کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سائیں! وڈیرے جتوئی کی طرف سے مجھے دو مرتبہ گرفتاری دینے کا مشورہ مل چکا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ سرکار سے سودے بازی کرکے میری سزا میں کمی کروا لے گا ـــــ لیکن میں نے کورا جواب دے دیا ہے۔"

"بہت اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا۔ اس چکر میں نہ پڑنا تمہیں اپنے چچیرے کا حال تو معلوم ہے ناں۔ اُس نے بھی وڈیرہ کے کہنے پر ہتھیار ڈال دیے تھے اور پھانسی کا انتظار کر رہا ہے ـــــ نہ بابا ان کے چکر میں نہیں آنا" ـــــ سجاول شاہ نے اُسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"جو حکم مُرشد۔ بس میری گھر والی اور بچیوں کا خیال رکھنا" ـــــ بہادل نے ہاتھ باندھے۔

"تم ان کی فکر نہیں کرو۔ وہ ہماری حویلی میں بڑے آرام سے رہتی ہیں ـــــ اور ہاں۔ بابا بہادل! کل ہمارے کچھ اور دوست بھی یہاں آرہے ہیں۔ اُن لوگوں کے ساتھ مل کر ایک پروگرام پہ عمل کرنا ہے ـــــ بابا! اس علاقے کا ڈی سی بڑا اکھڑ سا بندہ ہے۔ ذرا اُس کا دماغ ٹھیک کرنا ہوگا۔"

"سائیں! کیا ہمیں ڈی سی پر حملہ کرنا ہے۔"

"نہیں۔ تمہیں پنجاب سے آنے والی ٹرین پر حملہ کرنا ہے۔ بابا بہادل اس سے پہلے جس علاقے میں بھی ٹرین پر حملہ ہوا ہے وہاں سے حکومت نے تمام اعلیٰ اہل کاروں کے تبادلے کردیے ہیں ـــــ اس طرح اس ڈی سی کا بھی تبادلہ ہو جائے گا اور ہم اپنے مطلب کا بندہ یہاں لگالیں گے ـــــ بابا سائیں نے اُدھر بات پکی کر رکھی ہے جیسے ہی یہ بندہ یہاں سے جاتا ہے ہمارا بندہ

آجائے گا، جس کے ذریعے بات چیت کر کے میں تمہاں بچوں سمیت دوسرے ملک میں پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا۔" سجوار شاہ نے اپنے گماشتے نے منصوبے کی تفصیلات اُسے سمجھائیں۔

"لیکن سائیں اس طرح اچانک فائرنگ سے بے گناہ بھی....."

"بابا بہاول تمہیں آج کل انسانی جانوں کی بہت فکر ہونے لگی ہے۔ بابا چھوڑ اس دھندے کو کہیں ہاریوں والا کام کر لو۔ تم گولی نہ چلانا بس وہاں موجود رہنا۔ یہ کام ہمارے دوسرے ساتھی کر لیں گے ——— بابا تم سیاست کو نہیں سمجھتے۔ سیاست میں کسی کی نہیں اپنی جان کی فکر کی جاتی ہے۔ تمہاری بچیاں بیاہنے لائق ہو رہی ہیں اور تم گناہ ثواب کے چکر میں پڑے ہو ——— بابا! کوئی کام کی بات کیا کرو ——— ایسی باتوں سے معاملہ خراب ہوتا ہے۔ ٹھیک نہیں ہوتا۔ کیا ٹھیک ہے کیا غلط ہے اس کا فیصلہ ہم نے کرنا ہے۔ بہاول! بابا ہم سرکار دربار میں بیٹھتے ہیں۔ سرکار دربار کے معاملات کی فکر تم نہ کیا کرو ——— بس وہ کرو جس کا حکم ملتا ہے" ——— سجوار نے غصے سے پھنکارتے ہوئے اُس کی بات کاٹ دی۔

"ٹھیک ہے مرشد سائیں۔ آپ جیسا حکم دیں گے ویسا ہی ہو گا ———" بہاول نے اُس کے گھٹنے چھوتے ہوئے کہا۔

"میں اب جاتا ہوں ——— کل تک پانچ بندے اِدھر آجائیں گے۔ انہیں یہاں مہمان رکھنا ہے۔ بہت کام کے بندے ہیں۔ اُن کے پاس ہتھیار بھی بہت اچھے ہیں۔ تم نے صرف اُن کا حکم ماننا ہے۔ میں اب چلتا ہوں" ——— یہ کہہ کر سجوار شاہ کھڑا ہو گیا۔

"سائیں! کھانا تو ہمارے ساتھ کھا لیتے۔ آپ کے لیے ہم نے...."

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" ——— اُس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

قریباً دو گھنٹے بعد وہ جس طرح یہاں آیا تھا اُسی طرح چپ چاپ واپس لوٹ گیا۔

بہاول کے ساتھی سجوار شاہ کو جنگلی سلسلے کے باہر پکی سڑک تک اپنی حفاظت میں رُخصت کر کے آئے تھے۔

⊙

"سب ٹھیک ہے ناں بابا" ——— حویلی سے کچھ دور اپنے ڈیرے پر پہنچ کر اُس نے دروازے پر موجود اپنے منشی سے دریافت کیا۔

"بھلے سائیں! بھلے! سب خیر ہے سائیں" ——— منشی نے ہاتھ جوڑے۔

وہ اپنے سائیں کے ساتھ ہی پُرتکلف ڈرائنگ روم تک آیا تھا۔ اپنے سائیں کے جوتے اُس نے اپنے ہاتھوں اُتارے تھے۔

"کوئی پیغام ———؟" سجوار شاہ نے اُس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"سائیں کچھ نہیں۔ یہ بہاول کی گھر والی بہت ضد کر رہی ہے ملاقات کے لیے۔"

"بابا! مل لیں گے اُس سے بھی۔ مل لیں گے۔ کل ملا دینا کیا مصیبت ڈال رکھی ہے اُس نے۔ تم سے ایک عورت بھی قابو نہیں ہوتی" ——— سجوار شاہ نے غصے سے کہا۔

"سائیں! آپ کے حکم کا خیال ہے مُرشد، ورنہ تو اس کی مجال نہیں کہ دم بھی مار سکے" ——— منشی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"خیر! دیکھیں گے صبح اُس کو بھی۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اب کوئی فون وغیرہ مجھے نہیں دینا۔ کل صبح بھی میں خود ہی جاگوں گا۔ مجھے جگانا نہیں۔"

"ٹھیک ہے مرشد سائیں جو حکم۔"

"اب تم جاؤ۔"

منشی باہر آ گیا۔ واپسی پر اُس نے دروازہ اپنے ہاتھ سے بند کیا تھا۔ سجوار شاہ وہیں ایک آرام دہ صوفے پر ڈھیر ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پھر اُس نے اُٹھ کر اپنے بیڈ روم کی راہ لی۔

سجوار شاہ آج واقعی تھک گیا تھا۔

اُسے صبح ہی پارٹی کی طرف سے سرحد پار کے مہمانوں اور اُن کے پلان کی اطلاع ملی تھی اور آج ہی اُس نے یہ اطلاع جنگل میں بھی پہنچائی اور "مہمانوں" کی حفاظت اور رہائش کا بندوبست کرنا تھا۔

بیڈ روم میں داخل ہونے کے لیے اُس نے دروازہ کھول کر دروازے سے ملحقہ دیوار میں لگا بٹن دبا دیا اور جیسے ہی بلب کی روشنی میں کمرے میں نظر دوڑائی حیرت سے اپنی جگہ جم کر رہ گیا اُس کے بستر کے سامنے موجود آرام دہ کرسی پر ایک سندھی نوجوان بڑے آرام اور سکون سے بیٹھا تھا۔

"کون ہو تم؟"

سجوار شاہ نے دوسرے ہی لمحے اپنی حالت پر قابو پا لیا تھا۔ وہ بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔

"میں 'دوست' ہوں۔ 'سجاول' نام ہے میرا"۔۔۔ اُس نے کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"ہوں ں ں....!" سجوار شاہ اُسے پہچان گیا۔

یہ کیپٹن مالک رام تھا۔ جسے سجاول کا نام دے کر یہاں بھیجا گیا تھا۔

"لیکن۔۔۔ یہ کون سا طریقہ ہے ملاقات کا"۔۔۔ سجوار شاہ اُسے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ حالانکہ تعارف سے پہلے وہ غصے سے بے قابو ہو

رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے سائیں! کہ آپ کی شان میں گستاخی ہو گئی لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ باہر موجود آپ کے محافظوں کی فوج یا کسی اور کو خبر ہوتی"۔۔۔ سجاول نے کہا۔

"لیکن آپ نے تو کہیں اور آنا تھا۔۔۔ اور وہاں ہمارے آدمی...."

"ہاں سائیں! واقعی مجھے کہیں اور آنا تھا لیکن میں "انتہائی احتیاط" کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری کسی بھی غلطی کی وجہ سے ہمارے دوستوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ بالآخر مجھے آپ ہی سے ملنا تھا۔ اس لیے میں نے طے شدہ منصوبے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی۔"

"کوئی قیامت نہیں ٹوٹتی اگر کچھ ہو بھی جاتا۔۔۔ بابا! اگر یہ لوگ اتنے سیانے ہونے کسی قابل ہوتے تو اب تک بہت کچھ کر لیتے۔ بابا سجاول! ادھر بس نام ہی نام کی سرکار ہے۔ یہاں حکومت ہماری ہے۔ سرحد سے یہاں تک کسی کی مجال نہیں کہ ہمارے حکم کے بغیر پر بھی مار سکے۔ بابا! ہم ہیں یہاں کی حکومت ہم ہیں...." بڑی رعونت سے اُس نے جواب دیا۔

"حق ہے سائیں! بجا فرمایا سائیں!" سجاول نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ایک درخواست کرنی تھی سائیں کہ میرے ساتھیوں کو یہاں لائے بغیر سیدھا ٹھکانے تک پہنچا دیں۔۔۔ میں وہیں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ جتنا کم خطرہ مول لیا جائے اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔"

"ٹھیک ہے بابا! جیسا تم کہتے ہو۔ ویسا ہی ہو جائے گا۔ ابھی تم آرام کرو۔" اتنا کہہ کر اُس نے کمرے میں موجود گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

دوسرے ہی لمحے منشی وہاں موجود تھا۔ اپنے سائیں کے خاص کمرے میں ایک

مہمان کو دیکھ کر چونک گیا۔ اُسے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ یہ شخص کہاں سے نازل ہو گیا۔ اس حویلی میں تو ہوا کو اپنی مرضی سے داخل ہونے کی اجازت نہیں ملتی تھی یہ تو انسان تھا۔

جیتا جاگتا انسان ——!

"منشی! سجاول ہمارے "خاص مہمان" ہیں۔ ان کو ساتھ والے بیڈ روم تک پہنچاؤ۔ کوئی ان سے ملاقات نہیں کرے گا" —— سجوار شاہ نے اُس کی پریشانی بھانپ لی تھی۔

"جو حکم سائیں"۔ منشی اب نارمل ہو گیا تھا۔

"خاص مہمان" کا مطلب اس سے زیادہ کون سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے "پُراسرار خاص مہمان" اکثر اُس کے سائیں سے ملنے آتے رہتے ہیں، لیکن اس طرح درجنوں مسلح محافظوں کو جُل دے کر یہ پہلا مہمان آیا تھا۔

منشی نے مہمان کے لیے اُس خاص بیڈ روم کا بندوبست کیا تھا جہاں والا بارات کے کسی بھی حصے میں سوائے خصوصی ملازمین کے اور کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

اُس رات مالک رام کئی دنوں کی بے آرامی اور بے چینی کے بعد پہلی مرتبہ قدرے سکون کی نیند سویا۔

وہ اپنے ساتھیوں کے متعلق بڑا پُر اعتماد تھا۔

یہ لوگ اُس کے برسوں کے رفیق تھے۔ ان کی مدد سے اُس نے بنگلہ دیش اور بھارت کے دُور دراز علاقوں میں بہت سے خفیہ آپریشن کیے تھے اور ان میں وہ بھی تھے جو اس سے پہلے پاکستان میں بھی ایسے خفیہ آپریشن کر چکے تھے

مالک رام جانتا تھا جن لوگوں کا وہ "مہمان" ہے وہ انہی کے پروردہ ہیں۔ ان

کی حیثیت غیر ملکی کٹھ پتلیوں سے زیادہ کچھ نہیں اور جب سے بھارت نے اپنے سرحدی علاقوں میں ان غداروں کی سہولت، تربیت اور حفاظت کے لیے کیمپ قائم کیے تھے اور سینکڑوں کی تعداد میں انہیں وہ پناہ، تربیت اور اسلحہ دیا تھا۔ اس کے بدلے تو خاص طور پر سجوار شاہ اور اُس کی جماعت کے لوگ بھارتی حکومت کے کسی بھی حکم پہ کتے کی طرح دُم ہلانے لگتے تھے۔

اس علاقے میں موجود پاکستانی سیکورٹی کی بھی مالک رام کو خاص پرواہ نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں کے حکمران اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے خصوصاً اس علاقے میں اُن لوگوں کا دم بھرتے ہیں جو اصل میں غدار لیکن بظاہر پاکستان نواز بہروپیے بنے ہوئے ہیں۔

ایک مرتبہ دورانِ تربیت اُس نے اپنے انسٹرکٹر سے پوچھا تھا کہ جب اس ملک کی علیحدگی پسند تنظیموں کے بہت سے لیڈر کھلم کھلا بغاوت کی باتیں اور اپنے نظریات کا پرچار کرتے ہیں تو پاکستانی حکومت انہیں لگام کیوں نہیں دیتی۔

"ابھی تم نوجوان ہو، ان باتوں کو سمجھ نہیں سکو گے۔ بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات لگتی ہے لیکن تم نہیں جانتے ہوسِ اقتدار میں اندھے حکمرانوں کو چاروں طرف صرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔ ہمارا اتہاس ایسے سینکڑوں واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ یہ مہا بھارت کیا تھی؟ ہوسِ اقتدار میں اندھے ہو جانے والے خون کے رشتہ داروں نے دھرم اور انسانیت کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے کوروکشیتر کے میدان میں ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کر دیا تھا اور دنیا کے اتہاس کی طویل ترین لڑائی شروع ہو گئی تھی۔ —— ہم نو صدیوں سے سیاسی چلتر بازیوں سے آگاہ ہیں۔ یہ بیچارے آج کی پیداوار ہیں۔ جب ہم اقتدار کی دیوی کے چرنوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں تو یہ کس باغ کی مولی ہیں؟" —— اُس کے انسٹرکٹر نے کہا تھا۔

لیکن ـــــ

مالک رام کو اس جواب نے مطمئن نہیں کیا تھا ـــــ!!

وہ ایک عرصے سے "را" کے "سندھو دیش" سیل میں خدمات انجام دے رہا تھا اُن لوگوں نے اب تک ہزاروں کی تعداد میں کتابچے چھاپ کر پاکستان میں تقسیم کروائے تھے اور حیرت کی بات ہے کہ پاکستانی اخبارات کے چیخنے چلانے کے باوجود حکومت کے کانوں پہ جوں نہیں رینگتی تھی ـــــ محض اشک شوئی کے لیے معمولی نوعیت کی گرفتاریاں کی جاتیں جو پھر سیاسی سودے بازیوں کی نذر ہو جاتی تھیں۔

سنہرا جال

بنّے بھائی کا اصلی نام کیا تھا؟

اُن کے کسی جاننے والے نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں بھی لوگوں کو آم کھانے سے مطلب ہوتا ہے گٹھلیاں گننے سے نہیں۔

بنّے میاں بااثر سیاسی شخصیت تھے گو کہ انہوں نے کبھی الیکشن میں براہِ راست حصّہ نہیں لیا تھا اور زیادہ توجہ اپنے بزنس پر ہی دیا کرتے تھے۔

لیکن ـــــ

واقفانِ حال جانتے تھے کہ بنّے میاں کا بزنس بھی ایک ڈھکوسلہ ہے اور کچھ نہیں یہ جو اُن کی پان مارکیٹ میں دُکان تھی اس سے تو اُن کے گھریلو نوکروں کی تنخواہ بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔ بظاہر بنّے میاں پان کا پتّہ امپورٹ کرتے تھے۔ لیکن اس پان بیڑی کے سوداگر کی اصلیت عارف میاں سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔

عارف میاں نے حال ہی میں گریجوایشن کی تھی اور اب نوکری کے لیے سڑکوں پر جوتیاں چٹخا رہے تھے کہ ایک روز انہیں ایک عجیب ترکیب پیسے کمانے کی سُوجھی۔

عارف میاں دیکھ رہے تھے کہ اُن کے گھر آئے روز بھارت سے کوئی نہ کوئی مہمان ٹکا رہتا ہے۔ اُن کے ننھیال اور ددھیال دونوں بھارت میں تھے اور اکثر اُن کے ہاں رشتہ داروں کا آنا جانا لگا رہتا تھا ـــــ !!

ان میں دو تین خواتین و حضرات ایسے بھی تھے جنہوں نے تین تین چار چار پاسپورٹ بنا رکھے تھے اور نام بدل بدل کر سال میں تین تین چکر پاکستان کے لگا لیا کرتے تھے۔

اپنے ہر چکر میں وہ دس پندرہ ہزار روپے منافع کما لیتے تھے۔ اس میں وہ منافع شامل نہیں تھا جو انہیں پاکستانی سامان بھارت لے جاکر فروخت کرنے پر حاصل ہوا کرتا تھا۔

اس مرتبہ عارف میاں کے "موسیرے" (خالہ زاد بھائی) ایسے ہی ایک سلسلہ میں آئے تو انھوں نے عارف میاں سے کہا۔

"برادرِ عزیز تم کس چکر میں پڑ گئے ـــــ نوکریاں اگر جوتیاں چٹخانے سے مل جاتیں تو روزانہ سینکڑوں پاکستانی نوجوانوں کو "بھارت یاترا" کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری مانو اور وہ کرو جو اس ملک کے ہزاروں بے روزگار کر رہے ہیں اور لاکھوں روزگار والوں سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔

"میں سمجھا نہیں بھائی جان" ـــــ عارف کچھ کچھ سمجھ تو گئے تھے لیکن وضاحت چاہتے تھے۔

"ارے بھائی میاں۔ اِدھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال اِدھر ـــــ تم کیا سمجھتے ہو کر چچا جانی اور ماموں سال میں تین مرتبہ تمہاری بلائیں لینے آتے ہیں، میاں دھندہ کر رہے ہیں دھندہ ـــــ دس بیس ہزار سے شروع کیا تھا آج لاکھوں میں کھیل رہے ہیں اور دنوں میں حالت بدلتی ہے" ـــــ اُس کے خالہ زاد حسن نے کہا۔

"لیکن حسن بھائی مجھے تو ابا حضور سوائے طعنوں اور گالیوں کے کچھ نہیں دے سکتے اور اماں کے پاس جو زیورات تھے وہ انہوں نے باجی کے لیے رکھ چھوڑے ہیں، ابتدائی اخراجات بھی تو نہیں ہیں میرے پاس" ـــــ عارف میاں نے اپنی بے بسی ظاہر کی۔

"میاں یہ ہم پہ چھوڑ دو ـــــ ففٹی ففٹی پہ کام کریں گے۔ سرمایہ ہمارا اور محنت تمہاری۔ منافع آدھا آدھا" ـــــ حسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں" ـــــ عارف میاں کی رال ٹپکنے لگی۔

"ملاؤ ہاتھ اور کہو بسم اللہ" ـــــ حسن نے اپنی دائیں آنکھ دباتے ہوئے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔

عارف میاں کو بنے میاں کے گھر کا راستہ حسن نے دکھایا تھا۔ اُس نے عارف میاں کو بتایا تھا کہ بنے میاں کے بھارتی قونصلیٹ میں روابط ہیں۔ اُن کے ذریعے فوراً اور آسانی سے ویزہ مل جائے گا۔

ویزہ تو عارف میاں کو یوں بھی مل سکتا تھا اُن کے بہت قریبی رشتہ داروں کے علاوہ ایک سگی بہن اور بھائی بھی بھارتی شہری تھے۔

لیکن ـــــ

بنے میاں کے ذریعے ویزہ لینے میں ایک خاص حکمت جو اُسے حسن نے بتائی تھی یہ تھی کہ بنے میاں اُن کے سامان کے سب سے بڑے اور اچھے گاہک ہوتے۔ کیونکہ حسن کا بیوپار اُن سے پرانا چل رہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ عارف جیسے نوگرفتار کے لیے اس سے اچھی پارٹی اور کوئی نہیں۔

"سامان کھولنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی میاں ـــــ دہلی سے سیدھے یہاں آؤ اور سامان بنے میاں کے آدمیوں کو سونپ دو۔ شام کو رقم تمہارے گھر پہنچ جائے

گی ـــــ اور ہاں سب سے بڑی بات کہ اس شہر میں کسی کو تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہو گی ـــــ میاں اس بیوپار میں تحفظ میسر ہو تو راتوں رات بندہ لکھ پتی بن جاتا ہے اور کچھ عجیب نہیں کہ پھر تم خود بے روزگار ہوتے ہوئے چند پھیروں کے بعد کئی بے روزگاروں کو اپنے ہاں ملازم رکھ لو۔"

حسن نے عارف میاں کو وہ وہ سبز باغ دکھائے کہ بیچارے چُپ چاپ پھنستے چلے گئے۔ اُن کے پاس صرف شناختی کارڈ تھا لیکن یہ مسئلہ بھی حسن نے حل کروا دیا۔ وہ عارف میاں کو بنئے بھائی کے پاس خود لے گیا تھا اور اُن کی عالیشان کوٹھی پر عارف کی ملاقات کروائی تھی۔ عارف بنئے میاں کے طور اطوار اور رنگ ڈھنگ سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ اُس نے یہ کوٹھی دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ بنئے میاں کروڑوں کی آسامی ہیں اور ایک دن وہ بھی ضرور کروڑ پتی بن جائے گا۔

بنئے بھائی نے حسن کا موسیرا ہونے کے ناطے عارف میاں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اُن کا نہ صرف پاسپورٹ بنا بلکہ ویزہ بھی لگ گیا۔

عارف میاں نے پہلا چکر حسن کے ساتھ لگایا تھا۔

وہ دونوں پاکستان سے اکٹھے دہلی گئے تھے۔ عارف میاں حیران تھے کہ حسن غیر ملکی ہونے کے باوجود تمام چکر جانتا تھا۔ کیا مجال جو کسی نے اُن کے سامان کو چھو کر بھی دیکھا ہو۔

حسن اُسے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی لے گیا تھا۔ جس بھارتی شہری کو کسی نے پاکستان میں ہاتھ نہ لگایا ہو اُسے بھارت میں کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔ اُن کا سامان کسٹم سے بڑی آسانی سے پار ہو گیا اور دونوں اپنے گھر آ گئے۔

حسن گو کہ عارف میاں کی خالہ کا بیٹا تھا لیکن اُس نے عارف میاں کو ہمیشہ

اپنا دوست سمجھا اور اُن کو وہی موج میلہ کروایا جو کوئی دوست کسی دوست کو کروا سکتا ہے۔

دہلی کی اوپن سوسائٹی کو دیکھ کر عارف میاں پہلے پہل تو شرمائے لیکن جلد ہی اُن کی شرم جھجک اُتر گئی۔

حسن اُسے روزانہ ہی کسی نہ کسی ایسی جگہ لے جاتا جو کسی بھی پاکستانی سیدھے سادے نوجوان کی کمزوری ہوتی ہے۔

○

عارف میاں اِس دوران گیلش کمار کی نظروں میں پیدا ہونے والی وہ خصوصی چمک نہ دیکھ سکا جو شکار کو دیکھ کر اکثر گھاگ شکاریوں کی آنکھوں میں پیدا ہوا کرتی ہے۔

کیلش کمار کا تعارف حسن نے اپنے جگری دوست کے حوالے سے کروایا تھا۔

"یہ سالا نام کا ہی ہندو ہے۔ اپنے ساتھ سب کچھ کھا لیتا ہے۔ سالے کو "گاؤ ماتا" کے کباب تو بہت ہی پسند ہیں۔"

حسن نے پہلی ہی ملاقات پر اُس کا تعارف عارف میاں سے کرواتے ہوئے کہا۔

شاید عارف میاں کو اس بات کا یقین نہ ہوتا لیکن جب اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو کیلش کے متعلق حسن نے بتایا تھا تو اُنہیں بھی یقین آنے لگا۔ واقعی کیلش اُس کی توقعات سے بڑھ کر کھلے دل و دماغ کا نوجوان ثابت ہوا۔ وہ اُن کے ساتھ اُن کے گھر میں اکثر آتا جاتا تھا اور ہر وہ چیز بڑی آرام سے کھا لیتا جو ہندوؤں کے نزدیک "دھرم بھرشٹ" کر دینے والی ہوتی ہے۔

اب وہ عارف کو اکیلے اپنی کار پر گھمانے لے جایا کرتا اور اس دوران

وہ عارف سے اکثر پاکستان اور بھارت کے متعلق باتیں کرتا رہتا۔ اُس نے جلد ہی عارف میاں کو باور کروا دیا کہ یہ دھرم، ملک، ملت وغیرہ سب بکواس اور پاکھنڈ ہے۔ آدمی اس دنیا میں بڑی مختصر مدت لے کر آیا ہے اور سب سے بڑی انسانیت اور دھرم نوازی یہ ہی ہے کہ جب تک زندہ رہے خوب عیش اور آرام سے زندگی گزارے، الک جائے جہنم میں۔ انسان نے روز روز تو جنم لینا نہیں۔

عارف میاں آہستہ آہستہ اُس کے پھیلائے میٹھے زہر کو پینے لگے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو وہ ماحول ہوتا جس میں بیٹھ کر وہ باتیں کرتے یا پھر وہ بیئر یا کبھی کبھی شراب کا ایک آدھا پیگ جس کی عادت کملیش نے بڑی ہوشیاری سے عارف میاں کو ڈالی تھی۔

جب پہلی مرتبہ ایک "کیبرے" دیکھتے ہوئے کملیش نے اُس کے لیے ویٹرن کو آنکھ کا اشارہ کر کے بیئر منگوائی تو عارف میاں کو اس لیے پتہ نہ چل سکا کہ ان کی ساری توجہ کیبرے کرنے والی ڈانسر کی ٹانگوں اور جسمانی اُبھار پر مرکوز تھی۔

لیکن ـــــ

ایک گلاس چڑھانے کے بعد انہیں اپنے اندر کچھ تبدیلی کا احساس ضرور ہوا اور کیوں نہ ہوتا۔ عارف میاں نے تو ساری زندگی قوام والا پان نہیں کھایا تھا۔ اب اچانک بیئر کیسے ہضم کرتے۔

"چھوڑو یار! کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو" ـــ کملیش نے اُس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

یہاں سے وہ ایک ہوٹل میں ڈنر کے لیے آ گئے تھے جہاں حسن پہلے سے موجود تھا۔ اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ عارف میاں نے اپنے خالہ زاد بھائی کے منع کرنے پر بھی ایک پیگ وہسکی کا چڑھا لیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد جب عارف میاں کا دماغ آسمان کی بلندیوں پر پہنچا اور انہوں نے خود کو کوئی غیر مرئی مخلوق جاننا شروع کیا تو کملیش اور حسن اُسے دہلی کے بازارِ حسن کے ایک کوٹھے پر لے گئے۔

وہ پہلی ایسی رات تھی جب عارف میاں کو اپنے مرد ہونے کا احساس ہوا۔ عارف میاں بالکل نہ جان سکے کہ اُن کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔

○

وہ دہلی میں سات آٹھ روز رہنے آئے تھے لیکن اُن کا قیام پندرہ روز سے زیادہ ہو رہا تھا اور ابھی مزید پندرہ بیس روز تک کملیش اور حسن نے اُسے یہیں روکنے کا پروگرام بنایا تھا۔

علی الصباح جب عارف میاں کو ہوش آیا تو وہ کسی طوائف کے بیڈ روم میں سو رہے تھے لیکن ـــ اکیلے نہیں ۔۔!!

ایک پری جمال اُس کے پہلو میں چمٹی تھی اور اُن کے سرہانے دھری تپائی پر شراب کی آدھی خالی بوتل گلاس سمیت موجود تھی۔

ایک مدہوشی سی اُن پر طاری تھی۔ انہیں اپنا دماغ بوجھل لگ رہا تھا لیکن سرور و انبساط کی لہریں اُن کے رونگٹے رونگٹے سے اُٹھ کر سارے بدن کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

"رات کیسی گزری مولانا!" ـــ اچانک ہی اُس کے کمرے میں کملیش اور حسن داخل ہوئے دونوں کے ساتھ ایک ایک حور زادی چمٹی تھی بالکل ویسی ہی جیسی اُس کے پہلو میں موجود تھی۔

"سالی کو ابھی تک نیند آ رہی ہے۔ شاید دولہا بھائی نے ساری رات سونے نہیں دیا"۔ حسن کے پہلو سے چمٹی حور آفریں نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

عارف میاں کو زمین پھٹتی نہیں دکھائی دیتی تھی کہ اُس میں سما جاتے لیکن وہ صرف جھجک اور شرمندگی محسوس کر رہے تھے ـــــ ضمیر کی طرف سے معاملہ بالکل صاف تھا اور کسی بھی طرح کی ملامت کا سامنا اُنہیں نہیں کرنا پڑا جو اس بات کی علامت تھی کہ اب وہ واقعی پٹڑی سے اُترنے لگے ہیں۔

صبح صبح ہی وہ حسن اور کملیش کے ساتھ خالہ جان کے ہاں پہنچ گئے اور دوپہر تک لمبی تان کے سوتے رہے۔

"اے میاں خیریت تھی آج تو گھوڑے بیچ کر سوتے رہے" ـــــ خالہ جان نے خلافِ معمول انہیں دیر تک سونے پہ کہا۔

"رات بڑی دیر سے آئے تھے اماں! آخری شو دیکھ کر۔ پھر نیند بھی دیر سے آئی اور میں نے بھی جگانا مناسب نہ جانا" ـــــ اُس کے بجائے حسن نے جواب دیا۔

نہانے سے عارف میاں کو خاصا افاقہ ہوا تھا اور اُنہیں اپنا جسم اب بڑا ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا تھا۔

"آج دوپہر کا کھانا میاں کملیش کے یہاں ہے" ـــــ حسن نے اُسے مطلع کیا۔ "میں تو آگرہ جا رہا ہوں کام کے سلسلے میں تمہیں کملیش خود ہی لے جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان" ـــــ قربانی کے بکرے عارف میاں نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"میاں ذرا سنبھل کے چلنا۔ مزہ ضرور لو مگر تھوڑا تھوڑا" ـــــ جاتے جاتے حسن نے آنکھ دباتے ہوئے کہا اور عارف میاں لڑکیوں کی طرح شرما کر رہ گئے۔

کملیش تھوڑی دیر بعد ہی اُسے لینے آ گیا۔

⊙

راستے میں جان بوجھ کر وہ رات کے واقعات کے حوالے سے گفتگو کرتا رہا۔ گھر پہنچنے تک اُس نے عارف میاں کی ساری جھجک ختم کر دی تھی اور عارف میاں خود اُس سے ایسی ہی کسی "تقریب" کی فرمائش بھی کرنے لگے تھے۔

"ہمارے ساتھ رہو گے تو عیش کروا دیں گے۔ میاں صاحبزادے یہ دلّی ہے تمہارا لاہور یا کراچی نہیں۔ یہاں تو دور دور تک کسی مولوی یا پنڈت کا سایہ نظر نہیں آئے گا۔ میاں بڑی فری سوسائٹی ہے۔ خوب موجیں اُڑاؤ۔ تمہیں تو علم ہے کہ پاکستانی نوجوان جو یہاں دہلی میں آتے ہیں۔ دن رات شراب اور شباب کے نشے میں مدہوش رہتے ہیں۔ میاں صاحبزادے ایک ہفتے میں وہ ایک سال کی روحانی اور جسمانی غذا لے کر اور خوب سیر ہو کر جاتے ہیں" ـــــ کملیش نے اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر کے سامنے گاڑی پارک کرتے ہوئے کہا۔

کملیش کی ماں کسی دوسرے شہر کے کالج کی پرنسپل تھی اور باپ کسی تیسرے شہر میں سرکاری افسر تھا۔ گھر پہ وہ اپنی بہن کے ساتھ رہتا تھا۔

یہ اطلاعات اُسے حسن سے ملی تھیں اور آج وہ پہلی مرتبہ اُس کے گھر جا رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ دونوں سیدھے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔

"میں ایک منٹ میں آتا ہوں" ـــــ کہہ کر کملیش شاید باتھ روم میں گیا تھا۔ اس درمیان عارف میاں بڑے انہماک سے دیوار پہ لگی ایک نہایت خوبصورت پینٹنگ دیکھنے لگے۔

اچانک ہی وہ اپنے عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز پہ چونکے اور جیسے ہی عارف میاں نے گردن گھمائی اُنہیں یوں لگا جیسے وہ پتھر کے ہو جائیں گے ـــ!!

پاکستان کے ایک بڑے اور ماڈرن شہر میں رہنے اور پندرہ بیس روز دہلی کی "فری سوسائٹی" میں گزارنے کے بعد گو کہ انہوں نے بڑے بڑے قتال چہرے

دیکھے تھے۔ دہلی کے نائٹ کلبوں میں ناچنے والی فاحشاؤں کے جسمانی نظاروں سے جی بھر کے لطف اندوز ہونے اور بڑے بڑے ہوٹلوں کی مخلوط محافل میں کئی زہرہ گدازوں کی زلفوں کے اسیر ہوتے ہوتے بچے تھے۔

لیکن ——

حسن اور جنسیت کا اس سے زیادہ خوبصورت امتزاج وہ اس جنم میں دوبارہ کبھی نہ دیکھ پاتے۔

جین جیکٹ میں ملبوس آدھے ننگے بازوؤں والی سانولے رنگ کی اس ساحرہ نے جس کا جسم لباس کی قید سے آزاد ہونے کے لیے مچلا جاتا تھا جب ماتھے پر گرے انگریزی سٹائل کے بالوں کو جھٹکا دے کر دائیں آنکھ سے ہٹاتے ہوئے "ہیلو" کہا تو عارف میاں کو یوں لگا جیسے وہ ہزاروں سال پرانے کسی معبد کے پجاری ہیں اور اچانک ہی حسن کی دیوی اُن کی تپسیا سے پرگٹ ہو کر پتھر کے بُت سے انسانی روپ میں اُن کے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے۔

وہ آنکھیں جھپکے بغیر بادامی رنگ کی اس ساحرہ کو ٹکٹکی باندھے پتھر کے بُت کی طرح دیکھتے رہے جس کی سیاہ اور انتہائی چمکدار آنکھوں میں عارف میاں کو اپنا آپ ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔

"کیسی لگی یہ پینٹنگ؟" —— اس قتالہ نے ایک قدم مزید آگے بڑھتے ہوئے عارف میاں کے دل پہ دھم سے قدم رکھا اور پوچھا۔

"ونڈرفل" —— عارف میاں نے تھوک نگل کر بمشکل کہا۔

"میں نے بنائی ہیں" —— قتالہ نے موتی بکھیرے۔

"ایک دم شاندار" —— عارف میاں رطب اللسان تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ تصویر کی تعریف کر رہے ہیں یا مصورہ کی کہ اچانک ہی کلیش اندر آ گیا۔

"عارف میاں یہ میری بہن ہے" —— اس نے اپنی دانست میں پوری جان کا تعارف کروا دیا۔

"مینا کشی" —— کہتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ عارف کی طرف بڑھا دیا۔

عارف میاں کے بے قبیلے اور منجمد جسم نے حرکت کی اور انہوں نے اپنا کپکپاتا ہاتھ مینا کشی کے ہاتھ میں دے دیا۔

جیسے ہی مینا کشی نے اُس کا ہاتھ پکڑا عارف میاں کے خون میں اُبال آ گیا انہیں اپنی ہیئت بدلتی محسوس ہوئی اور جسم میں خون کے بجائے سرور و انبساط کی لہریں دوڑنے لگیں۔

مینا کشی نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے براہِ راست اُسکی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دی تھیں اور عارف میاں اُس ایک لمحے کو حاصلِ زندگی سمجھ کر اس خوف سے آنکھیں نہیں جھپک رہے تھے کہ کہیں یہ منظر آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

"تشریف رکھیئے" —— مینا کشی کی آواز مندر میں بجنے والی گھنٹیوں کی طرح اُسے بہت دُور سے آتی سنائی دی اور اُس کے ہاتھ کی خوبصورت انگلیوں پر نظریں جمائے جن سے مینا کشی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کلیش بھیا آپ کی اتنی تعریف کر چکے ہیں کہ آج میں نے انہیں مجبور کر کے آپ کو یہاں بُلا لیا ہے۔ یہ حسن بھائی بھی عجیب آدمی ہیں۔ دہلی بھر کے ہوٹلوں کی ملاقات ہم سے کرواتے رہتے ہیں لیکن آپ کو نجانے اب تک کہاں چُھپا کے رکھا تھا" —— مینا کشی مسلسل بول رہی تھی۔

اُس کے بادامی ہونٹوں پر لگی براؤن رنگ کی لپ سٹک کے پس منظر میں جھانکتے سفید موتیوں ایسے دانت اور آنکھوں میں سمٹے ایک عالم کے سحر کی

تاب لانا عارف میاں کے لیے کارِ دارد تھا۔

"جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ تو کمال کی مصورہ ہیں" ـــــ بالآخر اُس نے سوچ سوچ کر ایک بات کہہ ہی دی۔

"مینا کشی نے آج تمہارے لیے خاص طور سے چھٹی کی ہے ہم سارا دن تمہارے ساتھ گزارنے کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں"

کملیش نے کہا اور عارف میاں کو وہ کہاوت یاد آئی کہ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔

"آپ گپ شپ کیجئے میں چائے لاؤں" ـــــ کہہ کر مینا کشی چلی گئی۔

عارف میاں کی نظریں مینا کشی کی کمر پر گڑی تھیں۔ اس کا ہر قدم جو زمین پر پڑتا دراصل عارف میاں کے دل پر پڑ رہا تھا۔

کملیش کنکھیوں سے اُس کی بدلتی حالت کا جائزہ لیتا دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اُس کے چلائے ہوئے سارے تیر ایک ایک کرکے نشانے پر بیٹھ رہے ہیں۔

اس درمیان اُس نے دوبارہ عارف میاں سے رات کی ملاقات اور واردات کی باتیں شروع کر دیں۔

اب یہ سب کچھ عارف میاں کے لیے بیکار تھا۔

کیوپڈ مہاراج نے ایسا تان کر تیر اُن کے دل میں ترازو کیا تھا کہ اب انہیں ساون کے اندھے کی طرح ہر طرف مینا کشی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ مینا کشی کی واپسی آٹھ دس منٹ بعد ہی ہو گئی۔

○

وہ چائے اور لوازمات سے لدی پھندی ٹرالی کھینچتی سیدھی عارف میاں کے

سامنے آ رہی تھی۔ ٹرالی اُس نے عارف میاں کے سامنے روک کر اُس کے لیے قدرے جھک کر چائے بنانا شروع کی تو عارف میاں کا دل اُچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ مینا کشی اپنے جسم سے مکمل بے نیاز دکھائی دے رہی تھی۔

لیکن ـــــ

عارف میاں کی آنکھوں نے اُس کے گریبان میں جیسے مستقل بسیرا کر لیا تھا۔ انہوں نے مینا کشی کا وہ روپ دیکھ لیا تھا جسے دکھانے کے بعد بنگال کی جادوگرنیاں آدمی کو بندر اور گدھا بنا دیا کرتی ہیں۔ اب وہ جب بھی چاہتی انہیں اپنے شباب کی ڈگڈگی پر بندر کا ناچ نچا سکتی تھی۔

عارف میاں کے دل کی دھڑکنیں اتنی بے قابو ہو گئی تھیں کہ انہیں اپنا دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر گرتا دکھائی دینے لگا تھا۔ مینا کشی نے جب کھڑے ہو کر چائے کی پیالی اُن کی طرف بڑھائی تو عارف میاں نے بمشکل ہاتھ کی کپکپاہٹ پر قابو پایا تھا۔

اس کے بعد مینا کشی نے اپنے لیے چائے تیار کی اور عارف میاں کے پہلو میں اس طرح براجمان ہو گئی کہ انہیں اب اپنا سانس بھی رُکتا محسوس ہونے لگا۔

"تم اپنے لیے خود بنا لو، اپنی مرضی سے۔ کیونکہ تمہیں میرے ہاتھ کی بنی چائے کبھی پسند نہیں آتی" ـــــ مینا کشی نے کملیش سے کہا اور اپنے موتیوں جیسے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ایک پلیٹ جس میں بڑے سلیقے سے کباب سجے تھے عارف کی طرف بڑھا دی۔

"شکریہ" ـــــ عارف میاں اس مہمان نوازی پر مرے مٹے جا رہے تھے۔

"لیجئے نا" ـــــ مینا کشی نے ایسی ادا سے کہا کہ بے ساختہ عارف میاں کا ہاتھ تھالی کی طرف بڑھ گیا۔

"اب ایسی بھی بے رخی کیا۔ یہ مستقل رہنے والے نہیں مستقل قیام تو تمہارا بہرحال میرے ہی ساتھ رہنا ہے"۔۔۔ کملیش نے پلیٹ میں سے دو کباب ایک ساتھ اُٹھاتے ہوئے مینا کشی سے کہا۔

اچانک ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

کملیش منہ میں کباب رکھے فون تک پہنچا اور فون سننے پر اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پیدا ہونے لگے۔

"سوری یار!"۔۔۔ اُس نے فون رکھ کر عارف میاں سے کہا ۔۔۔ "سالا ڈائریکٹر اچانک بمبئی سے یہاں آن مرا ہے اور ہنگامی میٹنگ بُلا لی ہے۔ میں تو چلا اب ملاقات شاید رات کے کھانے پہ ہو گی۔ مینا کشی تمہیں سنبھالے گی۔ بے فکر رہو اس کی صحبت میں تم بور نہیں ہو گے"

کہتے ہوئے اُس نے میز کے کونے پہ رکھی اپنی کار کی چابی اُٹھائی لیکن اچانک ہی آگے بڑھ کر مینا کشی نے اُس سے چابی چھین لی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا ۔۔۔ بھئی کیا مذاق ہے ۔۔۔ مجھے بہت جلدی ہے" ۔۔۔ کملیش نے کہنا چاہا۔

"اس گھر کے باہر چوبیس گھنٹے آپ کو ٹیکسی مل سکتی ہے۔ میرا نہیں تو خالہ کا خیال کر کے کچھ تو شرم کرو۔ ہم کیا دلی کی سڑکوں پہ پیدل گھومیں گے اور وہ بھی اس موسم میں جب کسی بھی وقت بارش متوقع ہو" ۔۔۔ مینا کشی نے چابی اپنی مخصوص جیکٹ کی جیب میں ڈالی۔

کملیش نے ایک لمحے کے لیے اُسے گھور کر دیکھا پھر یہ کہہ کر باہر بھاگ گیا۔ "ٹھیک ہے اب تم مہمان کو درمیان میں لے آئی ہو تو یہ قربانی دینی ہی ہو گی"

عارف میاں کے لیے زندگی میں اس سے زیادہ آئیڈیل سچویشن اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ اس وقت خدا سے کچھ اور بھی مانگتے تو انہیں مل جاتا۔

تنہائی اور مینا کشی کا ساتھ ۔۔۔

وہ خود کو شہزادہ اندر جاننے لگا تھا۔

(۶)

"عارف صاحب! ہم تو کسی دھرم کو نہیں مانتے اور یہ کباب میں نے خود اپنے ہاتھوں تیار کیے ہیں لیکن سُنا ہے پاکستانی بڑے پکے مسلمان ہوتے ہیں اور ..." مینا کشی نے کچھ کہنا چاہا۔

"اجی چھوڑیے آپ بھی کیسی باتیں لے بیٹھیں" ۔۔۔ عارف میاں نے پاکستانی مسلمانوں کو بے نقط سناتے ہوئے کہا۔

مینا کشی عارف میاں کے اتنے نزدیک بیٹھی تھی کہ انہیں اپنے پہلو میں الاؤ دہکتا محسوس ہونے لگا تھا۔ پہلے پہل تو وہ رعب حسن سے خاصا دبا دبا دکھائی دے رہا تھا۔

لیکن ۔۔۔

جب حسن ہی اُس پر مہربان ہو رہا تھا تو اس نے بھی کل پرزے نکالنا شروع کر دیے۔ مینا کشی نے اُسے ہر طرح قریب آنے کا موقع دیا تھا لیکن بہت قریب نہیں آنے دیا تھا فی الوقت وہ اپنے "شکار" کی آتش شوق کو اتنا بھڑکا دینا چاہتی تھی کہ پھر وہ اُسے اگر جہنم میں کود نے کا حکم بھی دے تو اُس کے لیے ناں کی گنجائش باقی نہ رہے۔

مینا کشی نے اُسے اپنی مصوری کے کچھ فن پارے دکھائے تھے اور بتایا تھا کہ اُسے ناچنے اور پاپ میوزک کا بہت شوق ہے۔

اس دوران عارف میاں کی رال مسلسل ٹپکتی رہی وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں
ینا کشی کو کھا جانا چاہتے تھے جب اچانک اُس نے دوپہر کا کھانا کسی ہوٹل میں کھانے
کی تجویز پیش کر دی۔

"چھوڑیئے کھانا بس میرے ساتھ یونہی باتیں کرتی جایئے"۔۔۔ اُس نے اچانک
ہی ینا کشی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

اس پر ینا کشی نے لُجا جانے کی جو شاندار اداکاری کی تھی اُس پر وہ خود کو
دل ہی دل میں داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔ عارف میاں تو کاٹھ کے اُلّو ثابت ہو رہے
تھے۔ اُس نے خود ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی عارف میاں نے خود ہی اُس کا
ہاتھ چھوڑا تھا۔

"عارف صاحب! آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں مرد جس خاتون کا ہاتھ پکڑ لیں
پھر آسانی سے چھوڑا نہیں کرتے"۔۔۔ ینا کشی نے اُس کے اتنے نزدیک ہو کر یہ
بات کہی تھی کہ اُس کے جسم پر موجود ساری خوشبو عارف میاں کی نس نس میں سمانے
لگی۔

"جی ہاں! اگر وقت آیا تو میں بھی ثابت کر سکتا ہوں"۔۔۔ عارف میاں بھی
اب خاصا چہکنے لگے تھے۔

"دیکھیے اتنا بڑا دعویٰ ٹھیک نہیں۔"

"آپ آزما کر تو دیکھیں"۔۔۔ عارف میاں نے اتنا کہہ کر چاہا کہ آگے بڑھ کر
ینا کشی کو تھام لیں کہ اچانک کیلش کباب میں ہڈی بن کر نازل ہو گیا۔

"بھئی کس کو آزمانے کی باتیں ہو رہی ہیں اور کون آزمانے جا رہا ہے۔" اُس
کی شکل پر نظر پڑتے ہی عارف میاں کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

"کچھ نہیں چلیے کہیں باہر کھانا کھانے چلتے ہیں"۔۔۔ ینا کشی نے بے تکلفی

سے عارف میاں کا ہاتھ تھاما اور وہ لرز کر رہ گئے۔

خاصی بیباک اور بہادر محبوبہ مل گئی تھی انہیں۔!!

"شاید قدرت کو بھی منظور تھا کہ ہم اکٹھے کھانا کھائیں۔ ہمارے صاحب بہادر
کی فلائیٹ لیٹ ہو گئی ہے اب وہ شام کی فلائیٹ سے آ رہے ہیں"۔۔۔ اُس
نے دونوں کو مطلع کیا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ شام کو آئیں یا صبح کو ہمیں چلنا چاہیے"۔۔۔ ینا کشی
نے عارف کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

عارف میاں حیران تھے کہ اپنے بھائی جان کے سامنے وہ کتنی بیباکی سے
اُن کا ہاتھ تھام کر کھینچ رہی تھی۔ پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ ان لوگوں کا
تعلق مادر پدر آزاد معاشرے سے ہے۔ دھرم کو یہ مانتے نہیں تھے شاید
جسمانی تعلقات کو بھی بُرا نہ سمجھتے ہوں۔

کار کیلش چلا رہا تھا۔ ینا کشی اور عارف میاں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔
اور ینا کشی نے پچھلی سیٹ پہ موجود تمام پرانے اخبارات، رسائل اور دیگر الم غلم
اٹھا کر اگلی سیٹ پر رکھ دیا تھا۔

"اتنا قیمتی سامان کم از کم میں اپنے ہاتھوں باہر نہیں پھینکوں گی"۔۔۔ اُس
نے کیلش سے کہا۔

پچھلی سیٹ پر عارف میاں سے ینا کشی اس طرح لگ بیٹھی تھی جیسے وہ اس
کے مہمان نہیں بلکہ "میاں" ہیں۔ جب کیلش کوئی موڑ تیزی سے کاٹتا وہ اپنے
جسم کا سارا بوجھ عارف میاں پر لاد دیتی جنہیں یقین ہو چلا تھا کہ اُن کے دل کی
حرکت اچانک بند ہو جائے گی۔

تینوں ایک ڈسکو نما ہوٹل میں کھانا کھانے آئے تھے۔

کیلاش نے کھانے سے پہلے بیئر منگوائی تھی جو بیناکشی نے بھی عارف کے ساتھ ہی بے تکلفی سے پی۔ کھانا تینوں نے اکٹھے کھایا تھا۔ پھر وہ کچھ دیر دہلی کی سڑکوں پہ گھومتے رہے اور اب بیناکشی نے کیلاش کو اس کے دفتر کے سامنے ڈراپ کر کے اگلی سیٹ پر رکھا ڈھیر دوبارہ پچھلی سیٹ پر پھینک کر عارف میاں کو آگے بٹھا لیا تھا اور کار خود ڈرائیو کر رہی تھی۔

دونوں کناٹ پیلس آ گئے ـــــ!!

دریا کنارے ایک محفوظ اور قدرے گنجان کنج میں ایک مرتبہ پھر دونوں کے درمیان ذو معنی باتوں کا تبادلہ شروع ہوا۔ آسمان پہ صبح سے بادل کی ٹکڑیاں ایک دوسرے سے کٹ کر بکھری ہوئی تھیں وہ اچانک ہی اکٹھی ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں گہرے بادل چھا گئے۔

"میرے خیال سے کہیں اور چلتے ہیں تیز بارش آنے والی ہے" ـــ بیناکشی نے کہا۔

"جہاں آپ کا جی چاہے لے چلیئے ہم تو اب آپ کی زلفوں سے بندھے ہیں!" عارف میاں نے بالآخر صاف کہہ دیا۔

"جھوٹ ایک دم جھوٹ۔ میری زلفیں اتنی لمبی نہیں کہ جن سے کسی کو باندھا جا سکے" ـــ بیناکشی نے اپنے انگریزی سٹائل سے کٹے بالوں کی طرف اس کی توجہ دلائی اس کے ساتھ ہی نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ اس کی ہنسی ایسی ہی تھی۔

دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے پارکنگ کی طرف جا رہے تھے جب اچانک زور سے بادل گرجا اور بیناکشی نے یہی تاثر دیا جیسے وہ اچانک گھبرا کر عارف میاں سے لپٹ گئی ہو۔

اس طرح اچانک لپٹ جانے سے آسمان پہ کم اور عارف میاں کے اندر زیادہ زور سے بادل گرجا تھا۔

اس کا رواں رواں سرور و انبساط کی لہروں میں ڈوبنے لگا۔

"سوری" ـــ بیناکشی نے الگ ہوتے ہوئے نظریں جھکانے کی اداکاری کی۔

"شکریہ" ـــ عارف میاں نے اس طرح کہا کہ بیناکشی بے ساختہ ہنس دی۔

○

شام ڈھلنے کے بعد دونوں ڈسکو میں آ گئے۔

عارف میاں نے لوگوں کو ناچتے تو دیکھا تھا لیکن کبھی خود بھی کسی حسینہ کی باہوں میں باہیں ڈال کر ناچنا پڑے گا یہ تو انہوں نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ بیناکشی سے بغل گیر قدموں سے قدم ملائے ناچ رہا تھا۔

یہ شیطانی رقص تھا ـــ

جس کا خاتمہ عارف میاں کی تباہی کی بنیاد رکھ گیا ـــ

ناچ کے دوران جب انہوں نے بیناکشی کے لب لعلیں کی مسکراہٹ چرائی اور اس نے اس پہ ذرا سا بھی احتجاج نہ کیا تو عارف میاں نے اپنی دانست میں ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کر لیا تھا۔

لیکن ـــ

وہ نہ جان سکا کہ اب وہ "را" کی مکمل گرفت میں آ گیا ہے اور موت ہی اب اسے اس گرفت سے نجات دلا سکے گی ـــ"

"آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے" ـــ بیناکشی نے اسے اس کی خالہ کے گھر کے باہر رات دیر گئے ڈراپ کرتے ہوئے کہا تھا۔

دونوں الگ ہونے سے پہلے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے تھے اور مینا کشی نے عارف میاں سے دوبارہ جلد ہی ملاقات کا وعدہ لیا تھا۔

مینا کشی تو چلی گئی۔

لیکن ــــ

عارف میاں ساری رات بستر پہ کروٹیں بدلتے رہے۔

کیا مجال جو ایک پل کو اُن کی آنکھ لگی ہو۔ مینا کشی ساری رات اُن کے دل و دماغ پر مسلط رہی۔ انہوں نے جانے عالم تصور میں وحشت کے کون کون سے صحرا پاٹ لیے۔

صبح تھوڑی دیر سونے کے بعد اُن کی آنکھ دوبارہ کھلی تو ناشتے کی میز پر حسن اُن کا منتظر تھا ــ

"کیا بات میاں صاحبزادے ــــ یہ اُڑی اُڑی سی رنگت کیا اکیلے اکیلے شکار کرنے لگے" ــــ اُس نے ایک آنکھ دبا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں کچھ نہیں بس یونہی" ــــ عارف میاں نے شرماتے ہوئے کہا۔

"کچھ بات تو ایسی ضرور ہے، چلو نہ بتاؤ۔ جلد یا بدیر ہمیں پتہ تو چل جائے گا" حسن نے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

یہ ابتدا تھی ــــ!!

اگلے روز مینا کشی اُسے لینے آئی۔ اُس نے عارف میاں سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ بھی اُن ہی جذبات کی اسیر ہے جن کے عارف میاں ہیں۔ اُس نے عارف سے کہا کہ وہ دھرم کرم کو نہیں مانتے نہ ہی اُس کے والدین کو کسی بات پر اعتراض ہوگا سوائے اس کے کہ وہ پاکستان میں نہیں رہ سکتی۔ یہ بات سنتے ہی عارف میاں میں مجنوں کی روح حلول کر گئی اور انہوں نے اپنی لیلیٰ کے لیے سب کچھ ٹھکرا دینے

کا فیصلہ کر لیا۔

"دیکھ لیجیے! عارف صاحب باتیں کرنا آسان ہے لیکن اُن پر عمل کرنا خاصا مشکل" ــــ مینا کشی نے شرمانے کی اداکاری کی۔

"آپ کیسی بات کر رہی ہیں۔ میں آپ کے لیے جان دے سکتا ہوں۔"

ابھی اُس کے الفاظ منہ میں تھے جب مینا کشی نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔"

اُس روز کلبھوشن کسی دوسرے شہر کام گیا ہوا تھا اور مینا کشی رات کو "ڈسکو" سے سیدھی اُسے اپنے ہاں لے آئی تھی۔

عارف میاں کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ اس درمیان "کیا کولا" کی بوتل میں اُنہیں تیز نشے والی شراب پلا دی گئی تھی۔

یہ سارا "ارینج" پروگرام تھا۔ اُس رات عارف میاں مینا کشی کے گھر رہ گئے اور صبح ہونے پر جب اُنہیں علم ہوا کہ ساری رات وہ اکٹھے لیٹے رہے اور انہوں نے مینا کشی سے جسمانی تعلقات بھی قائم کر لیے ہیں تو وہ کچھ خلش سی محسوس کرنے لگے۔

"مینا کشی بخدا میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا بس جذبات کے ہاتھوں" ــــ اُس نے اپنے پہلو میں موجود مینا کشی سے کہنا چاہا۔

"عارف صاحب! جلد یا بدیر یہ تو ہونا ہی تھا۔ یوں بھی بھارتی ناری جسے من سے اپنا دیوتا مان لے اُس کے ہر حکم کی اطاعت پجارن کی طرح کرتی ہے بس میری ایک ہی التجا ہے اب آپ مجھے چھوڑ کر نہ جائیے ــــ اگر آپ کو بادلِ نخواستہ پاکستان جانا بھی پڑے تو واپس ضرور آئیے گا۔"

عارف میاں نے اُس روز اپنی دانست میں پہلی مرتبہ کسی کو اپنا ہمراز بنایا اور حسن کو اس واردات عشق سے آگاہ کر دیا۔ حسن نے اس کی خلاف توقع حوصلہ افزائی

کی اور کہا کہ اگر میناکشی نے سب کچھ اپنی مرضی سے کیا ہے تو کملیش کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

"یار یہ بڑے آزاد خیال لوگ ہیں اور تم میناکشی کو بھی کوئی عام سی لڑکی نہ سمجھ لینا خدا جانے وہ عشق کی اندھی تمہارے جال میں کیسے پھنس گئی۔ بڑے بڑے رؤسا اُس سے وہ باتیں کرنے کو ترستے ہیں۔ میاں! وہ غضب کی مقررہ ہے اور جلد ہی بڑی سرکاری افسر بننے والی ہے۔ اُس نے حال ہی میں کوئی بڑا اہم مقابلے کا امتحان بھی پاس کیا ہے —— بڑے اثر و رسوخ والے لوگ ہیں عارف میاں!" —— اُس نے حسبِ عادت اپنی دائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"اگر تم نے ذرا سی چالاکی سے کام لیا تو نہ صرف کروڑ پتی بنو گے بلکہ میناکشی ایسی خوبصورت لڑکی بھی تمہارے قابو میں آ جائے گی —— میاں عیش کرو عیش —— بس ذرا ہمارا خیال رکھنا۔"

عارف میاں نے بالآخر واپس جانا تھا ——!!

لیکن ——

روانگی سے تین چار روز پہلے ایک دن اچانک ہی میناکشی نے انھیں بتایا کہ وہ اُن کے بچے کی ماں بننے والی ہے تو اُن کے پاؤں تلے زمین سرکنے لگی۔

اس روز حسن اور کملیش نے اُس سے شام کو بڑی اہم میٹنگ کی۔ حسن اور کملیش نے بتایا کہ انہیں اس رشتے پہ کوئی اعتراض نہیں اور اگر عارف میاں چاہیں تو میناکشی سے خفیہ شادی کر لیں۔

عارف میاں کے لیے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا —— دوسرے روز دونوں کسی "مجسٹریٹ بہادر" کو پکڑ لائے اور عارف میاں کو بتایا کہ یہ فیملی کورٹ

کے جج ہیں لیکن عدالت میں جانا مناسب نہیں تھا سو دونوں نے جج صاحبان کے سامنے میاں بیوی ہونے کا اقرار کر لیا۔

تین چار روز تک عارف میاں گلچھرے اڑاتے رہے۔

ابھی ہنی مون نامکمل ہی تھا کہ "ویزہ" مکمل ہو گیا۔

یہ نئی قباحت آن پڑی تھی۔

اس مرحلے پر وہ ایک لمحے کے لیے اپنی زوجہ محترمہ سے الگ نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اب کیا کیا جائے؟

"میرا ایک سیکورٹی والا دوست ہے اُس سے بات کرتے ہیں" —— حسن نے رائے دی۔

"ٹھیک ہے۔"

سالے اور بہنوئی دونوں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

سیکورٹی والا بھی آ گیا۔

اُس نے عارف میاں کا پاسپورٹ دیکھ کر انکشاف کیا کہ اُن کا ویزہ تو پچھلے ہفتے ختم ہو گیا ہے اور وہ غیر قانونی طور پر یہاں قیام پذیر ہیں اب کسی بھی لمحے جاسوسی کے الزام میں دھر لیے جائیں گے۔ کیونکہ آجکل بھارتی حکومت ہر پڑھے لکھے پاکستانی پر بھی الزام عائد کر کے اُسے گرفتار کرتی ہے۔

"بھائی یہ تو غضب ہو جائے گا۔ کچھ کرو میاں" —— حسن اور کملیش دونوں نے اُس کی منت سماجت شروع کر دی۔

اس ڈرامے کا کلائمکس سین وہ تھا جب کملیش نے اچانک اپنی جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"شرما صاحب مجھے اپنی نہیں اپنی بہن کی فکر ہے۔ اگر عارف میاں یہاں

گرفتار ہو گئے تو وہ خودکشی کر لے گی۔ بھگوان کے لیے کچھ کیجئے۔"

فضا خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔

"دیکھئے کلیش صاحب آپ چونکہ معزز لوگ ہیں۔ میں آپ کی صرف ایک مدد کر سکتا ہوں اور یہ بھی بتا دوں کہ اس میں ناں کی گنجائش نہیں ——— سیدھی سی بات ہے آج کل یہ معاملہ عام چل رہا ہے۔ عارف میاں اگر ہمارے لیے تھوڑا بہت کام کرنے پر رضامند ہو جائیں تو ہم ان کے لیے دو عدد پاسپورٹوں کا بندوبست کر دیں گے اور انہیں ویزے کی بھی کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔ بس سال میں کچھ عرصہ پاکستان میں اور کچھ عرصہ بھارت میں گزار لیا کریں۔ جب ان کا کام مکمل ہو گیا تو انہیں بھارتی شہریت بھی مل جائے گی۔ بصورتِ دیگر اگر میں انہیں گرفتار نہیں کروں گا تو بھی یہ ضرور پکڑے جائیں گے اور پھر کم از کم پندرہ بیس سال جیل میں سڑتے رہیں گے۔ آپ کو علم ہی ہے ہمارے ہاں جیوڈیشری کا کیا حال ہے اور میں آپ کو یہ مشورہ بھی دوں گا کہ ابھی اس شادی کو بھی خفیہ ہی رکھیے۔"

"مجھے منظور ہے" ——— عارف میاں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ٹھیک ہے شرما صاحب آپ کا بہت شکریہ کہ آپ اس آڑے وقت ہمارے کام آئے" ——— حسن نے شرما کا شکریہ ادا کیا۔

دو دن تک حسن، کلیش اور مینا کشی ٹھونک بجا کر اسے دیکھتے رہے کہ کہیں اس نے وقتی طور پر تو یہ فیصلہ نہیں کیا۔

لیکن ———

انہیں یقین ہو گیا کہ یہ عارف میاں نے جی جان سے کیا ہے اور وہ مکمل طور پر ان کے جال میں پھنس چکے ہیں۔

تیسرے روز شرما، عارف میاں کو لے کر چلا گیا۔ حسن اور کلیش اس کے

ساتھ تھے۔ لیکن وہ دونوں انتظار میں بیٹھے رہے۔ شرما، عارف میاں کو اپنے ساتھ لیے اپنے دفتر میں آ گیا جہاں اس نے عارف میاں کی ملاقات کسی سے کروانے کا اہتمام کر رکھا تھا اور انہیں سمجھایا تھا کہ وہ اس کے شہر کے رہنے والے اور ان کے "دوست" ہیں۔ وہی آئندہ اس کے معاملات کے انچارج ہوں گے۔

"بھائی میرے! سب یہی کر رہے ہیں۔ یہ ملک، مذہب، سب سالا فراڈ ہے۔ تمہارے ملک میں کیا اور میرے ملک میں کیا یہ سالے سیاستدانوں نے ہم سب کو گدھا بنا رکھا ہے اور اپنا اُلو سیدھا کر رہے ہیں" ——— اس کے ساتھ ہی اس نے چار پانچ پاکستانی لیڈروں کے نام لے ڈالے اور کہا ——— "یہ سب لوگ کون ہیں؟ تم نہیں جانتے۔ یار جب تم جانتے ہو تو تمہاری حکومت کیسے نہیں جانتی اور اب تم جن صاحب کو ملو گے ان کو دیکھ کر تم بالکل کلیئر ہو جاؤ گے۔"

اتنا کہہ کر اس نے گھنٹی بجائی اور مستعد گارڈ اندر آ گیا۔

"بھئی وہ خان صاحب آئے ہیں؟"

"سر وہ بڑے صاحب کے کمرے میں گپ شپ کر رہے ہیں۔"

"یار ان سے کہو کبھی ہم چھوٹے صاحبوں کو بھی منہ لگا لیا کریں" ——— شرما نے ہنستے ہوئے کہا۔

"او۔کے سر" ——— گارڈ واپس چلا گیا۔

"بھئی بڑے اثر و رسوخ والے آدمی ہیں۔ ہم تو اپنے کئی کام ان سے کرواتے ہیں۔۔۔۔"

ابھی اس کی بات نامکمل ہی تھی جب دروازہ کھلا اور جو شخصیت اندر داخل ہوئی اسے دیکھ کر عارف میاں حیرت کے مارے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

باباصاحب

یہ پرویز تھا ـــــــــ!

بنے بھائی کا دستِ راست اور عارف میاں کے حلقے کا ایم پی اے۔ اس کے شہر کا بچہ بچہ اس کے نام اور شکل و صورت سے آشنا تھا عارف میاں کو بخوبی اندازہ تھا کہ یہ شخص کتنے اثر و رسوخ کا مالک ہے۔ اس کا تعلق جس لسانی تنظیم سے تھا اس کے حکم کے بغیر عارف میاں کے شہر میں پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ لسانی تنظیم کی ذیلی طلبا تنظیم میں پرویز کو "دماغ" کی حیثیت حاصل تھی۔

عارف میاں جانتے تھے کہ ان لوگوں کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اور اب اُنہیں اس کی وجہ بھی سمجھ آنے لگی تھی۔

شرما انہیں دیکھ کر ادب سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"سر! یہ عارف میاں ہیں۔ ہمارے "نئے دوست" ہیں۔ وہاں آپ کے زیر سایہ وہ کام کریں گے" ـــ اس نے عارف کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

پرویز خان نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور بڑی گرمجوشی سے عارف میاں سے مصافحہ کیا۔ شاید عارف اسے اپنے کام کا آدمی لگا تھا۔

اس کے بعد تعارف کا مرحلہ شروع ہوا اور پرویز نے عارف میاں پر سوالات

کی بوچھاڑ کر دی۔ انہوں نے کرید کرید کر اس کے لاشعور میں موجود تمام خدشات باہر نکال لیے تھے۔

"آؤ دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ تم ذرا وہ فلم لانا شرما" ـــ پرویز نے شرما سے کہا اور عارف میاں کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگیا۔ جہاں آرام دہ کرسیوں کے علاوہ ٹی وی اور وی سی آر بھی رکھا تھا۔

"عارف میاں ہم لوگ بڑے کاز کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہم اپنی کمیونٹی کو دنیا میں ممتاز مقام دلانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بیالیس سال سے ظلم ہو رہا ہے۔ ہمارے حقوق کچلے جا رہے ہیں۔ جب ہم آواز بلند کرتے ہیں تو اُسے دبانے کے لیے کیا کیا حربے استعمال کیے جاتے ہیں تم اس فلم سے اندازہ لگا لینا"

اس درمیان وہاں ایک خوبصورت خاتون چائے لے آئی۔

اس کے تعاقب میں شرما بھی آگیا جس کے ہاتھ میں وڈیو فلم پکڑی ہوئی تھی۔ شرما نے وہ فلم وی سی آر میں لگا دی اور خود کام کا بہانہ کر کے باہر چلا گیا۔

"عارف میاں یہ فلم نقلی نہیں بالکل اصلی ہے تم خود اندازہ کر سکتے ہو۔ اسے دیکھ کر تو شاید تم بہتر اندازہ کر سکو کہ ہم غلط ہیں یا صحیح راستے پر جا رہے ہیں" پرویز نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

فلم شروع ہو گئی تھی۔

یہ اُسی لسانی تحریک کی تیار کردہ فلم رپورٹ تھی جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ اس تحریک سے حکومت بطورِ خاص زیادتی کرتی آئی ہے اور اب اس کی نسل کشی پر تُلی ہے۔ اس فلم کے ایک منظر میں اس لسانی تحریک سے متعلق لوگوں کی آبادی پر حملے کا منظر دکھایا گیا تھا۔

حملہ آوروں کی شناخت تو نہیں ہوئی تھی البتہ کہا گیا تھا کہ یہ سرکاری پشت پناہی

کے عالم غنودگی ہیں۔

یہ منظر بڑا اندوہناک تھا جس میں اس لسانی تحریک سے متعلق پختوں کے قتل کے مناظر دکھائے گئے تھے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ یہ سارا خونی کھیل اُن کی نسل کشی کے لیے رچایا گیا ہے اور اگر اب بھی وہ لوگ غفلت کی نیند سوئے رہے تو پھر شاید قیامت تک اس نیند سے بیدار نہ ہو سکیں۔

اب تو عارف میاں کو بھی اس بات کا یقین ہونے لگا تھا کہ واقعی اُن کی قوم کے ساتھ بڑا ظلم ہو رہا ہے۔

"تم یہاں ایک ہفتے کی تربیت مکمل کر لو پھر پاکستان آجانا لیکن ایک بات خیال رہے کہ زندگی میں کبھی عالمِ دیوانگی میں بھی تمہارے منہ سے یہ بات نہ نکلے کہ میری اور تمہاری ملاقات اس سے پہلے کہیں ہوئی ہے" ——— پرویز نے کہا۔

عارف میاں کے ارادے میں اگر کوئی کمزوری رہ بھی گئی تھی تو مینا کشی نے ایک ہی رات میں پوری کر دی۔ اُس نے عارف میاں پر جنسیت کا مکمل جادو چلایا تھا اور اب وہ شراب، شباب اور دولت کے ایسے سنہرے جال میں پھنس گیا تھا جہاں سے اس کا بچ نکلنا ناممکن تھا۔

دہلی ہی کے علاقے "وسنت وہار" میں واقع کیمپ میں اُسے تربیت دی گئی۔ عارف میاں اور اُس جیسے کچھ اور نوجوان بھی موجود تھے۔ ان لوگوں کو سختی سے اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنا مکمل تعارف کسی کو نہیں کروائیں گے اپنا صحیح نام کسی کو نہیں بتائیں گے۔ ایسی کوئی بات نہیں کریں گے جو اُن کی شناخت میں مدد دے سکے۔

اس کیمپ میں اُن کا انچارج سجاول تھا ——— !

کیپٹن مالک رام کو سجاول کا COVER NAME دیا گیا تھا۔ جس نے عارف میاں کو ایک ہفتے میں تخریب کاری کے اچھے خاصے داؤ پیچ سکھا دیئے تھے۔

اس ایک ہفتے کے ہنگامی پروگرام میں اُنہیں جلسہ گاہوں میں ہنگامہ کرنا، توڑ پھوڑ، بلوہ، لُوٹ مار، دہشت گردی، آگ لگا کر بھاگنا اور پولیس کے حفاظتی اقدامات کو توڑنے کی تربیت دی گئی تھی۔

مینا کشی اس دوران اُس پر جسمانی طور پر پوری طرح حاوی ہو جاتی تھی۔ شراب اُس کی عادت بن گئی تھی اور اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری رہتی تھیں۔

"را" کی ہدایت پر اگلے چند روز بعد وہ دل پر پتھر رکھ کر پاکستان آگیا۔

پاکستان آنے پر اُسے ایک خطیر رقم دی گئی تھی جو سامان برائے فروخت وہ یہاں سے لے جا رہا تھا وہ اس کے علاوہ تھا۔

پاکستان میں اُسے بنّے بھائی سے رابطہ کرنے کی ہدایت دی گئی تھی اور یہ بھی باور کروا دیا گیا تھا کہ اب وہی اس کا "باس" ہے جس کا ہر حکم بلا چوں و چرا اُس نے ماننا ہے۔ پاکستانی کسٹم [illegible] لوگ اس کے منتظر تھے۔ اس کا سامان بغیر کسی چیکنگ کے [illegible]

اگلے [illegible] بہت [illegible] بھائی کے پاس موجود تھا۔

بنّے بھائی کے کارندے نے اُس کا سامان اس کی مرضی سے بہتر قیمت پر خریدا اور اُسے بنّے بھائی سے ملنے کی ہدایت کے ساتھ رخصت کر دیا۔

عارف میاں کے والد صاحب اگلے بیس سال زندہ رہ کر بھی اتنے پیسے نہ کماتے جتنے اُن کے صاحبزادے نے اس ایک ڈیڑھ مہینے میں کما لیے تھے۔ انہوں نے ایک دو مرتبہ دبی زبان سے احتجاج کیا۔

نوجوان بیٹے لائق بیٹیوں کو دیکھ کر پھر مجرمانہ سی خاموشی اختیار کر لی۔

عارف میاں کی امی نے البتہ اُس کی خوب بلائیں لیں اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اُن کے بیٹے کو بھی بہنوں اور بوڑھے والدین کا خیال آیا اور اُس نے کمائی کی طرف دھیان دیا۔ عارف میاں کے ابا اگلے چند سال بعد ریٹائر ہو جاتے اور ان کا مستقبل مکمل تاریک ہو جاتا۔

○

بڑے بھائی سے عارف میاں کی ملاقات اگلے روز اُن کے دولت کدے پر ہوئی تھی۔!

انہوں نے عارف میاں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اُس کو بطورِ خاص اس بات کی نصیحت کی تھی کہ وہ کسی کو کانوں کان اس بات کی ہوا نہ لگنے دے کہ بھارت میں اس نے کیسا وقت گزارا۔

انہوں نے شام کو اپنے گھر پہ ہونے والی میٹنگ میں لسانی تنظیم کے نوجوان ونگ کو مدعو کر رکھا تھا جن کے سامنے بڑے بھائی نے عارف میاں کا تعارف کروایا انہیں تنظیم کے خصوصی ونگ میں ذمہ داری سونپی تھی۔

اس خصوصی ونگ کا تعلق تنظیم کے اعلیٰ عہدیداروں سے رہتا تھا اور عام کارکنوں کو بھی ان کی سرگرمیوں کا کچھ خاص علم نہیں تھا۔

ایک بات پر البتہ وہ سب اتفاق کرتے تھے کہ جب کبھی تنظیم پر کوئی مشکل وقت آتا تو اس کا خصوصی سکواڈ متحرک ہو جاتا اور چند گھنٹوں میں نتائج بدل کر رہ جاتے۔

بڑے بھائی نے تیسرے ہی روز عارف میاں کو کچھ نوجوانوں کے ساتھ شہر کی مشہور جلسہ گاہ کی طرف روانہ کر دیا۔ ان لوگوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ یہاں ہونے والے ایک سیاسی جماعت کے جلسے کو اُلٹانا اور خاصی گڑبڑ پھیلانا اُن کا مشن ہے۔!!

اس مقصد کے لیے انہیں خاص قسم کے پٹاخے دیے گئے تھے۔

عارف میاں نے پہچان لیا کہ یہ پٹاخے کہاں سے آئے ہیں؟ دورانِ تربیت انہوں نے ایسے پٹاخے بنانے اور چلانے کی تربیت حاصل کی تھی۔

"اس پارٹی کی کمان عارف میاں کے ہاتھ میں ہو گی" —— بڑے بھائی نے انہیں مطلع کیا۔

یہ عارف میاں کا پہلا باقاعدہ جرم تھا جو انہوں نے اپنے ملک کی سالمیت کے خلاف کیا۔

عارف نے تخریب کار گروپ کو اپنی تربیت کے مطابق منظم کیا اور یہ لوگ دو دو کے گروپس میں جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔

یہ جلسہ اس جماعت کا تھا جو مستقبل میں کبھی اس لسانی تحریک کے لیے مسائل پیدا کر سکتی تھی اور تحریک کے سربراہوں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ تحریک کے لیے پیدا ہونے والے "مسائل" سے بہر صورت نجات حاصل کریں گے۔ عارف میاں نے اپنے ساتھیوں کو ایک خاص تکنیک کے مطابق چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ جیسے ہی مرکزی لیڈر کی تقریر کا آغاز ہوا عارف میاں نے جو بڑی ہوشیاری سے نعرے لگاتے سٹیج کے نزدیک پہنچ گئے تھے اور بادی النظر میں یوں لگتا تھا جیسے وہ اس سیاسی جماعت کے جس کا یہاں جلسہ ہو رہا ہے بڑے جانثار اور خصوصی ورکر ہیں —— سٹیج کے گرد موجود محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے ایک پٹاخہ سٹیج کے نیچے لڑھکا دیا۔

سٹیج کے محافظ جن کی ساری توجہ گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے بلند کرنے پر مرکوز تھی اس حرکت کا نوٹس نہ لے سکے۔

ایک زوردار دھماکہ ہوا اور وہاں بھگدڑ مچ گئی۔

یہ ایک طرح کا سگنل تھا جو عارف میاں کے ساتھیوں کو ملا۔ انہوں نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا اور افراتفری میں جب ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی فکر دامن گیر تھی جلسہ گاہ کے مختلف کونوں میں ایسے پٹاخے چلانے شروع کر دیے۔

ایک قیامتِ صغریٰ چار سو بپا ہو گئی۔

جلسہ کے حاضرین جن کی تعداد ہزاروں میں تھی بدنظمی اور بے ترتیبی سے جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگنے لگے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو کچلنا شروع کر دیا اور درجنوں لوگ تو ایک دوسرے کے نیچے آ کر زخمی ہو گئے۔

عارف میاں نے بھاگتے ہوئے فائرنگ کی آواز بھی سُنی تھی۔ یہ فائرنگ ان کی پلاننگ میں شامل نہیں تھی۔ اس بات کا علم تو انہیں بعد میں ہُوا کہ کسی نے سٹیج کے قریب سے فائرنگ کر کے سٹیج پر موجود ایک اہم سیاسی شخصیت کو ہلاک کر دیا تھا۔

اس ہلاکت کی خبر جیسے ہی شہر میں پھیلی ایک ہنگامہ چار سو بپا ہو گیا۔ بڑے بھائی کے لوگوں نے ایک منظم سازش کے تحت شہر میں غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا اور اگلے روز اخبارات کی چیختی چلاتی سرخیاں بربادی شہر اور بے گناہوں کی ہلاکت کے واقعات سے بھری پڑی تھیں۔

یہ عارف میاں کا آغاز تھا ــــــ!!

اس بات کا علم انہیں بعد میں ہُوا کہ اس گروپ میں بہت سے نوجوانوں نے اُن کی طرح بھارتی کیمپوں میں تربیت حاصل کی تھی۔

لیکن ــــــ!

اُن میں سے کسی کو دوسرے کو بتانے کا حکم نہیں تھا۔ اس تنظیم میں رازداری کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اور پابندی نہ کرنے کی صورت میں اتنی بھیانک سزا ملتی تھی جس کا تصور ہی بڑا جان لیوا ہوتا۔

عارف کو اس مرتبہ ایسی ہی ڈیوٹی سونپی گئی تھی ــــــ!!

اس بہانے اس کا تعارف تنظیم کے اس تفتیشی سنٹر سے بھی ہو گیا تھا جس کی اس سے پہلے اس نے صرف کہانیاں سُنی تھیں۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ بہت کم خوش نصیب یہاں سے زندہ واپس جاتے تھے۔ یہاں صرف دو قسم کے لوگ آتے تھے۔

مغلوب اور غالب ــــــ

غالب تو وہ تھے جو تنظیم کے سربراہ "بابا صاحب" کے منظورِ نظر ہوتے اور مغلوب وہ جن پر تشدد کے پہاڑ توڑنے کے لیے انہیں یہاں لایا جاتا ــــ!

اس تشدد کی نگرانی جسے تفتیش کہا جاتا تھا عموماً تنظیم کے بڑے خود کرتے تھے۔

لیکن ــــ!

اس طرح کہ نہ تو تشدد کرنے والوں کو علم ہوتا نہ ہی تشدد برداشت کرنے والوں کو ــــ دونوں کو صرف احکامات کی پابندی کرنی ہوتی تھی۔ تنظیم کے بڑے ملحقہ کمرے میں ایک بڑی ٹی وی سکرین پر یہاں وقوع پذیر خونی ڈرامے کی مکمل کارروائی دیکھتے تھے اور بطورِ خاص اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ کہیں تشدد کرنے والے کے دل میں مغلوب کے لیے نرم گوشہ تو موجود نہیں؟

انسانی فطرت کے اس خاص پہلو پر ان لوگوں کی نظر ضرور رہتی تھی کیونکہ عموماً فریقین کا تعلق ایک ہی جماعت سے ہوتا تھا۔ جب مخالفوں کو یہاں لایا جاتا تو بھی اسی سنگدلی سے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے کہ پتھر دل پگھل جاتے تھے۔ کیونکہ "رحم" نام کا کوئی بھی لفظ تنظیم کی ڈکشنری میں موجود نہیں تھا۔

عارف میاں گزشتہ دو ماہ سے تنظیم کے احکامات کی آنکھیں بند کرکے پابند
کررہے تھے اس کی وجہ پہلے پہل تو مینا کشی کا عشق رہی ہوگی لیکن اب یہ ان کی
اور ضرورت بن گئی تھی۔ لسانی تنظیم میں اہم مقام حاصل کرنے والوں کے لیے دولت
عزت، شہرت اور عیاشی کے دروازے بڑی تیزی سے کھلتے تھے اور وہ بہت
سوسائٹی میں وی آئی پی کا مقام حاصل کرلیا کرتے تھے۔

یہ اُن کی خوش قسمتی کی انتہا تھی کہ محض دو ماہ بعد ہی انہیں "باباصاحب"
سے خصوصی ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا تھا ورنہ تنظیم کے ہزاروں جاں نثار
قدم بوسی کی حسرت دل میں لے کر ہی مرجایا کرتے تھے۔ عارف میاں جانتے
کہ لسانی تنظیم کے ہزاروں نوجوان اپنے "باباصاحب" کے ایک حکم پر گردن
پیش کرسکتے تھے۔

"باباصاحب" کو تنظیم میں ایک پُراسرار روحانی پیشوا کی حیثیت حاصل ہو
گو کہ وہ سیاسی لیڈر تھے لیکن ان کے پیروکاروں کا ایمان تھا کہ وہ پُراسرار
کے مالک ہیں جن کے بل بوتے پر وہ بڑے بڑے حکومتی عہدے داروں کو
چاٹنے پر مجبور کردیا کرتے تھے۔

بنّے بھائی عارف میاں کو "باباصاحب" سے ملانے کے لیے لائے تھے۔

"میاں صاحبزادے خوش قسمت ہو۔ باباصاحب سے ایک مرتبہ ملاقات کا
ہے عمر بھر عیاشی۔ محض ایک ملاقات سے تمہیں تنظیم میں وہ مقام حاصل ہو جائے
جو بڑے پُرانے ورکروں کو حاصل نہیں ہوتا حالانکہ انہوں نے تنظیم کے لیے
جانی اور مالی قربانیاں بھی دی ہیں" ـــــ بنّے بھائی نے اُسے راستے میں بتایا۔

"مجھے وہاں کرنا کیا ہوگا" ـــــ عارف میاں نے پوچھا۔ اس نے ابھی
اپنے ذہن پر باباصاحب کو مسلط کرلیا تھا۔

"کچھ نہیں بس سلام کرکے عقیدت سے بیٹھ جانا۔ اُن کی باتیں سُننا بیان بڑے
نصیب والے ہو۔ اُن کی چند منٹ کی صحبت کے لیے بڑے بڑے حکمران ترستے ہیں۔
تم تو جانتے ہی ہو چیف منسٹر کو بھی ملاقات کے لیے کتنا ایڈوانس وقت لینا پڑتا ہے۔
جانے کتنی درخواستوں کے بعد باباصاحب اس کے لیے پندرہ بیس منٹ نکالتے ہیں۔
خبردار! کوئی سوال نہیں کرنا۔ بس عقیدت سے اُن کی باتیں سر جُھکا کر سُنتے رہنا۔
پاسِ ادب رہے۔ آدابِ محفل کا تقاضا ہے کہ باباصاحب کی آنکھوں سے آنکھیں
زیادہ دیر تک دوچار نہ ہوں ـــــ سمجھ گئے ناں بس یہ سمجھ لو اور اگر تم نے
انہیں متاثر کرلیا تو مینا کشی یہاں تمہارے پاس آگئی"

بنّے بھائی نے آخری فقرہ کہہ کر گویا ترُپ چال چل دی تھی۔

اس تنظیم کے کرتا دھرتا جہاں شیطان کے چیلے جانے تھے وہاں کمال کے
ماہر نفسیات بھی ہوتے تھے اور انسانی کمزوری کو ایکسپلائٹ کرنے کے فن پر انہیں
کمال حاصل تھا۔ نوجوانوں کی کمزوریوں کو ایک ایک کرکے یہ کمبخت اتنی مہارت
اور معصومیت سے دباتے تھے کہ وہ ان کے ایک اشارے پر ذبح ہونے کے لیے
تیار رہتے تھے۔

باباصاحب کا مکان اس شہر کے عام سے مکانوں کی طرح تھا۔

لیکن ـــــ

بظاہر ایسا نظر آتا تھا، حالانکہ حقیقت میں یہ مکان ایسا قلعہ تھا جس تک باقاعدہ
فوج بھی معرکہ سر کرنے کے بعد ہی پہنچ سکتی تھی۔ اس محلے میں جہاں باباصاحب
قیام پذیر تھے جتنے بھی مکان تھے ان پر عملاً تنظیم کا قبضہ تھا۔ بادی النظر میں تو یہ
لوگ عام شہری تھے لیکن حقیقت میں تربیت یافتہ دہشت گرد۔

ان سیدھے سادے شہریوں کے گھروں میں دنیا کا جدید ترین اسلحہ موجود رہتا

تھا اور کسی ایجنسی کو اس طرف پھٹکنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اس محلے میں ہوا ان کی اجازت کے بغیر نہیں گزر سکتی تھی۔

بابا صاحب کے مکان سے دور دور تین تین کلو میٹر دور تک اُن کی حفاظتی انٹیلی جنس کا جال بچھا تھا۔ کیا مجال جو اس طرف آنے والی ٹریفک میں کوئی عام شہری ہو ـــــ یہاں سے گزرنے والوں پہ کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ان انتظامات کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا کہ اصلیت سے بے خبر کوئی بھی شخص کبھی یہ حقیقت ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ یہی سمجھتا تھا کہ یہ سارا بابا صاحب کے خلاف پراپیگنڈہ ہے جو ایک معمولی سے مکان میں قیام پذیر تھے۔

آج تک ایسا بہت کم ہوا تھا کہ بابا صاحب خود کسی اعلیٰ عہدے دار سے ملنے کے لیے گئے ہوں۔ جس کسی کو اُن سے ملنا ہوتا وہ خود اُن کی رہائش گاہ پہ آکر اُن سے ملاقات کرتا تھا۔

کسی حکومتی عہدیدار تک اگر بابا صاحب کا حکم پہنچ جاتا کہ وہ اس سے ملنا چاہتے ہیں تو اس کی مجال نہیں تھی کہ ملاقات سے انکار کی جرأت کرتا۔ اپنے تمام کام ادھورے چھوڑ کر وہ بابا صاحب کی قدم بوسی کو بھاگا چلا آتا تھا۔

⊙

بنّے بھائی کے ساتھ کار میں سوار جب عارف میاں یہاں پہنچے تو انہوں نے خاص طور سے اس امر کا اندازہ لگا لیا تھا کہ بابا صاحب کی سیکورٹی کے انتظامات کسی سربراہ مملکت سے کم ہرگز نہیں تھے حالانکہ یہ جال بڑی خوبصورتی سے بُنا گیا تھا۔

لیکن ـــــ

بھارتی انٹیلی جنس کے کیمپ میں محض ایک ہفتے کی تربیت نے اُسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ دونوں مکان کے مین گیٹ سے گزر کر اُس کمرے تک پہنچ گئے جسے ملاقاتیوں کا کمرہ کہا جاتا تھا۔

یہ کمرہ خواتین اور مردوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔

بنّے بھائی کو دیکھتے ہی قریباً سبھی ملاقاتی احتراماً کھڑے ہو گئے۔ بنّے بھائی اُن سب کی طرف مصنوعی مسکراہٹ اُچھالتے عارف میاں کا ہاتھ تھامے بغلی کمرے میں جا گھسے جہاں بابا صاحب کی سیکرٹری اور ایک خادم بیٹھے تھے۔

بنّے بھائی کی شکل پہ نظر پڑتے ہی سیکرٹری کے ہونٹوں پہ ترغیب آمیز مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے عارف میاں کی طرف دیکھ کر ہونٹوں کو ایک خاص انداز سے سکیڑا اور جسم کو جھٹکا دے کر سیدھی کھڑی ہو گئی تھی۔

"کیسا چل رہا ہے ـــــ؟" بنّے بھائی نے خاتون کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

"ایک دم شاندار بنّے بھائی ـــــ آپ کی دعا ہیں۔ بس ذرا خیال رکھا کیجیے ہمارا۔"

اُس نے اپنے جسم اور دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی ان سے تو مل لو ـــــ عارف میاں ہمارے خاص آدمی ہیں بڑے کام کے بندے ہیں۔ اگر کبھی اکیلے بھی آئیں تو ان کا کام فوراً ہو جانا چاہیے۔"

بنّے بھائی کے منہ سے جیسے ہی یہ بات نکلی خاتون نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"باندی کو رخسانہ کہتے ہیں۔ کبھی کوئی حکم ہو تو ضرور یاد فرمائیے گا ـــــ آپ اپنے نوجوانوں کی خدمت کر کے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے" ـــــ رخسانہ نے اُن کا ہاتھ کچھ ایسے انداز سے دبایا تھا کہ خواہ مخواہ عارف میاں جذباتی ہونے

لگے۔

"اچھا اب چھوڑو انہیں اور بابا صاحب کو مطلع کرو" —— بنّے بھائی نے اُسے مخاطب کیا۔

"جیسے آپ کی مرضی بنّے بھائی"۔

رخسانہ نے کہتے ہوئے انٹرکام پہ بابا صاحب کو بنّے بھائی اور عارف میاں کی آمد سے مطلع کیا۔

"بھیج دو" —— انٹرکام پہ جواب ملا۔

"جائیے جناب۔ بڑے خوش نصیب ہیں آپ۔ نام سنتے ہی بابا صاحب نے بُلا لیا" —— رخسانہ نے اس کی طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھا تھا۔

"شکریہ" —— عارف میاں نے بھی اس کی اُمید کے مطابق ہی جواب دیا تھا۔

دونوں مخصوص دروازے سے جس کمرے میں داخل ہوئے وہ بالکل معمولی سا کمرہ تھا۔ سامنے ایک کرسی پر بابا صاحب براجمان تھے اور دائیں بائیں کچھ اور پارٹی کے لوگ موجود تھے۔

بنّے بھائی کو دیکھ کر بابا صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی اور انہوں نے بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

بنّے بھائی کی تقلید میں عارف میاں نے بھی عقیدت سے اُن سے ہاتھ ملایا اور اُن کے گھٹنوں کو چھو کر بنّے بھائی کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔

"آپ لوگ اب چلیے" —— بابا صاحب نے وہاں موجود دوسرے لوگوں سے کہا۔

تمام لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور فرشی سلام کر کے اُلٹے قدموں کمرے سے باہر چلے گئے۔

"کیسے ہو بنّے بھائی —— یہ نوجوان وہی ہے" —— بابا صاحب نے دریافت کیا۔

"جی بابا صاحب! غلام ہے آپ کا —— آپ کا جانثار ہے۔ اس کو آپ کی خصوصی شفقت درکار ہو گی" —— بنّے بھائی نے سر جھکا کر کہا۔

"بھئی تمہاری بڑی تعریف کی ہے بنّے بھائی نے —— اور ہم ان کی کوئی بات ٹالا نہیں کرتے۔ بس اسی طرح جی جان سے کام کرتے رہو ساری زندگی عیش کرو گے" —— بابا صاحب نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جو حکم بابا صاحب" —— عارف میاں نے جواب دیا۔

"اسے فائیو نائن (۵۹) پہ لگا دو" —— بابا صاحب نے بنّے بھائی سے کہا۔

"ٹھیک ہے بابا صاحب۔ جو حکم" —— بنّے بھائی بولے۔

"دیکھو عزیزی! اب تم تنظیم کے انتہائی حلقے میں شامل ہونے جا رہے ہو۔ ایک بات کا خیال رکھنا کہ ہماری بقاء کا راز ہماری رازداری میں ہے —— اس تنظیم میں آنے کے بعد ہم سب کو سختی سے ایک نظم کا پابند ہونا پڑتا ہے —— جس نے بھی اس نظم سے نکلنے کی کوشش کی یا اس کے کسی اصول کو توڑا اُسے بہت ہی سخت سزا بھگتنا پڑتی ہے بسا اوقات جان سے ہاتھ بھی دھونے پڑتے ہیں کیونکہ ہم میں سے کسی ایک کی غلطی کا مطلب ہے اجتماعی موت۔ ہمیں یہ سودا قطعی منظور نہیں ہو گا۔ اگر تم میری جگہ پہ ہو تو تم بھی یہ نہیں چاہو گے کہ ایک کارکن کی غلطی سے ہم سب کی جانیں داؤ پہ لگ جائیں۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ اپنے اس ساتھی کو خودکشی کا موقع دیں —— اگر وہ خود ایسا نہ کرے تو ہم یہ کار خیر انجام دیتے ہیں۔ لیکن بھی ہمیں شہیدوں کی ضرورت رہتی ہے۔ جب ہم نے اپنا سب کچھ

تنظیم کے لیے قربان کرنے کا عہد کر لیا ہے اور اپنی جان بھی تنظیم کے نام کر
دی ہے تو پھر ہم ایک باعزت موت سے انکار کیوں کریں ——— ؟ مرنا تو ایک
سب نے ہے لیکن تنظیم کی فلاح کے لیے مارے جانے یا مر جانے والے کو عظیم
مقام دلاتے ہیں ——— میں تمہیں بھی نصیحت کروں گا کہ کسی کارکن کی غلطی کو اس
لیے بھی کبھی معاف نہ کرنا کہ اس کا نقصان ہم سب کو ہو گا۔ اس اکیلے کو نہیں۔
تم سمجھدار نوجوان ہو میری باتوں کا مطلب جان گئے ہو گے۔"

بابا صاحب نارمل لہجے میں بات کر رہے تھے۔

لیکن ———

ایک برقی لہر اس دوران عارف میاں کے جسم میں سنسناتی رہی۔ اسے
دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہم نے بہت دکھ اٹھانے کے بعد اپنے موجودہ نظریات پہ اتفاق کیا۔
تم نے دیکھا اس صوبے کی سیاست ہمارے اشاروں پر سیاست دانوں سمیت
کی طرح رقص کرتی ہے۔ تم نے دیکھا کہ مرکز سے حکمران ہماری قدم بوسی کے لیے
اس کٹیا میں آتے ہیں اور بالکل ایسے ہی بیٹھتے ہیں جیسے تم اور تمہارے بھائی بیٹھے
ہو ——— جانتے ہو اس کی کیا وجہ ہے ———

اس کی واحد وجہ ہے ہماری بے لچک پالیسی اپنے اور غیروں کے لیے
ہم کم از کم اس شہر میں اور پھر ملک بھر میں اپنے مخالفین کا وجود برداشت کرنے
کے لیے تیار نہیں۔ نہ اپنے اندر نہ اپنے باہر۔ جس نے ہمارے نظریات
انحراف کیا ہم اسے جہنم رسید کر دیتے ہیں۔ اور تم نے بھی یہی کام کرنا
ہائی کمان کے احکامات کی تعمیل کرتے رہو ساری دنیا کی عیاشیاں باندیوں
کی طرح تمہارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہوں گی ——— بس اب تم جاؤ۔ ا

کے لیے اتنا ہی کافی ہے"

یہ کہتے ہوئے بابا صاحب نے ہندو براہمنوں کی طرح ہاتھ کھڑا کر دیا۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ واپس لوٹ جائیں۔

فائیو نائن

عارف میاں کو اگر بنّے بھائی نہ بھی کہنا تو بھی ان کے لیے بابا صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن سے بات کرنا ممکن نہیں تھا۔

گہرے رنگ کے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی اُن کی آنکھوں سے نجانے کون سی برقی لہریں نکلتی تھیں جو سیدھی مخاطب کے دل و دماغ میں اُترتیں اور اسے زیر کرتی چلی جاتی تھیں۔

دونوں پہلے والوں کی طرح اُٹھ کر فرشی سلام کر کے اُسی طرح اُلٹے قدموں پہ چلتے اُسی کمرے میں پہنچ گئے جہاں رخسانہ اپنے ہونٹوں کی لپ اسٹک کو منہ پہ گہرا کیے ان کی واپسی کی منتظر تھی۔

"چائے حاضر ہے" ـــــ اُس نے بنّے بھائی کے بجائے براہِ راست عارف میاں کو مخاطب کیا۔

"بی لو میاں قسمت کے دھنی ہو جو پہلی ہی ملاقات میں رخسانہ کے ہاتھوں چائے پی رہے ہو۔ ہمیں دیکھو لو۔ جانے کب سے ان کے ہاتھوں کی بنی چائے پینے کو ترس رہے ہیں۔ چلو آج تمہارے بہانے ہم بھی سرخرو ہو جائیں" ـــــ بنّے بھائی نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بس جانے دیجئے بنّے بھائی! یونہی بناتے نہ رہا کیجئے۔ مجھ سے بہتر کون جانتا

ہوگا آپ کو اور آپ کی باتوں کو ـــــ باتیں بنانا تو کوئی بنّے بھائی سے سیکھے۔ کیا مجال جو گزشتہ دو ماہ سے کبھی کوئی خیر خبر لی ہو ـــــ بس دو موٹی سالڑھیاں کیا بھیج دیں کہ گلے شکوے شروع ہو گئے ـــــ رخسانہ نے عارف میاں پہ قریباً جھکتے ہوئے چائے بنا کر پیش کرتے ہوئے کہا۔

ایسے ہی للنے تلّے دکھا کر مینا کشی نے انہیں قابو کیا تھا اور یہی کچھ اب اس کے ساتھ رخسانہ کرنے جا رہی تھی۔

"ارے یہی تو بتانے آیا ہوں عارف میاں سے دوستی کر لو ان کا بھی آنا جانا اب لگا رہے گا۔ ادھر بھی اور اُدھر بھی" ـــــ بنّے بھائی نے آنکھ دبا کر کہا۔

"ٹھیک ہے ہمارا کون سا زور لگتا ہے" ـــــ کہتے ہوئے رخسانہ نے ایک مرتبہ پھر عارف میاں کا ہاتھ گرمجوشی سے دبا دیا۔

پندرہ بیس منٹ تک غیر سنجیدہ گفتگو کرنے کے بعد رخسانہ نے اپنی میز کا دروازہ کھولا اور ایک بند لفافہ عارف میاں کی طرف بڑھا دیا۔

"بابا صاحب کی طرف سے تحفہ ہے"

"لے لو" ـــــ بنّے میاں نے سنجیدگی سے کہا۔

عارف میاں نے لفافہ پکڑتے ہوئے "شکریہ" کہا اور سلام کر کے بنّے بھائی کے تعاقب میں باہر نکل آیا۔

ایک مرتبہ پھر وہ اُس پر ہجوم کمرے سے گزر رہے تھے جہاں اب تک تل دھرنے کو جگہ باقی نہیں بچی تھی۔

ایک مرتبہ پھر بنّے بھائی کو عورتوں مردوں نے چیخ چیخ کر سلام کرنا شروع کر دیا بنّے بھائی ان سے آنکھیں ملائے بغیر دانت نکالتے ہوئے عارف میاں کے ساتھ باہر نکل آئے اور تھوڑی دیر بعد وہ بنّے بھائی کے ٹھکانے کی طرف اُڑے

چلے جارہے تھے۔

"یہ ہے تمہارا نیا پاسپورٹ ویزے سمیت ـــــ تمہاری ڈیوٹی اب بابا
کے حکم سے ۵۹ پر لگا دی گئی ہے۔ ۵۹ کی اہمیت تمہیں معلوم ہے۔ اب تمہارا
تنظیم کے خاص لوگوں میں ہونے لگا ہے اور تمہیں "خاص کام" کرنے ہوں گے
کام سے فراغت پر تم بھارت یاترا کے لیے نکل جاؤ۔ باباصاحب کے حکم سے ا
ایسا بندوبست ہو جائے گا کہ تم اپنی محبوبہ کو مستقل یہیں لے آؤ۔ لیکن ایک با
کا خیال رکھنا کہ تنظیم سے متعلق معاملات میں ہم صرف ہاتھوں کا استعمال کرتے ہ
دل اور دماغ کا نہیں ـــــ جو حکم ملے گا اس کی تعمیل کرنی ہے بہر صورت۔
خواہ اس میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے ـــــ"

بڑے بھائی نے اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر پاسپورٹ اسے تھماتے ہوئے
یہ پاسپورٹ کسی دوسرے نام سے بنایا گیا اور نمبر دو تھا۔

"یہ جبار ہے" ـــــ بڑے بھائی نے اس دربان خاموشی سے اندر
کا تعارف کراتے ہوئے کہا ـــــ "آج سے تم اسے اپنا مستقل ساتھی سمجھو۔ تم
مل کر آپریشن پلان کیا کرو ـــــ ہمیں صرف اپنی ڈیمانڈ بتاؤ ـــــ جس علاقے
پولیس سٹیشن کو قابو کرنا ہے اس کا نام بتاؤ اور جس پولیس افسر سے شکایت
وہ بتاؤ۔ یہ کام ہم کیا کریں گے باقی کام تمہیں کرنا ہیں" ـــــ بڑے بھائی کی
میں ناچتی وحشت اب اُن کے منحوس چہرے پر بھی اُتر آئی تھی۔ اسے
اس نے ایک تصویر عارف میاں کی طرف بڑھائی۔

یہ تیس پینتیس سالہ ایک نوجوان کی تصویر تھی جس نے کسی سرکاری محکمے
وردی پہن رکھی تھی اور شکل و شباہت سے غیر مقامی لگتا تھا۔

"ٹھیک ہے بڑے بھائی" ـــــ کہتے ہوئے عارف میاں نے تصویر جبار کی طرف
بڑھا دی۔ "اسے ۵۹ پر پہنچانا ہے۔ اس کا دماغ درست کرنا ہے۔ ہم نے اس سالے
سے کہا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر اپنا تبادلہ کروا کر کسی دوسرے شہر چلا جائے
لیکن اس نے بجائے ہمارا حکم ماننے کے الٹا ہمارے ایک ورکر کو اندر کر دیا اور
اس کے ساتھیوں کو گالیاں دیں۔ مگر وہ جیتے جی ہماری بات مان لے تو ٹھیک ہے
ورنہ اس کی چھٹی کروا دینا۔"

بڑے بھائی نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بڑے بھائی" ـــــ عارف میاں نے بونگوں کی طرح گردن ہلا دی۔

"یہ ہے دوسری تصویر" ـــــ بڑے بھائی نے تصویر عارف میاں کی طرف بڑھائی۔
جبار کو علم ہے اس کا۔ یہ اس کی بہن ہے۔ سالے نے مائیگریٹ کر کے اسے داخلہ
بھی دلوا دیا ہے۔ عارف میاں اسے "مثالی کیس" بنا دو۔ آئندہ کوئی غیر مقامی ہمارے کسی
حکم کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہ کر سکے۔"

اپنی بات کے خاتمے پر بڑے بھائی نے بڑا ہولناک قہقہہ بلند کیا تھا۔ اس میں جبار نے
بھی اس کا پورا ساتھ دیا اور عارف میاں کو بادلِ نخواستہ اُن کا ساتھ دینا پڑا۔ وہ سب
وحشی ہو گئے تھے۔ انسانوں کی بجائے درندے دکھائی دے رہے تھے۔

"عارف میاں کو پہلے ۵۹ کی سیر کروا دو" ـــــ بڑے بھائی نے جبار سے کہا۔

"جو حکم جناب" ـــــ جبار نے سرِ تسلیم خم کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں کے ایڈریس اور رہنمہ ٹھکانے معلوم کر کے ۵۹ کی
طرف جارہے تھے۔

یہاں سے ۵۹ تفتیشی مرکز کا فاصلہ بمشکل تین چار میل تھا۔ ایک بلڈنگ کے
تہ خانے میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ بلڈنگ بطورِ خاص تعمیر کروائی گئی تھی جس کی اوپر کی

منزل میں تنظیم کے مسلح ونگ کے لوگ موجود رہتے تھے جنہیں "رضا کار" کہا جاتا تھا۔

ان ظالموں نے یہاں ابتدائی طبی امداد کی تین چار ویگنیں بھی جمع کر رکھی تھیں اور بظاہر یہ تاثر دیا گیا تھا کہ یہ تنظیم کا ابتدائی طبی امداد کا مرکز ہے جہاں مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

یہاں روزانہ درجنوں مریض لائے اور لے جائے جاتے تھے۔ ان میں کتنے بدنصیب تھے اور کتنے خوش نصیب۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔

مسیحائی کی آڑ میں یہاں درندگی کا جو ننگا ناچ ہو رہا تھا کسی کو اس کی خبر نہیں تھی۔ جبار نے عارف میاں کو سیدھا یہیں لے آیا تھا۔

"تنظیم کے طبی ونگ" نے ان کا استقبال کیا اور انہیں ۹ ڈی کے سربراہ کی حیثیت سے دورہ کروانے لگے۔ اوپر کی منزلوں میں تو واقعی دس پندرہ مریض زیر علاج تھے اور ایک آپریشن تھیٹر بھی موجود تھا۔ اب وہ عارف میاں کو لے کر تہہ خانے میں جا رہے تھے۔

○

تہہ خانے کی طرف جانے والی سیڑھیوں کو لوہے کی مضبوط سلاخوں والے دروازے سے بند کیا گیا تھا اور تاثر یہ دیا گیا تھا جیسے نیچے ادویات اور ضروری اشیاء کا اسٹور ہے۔

یہ تہہ خانہ چار کمروں پر مشتمل تھا۔

ایک کمرے میں تو ادویات اور دوسری ضروری چیزیں رکھی گئی تھیں جبکہ اس سے ملحقہ تینوں کمرے تفتیشی مرکز کہلاتے تھے۔ ان میں دو کمروں میں زیر تفتیش مجرموں کو رکھا جاتا تھا اور تیسرے کمرے میں ان پر تشدد کے پہاڑ توڑے جاتے تھے۔

اس مرکز کا نگران گزشتہ دنوں پولیس مقابلے میں اپنی غلطی سے مارا گیا تھا۔ اس نے ضرورت سے زیادہ شراب چڑھا رکھی تھی اور پولیس کو للکارنا شروع کر دیا تھا۔ جس کے بعد اب عارف میاں کو ہنگامی بنیاد پر یہاں کا چارج کچھ دنوں کے لیے دیا گیا تھا جس کے بعد کسی اور نے یہاں ڈیوٹی سنبھالنی تھی۔

یہاں کا اصول تھا کہ جس کا "کیس" ہوتا وہی اپنے کیس کا انچارج ہوتا تھا۔ اب جو کارنامہ عارف میاں انجام دینے جا رہے تھے اس کی تفتیش وہ اپنی نگرانی میں کرتے جس کے بعد انہوں نے منظر سے ہٹ جانا تھا۔

۹ ڈی پر تفتیش کے خصوصی آلات رکھے گئے تھے اس لیے تنظیم کی طرف سے عموماً یہاں کسی نہ کسی مجرم کو لا کر تفتیش کرنے کی فرمائش ہوتی رہتی تھی یہاں ایڈوانس بکنگ کروانی پڑتی تھی اور ہفتوں بعد باری آتی تھی ـــــ!!

اس وقت بھی یہاں ایک بدقسمت زیر تفتیش تھا۔

عارف میاں نے جو پہلا منظر دیکھا وہ اتنا کربناک تھا کہ انہیں اپنا دل مٹھی میں جکڑا محسوس ہوا۔

مغلوب کی ٹانگیں ایک کرسی پر بٹھا کر جکڑی ہوئی تھیں اور اس کے بازو اس کرسی کے بازوؤں پر بچھا کر اس طرح باندھے گئے تھے کہ اس کی جنبش کرنے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔

تنظیم کا ایک "رضا کار" جس نے ہلال احمر کے نشان والی وردی پہن رکھی تھی اس کے ہاتھوں میں ہتھوڑی کی مدد سے لوہے کے کیل ٹھونک رہا تھا ـــ!!

بے بس اور مقہور قیدی کی چیخوں سے آسمان کا کلیجہ شق ہو سکتا تھا، اگر اس کی آواز اس تہہ خانے کے ساؤنڈ پروف سسٹم سے باہر نکل سکتی جس کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

"ویل ڈن۔ ویل ڈن۔ شاباش۔ مارو سالے کو مارو ۔۔۔۔" جبار یہ منظر دیکھتے ہی جوشِ جنوں سے ناچنے لگا تھا۔

اس کے ساتھ آنے والے اس بے بس کی حالت دیکھ کر دیوانوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔

عارف میاں نے پہلے تو چپ سادھے رکھی پھر وہ بھی اس درندگی اور وحشت کے کھیل کا حصہ بن گئے۔

"سر! اس سالے کو آج رہائی مل جائے گی۔ بابا صاحب کا حکم ہے کہ یہاں کچھ گھڑیاں گزارنے والے کسی بھی ملزم یا مجرم کو یہاں سے رخصت کرنے سے پہلے کوئی نشان ضرور لگانا ہے جو اُسے زندگی بھر" وہ یاترا " کی یاد دلاتا رہے۔ اس کے ہاتھوں میں کیل گاڑ کر اسے آج رات تک ہم کسی گٹر کے نزدیک پھینکوا دیں گے۔ کل کے لیے بکنگ ہو چکی ہے۔ ہمیں کل ہی اپنا آپریشن مکمل کرنا ہوگا" ۔۔۔۔ جبار نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اُسے کہا۔

"ٹھیک ہے ۔۔۔ آداب چلیں" ۔۔۔۔ عارف میاں نے اسی میں بھلائی سمجھی کہ یہ ماحول سے نکل جانا مناسب جانا۔

لسانی تنظیم کے ہسپتال میں بیٹھ کر عارف میاں نے وہ تمام معلومات جمع کیا جو رضاکاروں نے مختلف ذرائع سے مہیا کی تھیں۔ دو گھنٹے کی عرق ریزی کے بعد عارف میاں نے آپریشن ترتیب دیا اور تنظیم کے دس نوجوانوں کو جنہیں اس کام کی خصوصی تربیت حاصل تھی اس مشن پر روانہ کر دیا۔

⊙

گل شیر کا تبادلہ تین ماہ پہلے اس علاقے میں ہوا تھا ۔۔۔۔!

اس کا تعلق خفیہ ایجنسی سے تھا جہاں وہ انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ گل شیر

کے زیادہ رشتہ دار اس شہر میں رہتے تھے اور وہ بھی اکثر یہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ اس کی خواہش شروع سے ہی رہی تھی کہ اس شہر میں آباد ہو جائے کیونکہ اس کے گاؤں کے مقابلے میں اس جیسا بڑا اور رنگا رنگ دلچسپیوں کا حامل شہر بہر حال زیادہ توجہ طلب تھا۔ شاید وہ بہت کچھ نظر انداز کر دیتا۔

لیکن ۔۔۔۔

اس کے ننھیال کے زیادہ رشتہ دار یہیں رہتے تھے اور دو تین مرتبہ یہاں آنے کے بعد اس کی کچھ زیادہ ہی خواہش اس شہر میں رہنے کی ہو گئی تھی۔ اُس نے ذہنی طور پر شادی کے بعد کراچی ہی کو مسکن بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

شیر گل کے کندھوں پر بوڑھی ماں اور بہن کا بوجھ تھا وہ دونوں کو اپنے ساتھ کراچی لے آیا تھا اور اپنے رشتہ داروں کے نزدیک ہی اُنہیں ایک کرائے کا مکان بھی مل گیا تھا۔ شیر گل نے اپنی انتہائی کوشش سے بہن کا مائیگریشن بھی مقامی کالج میں کروا لیا تھا اور اب قدرے مطمئن ہو کر یہاں زندگی بسر کر رہا تھا۔

ہفتے میں دو تین مرتبہ اس کی ملاقات اپنی منگیتر سے بھی ہو جاتی تھی اس سے زیادہ کی خواہش اُس نے زندگی میں کبھی نہیں کی تھی۔

لیکن ۔۔۔۔

اپنی ماں کی طرف سے وہ پریشان ضرور تھا جس نے نہ صرف اس شہر میں آنے کی مخالفت ابھی تک جاری رکھی تھی بلکہ یہاں آنے کے بعد بیمار بھی رہنے لگی تھی۔ شاید اس نے اپنے بیٹے کے اس فیصلے کو ابھی تک دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اور محض اس کی خوشنودی کے لیے یہاں چلی آئی تھی۔

کراچی میں آنے کے بعد سے اُس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن شیر گل

اور اس کی بہن محسوس کرتے تھے کہ ماں خوش نہیں ہے۔ اُن کے والد تو ...
جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ تب دونوں ابھی سکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے لیکن ماں نے کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی خصوصاً ماں کے رشتہ داروں نے انہیں باپ کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا اور اب کراچی میں بھی وہی لوگ انہیں سنبھالے ہوئے تھے ۔

اس روز بھی شیر گل نے معمول کے مطابق بہن کو موٹر سائیکل پر یونیورسٹی پر ڈراپ کیا اور خود اپنے آفس کی طرف جا رہا تھا جب راستے میں ایک منظر نے اچانک اس کو جکڑ لیا ۔

اس کے آفس کے نزدیک ایک سفید رنگ کی کار میں سوار نوجوانوں نے اچانک کار کھڑی کی اور سامنے موجود مارکیٹ پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی ۔ فائرنگ کرتے ہوئے دونوں نوجوان کار سے باہر نکل آئے اور اس مارکیٹ کے دکانداروں کو گالیاں دینے لگے ۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ یہاں موجود پولیس کی ایک گشتی کار انہیں فائرنگ کرتے دیکھ کر دوسری طرف مڑ گئی تھی اور عوام میں تو ایسی بھگدڑ مچی کہ کسی کو اس طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کار سواروں کی فائرنگ سے دکانوں کے شیشے شوکیس تباہ ہو رہے تھے اور یہاں موجود گاہک اور دکاندار اپنی جانیں بچانے کے لیے کونوں کھدروں میں چھپتے پھرتے تھے ۔

عین اُن لمحات میں جب شیر گل کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک ہمکار کو موٹر سائیکل پر اس طرف آتے دیکھا۔ چونکہ ان کا آفس یہاں سے نزدیک ہی تھا اور وہ بھی شاید دفتر ہی جا رہا تھا۔

”صغیر! رکو“ ـــ اس نے محفوظ راستے سے گزرتے اپنے ساتھی کو آواز

کر روکا ۔

انسپکٹر صغیر نے موٹر سائیکل کو بریک ضرور لگائے لیکن انجن بند نہیں کیا۔

”چلو بیٹھو تم یہاں کیسے ـــ؟“ صغیر نے شیر گل کی بات سننے کی بجائے اُسے اپنے پیچھے بیٹھ کر بھاگنے کی تلقین کی۔

اس نے یہی سمجھا کہ شیر گل شاید پیدل اس طرف آیا ہے اور اس نے مدد کے لیے اُسے روکا ہے کیونکہ شیر گل کی موٹر سائیکل یہاں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا ۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ۔ ہمارے سامنے لا اینڈ آرڈر کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں اور تم .....“ شیر گل کو اُس کی بات سے اُلجھن ہو رہی تھی ۔

”یار تمہیں آفس جا کر سمجھا دوں گا۔ خدا کے لیے زیادہ بحث نہ کرو اور وقت ضائع نہ کرو۔ اس فائرنگ کا رُخ ہماری طرف بھی ہو سکتا ہے“ ـــ صغیر نے اُسے سمجھانا چاہا ۔

سفید کار اُن سے چند گز کے فاصلے پر کھڑی تھی جب اُنھوں نے ایک نوجوان کو باہر نکلتے دیکھا۔ شیر گل نے اُسے پہچان لیا یہ مقامی کونسلر تھا جو لسانی تنظیم کا اعلیٰ عہدیدار بھی تھا۔

”ارے یہ تو کمال الدین ہے“ ـــ شیر گل نے اُس کی طرف اشارہ کر کے صغیر کو بتایا۔

”یار جو بھی ہے جہنم میں جائے تم آتے ہو یا میں نکلوں“ ـــ صغیر نے کمال الدین کو پہچان ضرور لیا تھا لیکن خواہ مخواہ بیزاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”صغیر ہمارے پاس دو ریوالور ہیں اور ہم ان لوگوں کو قابو کر سکتے ہیں“ ـــ کہتے ہوئے اس نے ریوالور نکال لیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ تربیت یافتہ دہشت گرد ہیں اور آٹومیٹک ہتھیاروں سے لیس ـــــ بے وقوف نہ بنو۔ جان سے جاؤ گے اور کوئی تمہارا مول نہیں پڑے گا" ــــــ صغیر نے ابھی تک انجن بند نہیں کیا تھا۔

"آؤ میرے ساتھ ـــــ"

شیر گل نے اتنا کہہ کر چاہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر موٹر سائیکل کا انجن بند کر دے۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہو رہا ہے۔ مجھے کتے کی موت نہیں مرنا" ــــ کہتے ہوئے صغیر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور موٹر سائیکل اُڑا دی۔

"بزدل۔ بے غیرت کہیں کا ـــــ"

شیر گل بُڑبڑایا اور اپنی دانست میں ریوالور نکال کر مارکیٹ کی طرف بھاگا کیونکہ اس نے ایک حملہ آور کو ایک دکاندار پر گولی چلاتے ہوئے دیکھ لیا تھا جو موقع پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

یہ منظر اس کے لیے ناقابل برداشت تھا کہ قانون کے ایک محافظ کی نظروں کے سامنے ایک بے گناہ شہری اس طرح بے موت مارا جائے۔ اس نے صغیر کی وارننگ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی جان پر کھیل جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ریوالور ہاتھ میں پکڑے وہ ایک محفوظ آڑ لیتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا جب اچانک فضا سائرن کی آواز سے گونج اٹھی، شاید پولیس کی کوئی پارٹی اس اطمینان کے ساتھ کہ مجرم اپنا کام کر کے جا چکے ہوں گے "کارروائی" ڈالنے کے لیے اس طرف آ رہی تھی۔ یہ حملہ آوروں کے لیے وارننگ بھی تھی کہ انہوں نے "طے شدہ سے زیادہ وقت" لے لیا ہے اور اب وہ تیزی سے بھاگنے کی فکر میں تھے۔

دونوں حملہ آور جنہوں نے مارکیٹ پر فائرنگ کی تھی کار کی طرف بھاگے۔ ان میں ایک بالکل اس راستے پر آ رہا تھا جدھر سے شیر گل اس پر حملہ آور ہونے جا

رہا تھا۔ جیسے ہی شیر گل آڑ سے نکلا دہشت گرد اچانک ہی اُن کے سامنے آ گیا۔

"خبردار۔ رُک جاؤ" ــــ شیر گل نے اُسے للکارا۔

دہشت گرد کے لیے یہ بالکل انوکھی بات تھی کہ اس شہر کے کسی مکین کی اتنی ہمت ہے جو اسے للکار سکے۔

"ابے تیری تو ....." اس نے شیر گل کو گالی دے کر اس کی طرف گن سیدھی کی۔ ایک لمحے کے لیے اگر وہ چوک جاتا تو درجنوں گولیاں شیر گل کے جسم سے پار ہو جاتیں۔ اس نے اپنا ریوالور سیدھا کیا اور حملہ آور کے اس ہاتھ کا نشانہ بنایا جس میں اس نے کلاشنکوف تھام رکھی تھی۔

گن اس کے بازو سے نکل کر دُور جا گری اور وہ خود چیختا چلاتا اپنے خون آلود ہاتھ کے ساتھ وہیں گر پڑا۔

کار سواروں اور شیر گل کے درمیان سڑک کے درمیان موجود وہ چھوٹی سی دیوار حائل تھی جو سڑک کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ابھی تک انہیں شاید اپنے ساتھی پر گزرنے والی قیامت کا علم نہیں ہوا تھا۔ جب اچانک گولی چلنے کی آواز نے انہیں صورت حال کی سنگینی کا احساس دلایا۔

انہوں نے بجلی کی سی تیزی سے کار گھمائی اور کار کی کھڑکیوں سے جھانکتی دو کلاشنکوفوں سے شیر گل پر اندھا دھند گولیاں برسانے لگے۔

ایک ریوالور سے ان لوگوں کے سامنے ڈٹ جانا خودکشی کے مترادف تھا اور شیر گل خودکشی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی تربیت کو بروئے کار لاتے ہوئے وہاں موجود ٹریفک کی آڑ لے کر بھاگنا شروع کر دیا۔

بھاگتے ہوئے انسپکٹر شیر گل پر کمال الدین فائرنگ کر رہا تھا۔ شیر گل نے اُسے اچھی طرح پہچان لیا تھا اور دوسری طرف نظر آنے پر وہ اس کے ساتھیوں کی

شناخت بھی کر سکتا تھا۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے اِن لوگوں نے مغلظات بکتے اپنے ساتھی کو سفید کار میں ڈالا اور اپنی راہ لی۔ اُن کی دیدہ دلیری کا یہ عالم تھا کہ اُن کے کسی ایکشن سے گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

شیر گُل بے بسی کے عالم میں تماشہ دیکھتا رہا پھر وہ بھی چُپ چاپ اپنی موٹر سائیکل تک پہنچا اور دفتر کی راہ لی۔

○

آفس پہنچ کر وہ سیدھا اپنے اعلیٰ افسر کے کمرے میں گیا اور وہاں پیش آنے والے واقعات من و عن بیان کر دیئے۔ شیر گُل نے اپنے افسر اعلیٰ کو بتایا کہ حملہ آوروں کے اِس گروپ کی کمان مقامی کونسلر اور لسانی تنظیم کا سرگرم عہدیدار کمال الدین کر رہا تھا اور اس مارکیٹ کو لسانی تنظیم کے لیے چندے کے نام پر مانگنے والا غنڈہ ٹیکس نہ دینے کی سزا ملی ہے کیونکہ اتنی بڑی رقم فراہم کرنا ان لوگوں کے لیے ممکن نہیں تھا۔

شیر گُل نے صغیر کی بُزدلی اور فرائض سے غفلت کے خلاف بھی کُھل کر بیان دیا تھا اور افسر اعلیٰ نے صغیر کو اس کے سامنے ہی طلب کر لیا تھا۔ افسر اعلیٰ نے شیر گُل کے الزامات دہراتے ہوئے صغیر سے جواب طلب کیا تو شیر گُل حیرت اور غصے سے اس جواب پر تلملا کر رہ گیا۔

صغیر نے سرے سے کسی ایسے واقعہ کا عینی شاہد ہونے سے انکار کرتے ہوئے یہ بات ماننے سے بھی انکار کر دیا کہ صبح آفس آتے ہوئے اس کی ملاقات شیر گُل سے ہوئی تھی۔

شیر گُل کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کی بوٹیاں نوچ لے۔

"تم اتنے گر سکتے ہو اس بات کا اندازہ میں نے نہیں کیا تھا" ـــ اُس نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شیر گُل اپنے لہجے پر قابو رکھو اور زبان پر بھی۔ تم مجھ سے سینئر نہیں ہو" صغیر نے اس کو جواباً ڈانٹ کر اس کا غصہ آسمان پر پہنچا دیا۔

"فی الحال آپ دونوں صاحبان باہر تشریف لے جائیں اور افسرانِ بالا کے سامنے گفتگو کے آداب سیکھنے کے بعد ہی میرے کمرے میں آئیں" ـــ افسر اعلیٰ نے دونوں کو کمرے سے باہر نکال دیا۔

شیر گُل کو سمجھ آ گئی کہ صغیر کیوں جھوٹ بول رہا ہے؟ وہ مقامی تھا اور لسانی تنظیم سے دہشت زدہ۔ اُس نے شاید کسی ساتھی کے انجام سے نصیحت حاصل کی ہو گی جبکہ شیر گُل ایسے تجربے سے نہیں گزرا تھا یوں بھی ایک مخصوص ماحول میں پیدائش اور پرداخت نے اس میں دلیری ضرورت سے زیادہ ہی پیدا کر دی تھی۔

اُس نے کسی نہ کسی طرح اپنے غصے پر قابو پایا اور موٹر سائیکل لے کر اس مارکیٹ کی طرف چل دیا جہاں یہ واقعہ ہوا تھا۔ پولیس اور پریس کے لوگ یہاں جوق در جوق جمع تھے اور اپنی اپنی "کارروائی" ڈال رہے تھے۔ شیر گُل کا جی تو یہی چاہا کہ پولیس انچارج کا ٹینٹوا دبا دے جو سفید کار دیکھتے ہی دُم دبا کر ساتھیوں سمیت بھاگ گیا تھا۔

لیکن.....

وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا ـــ!!

مارکیٹ کے خوفزدہ دکانداروں نے شیر گُل کو روتے ہوئے بتایا کہ لسانی تنظیم والوں کی ناجائز فرمائشوں نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا ہے وہ لوگ ہر ماہ تنظیم کے لیے چندے کے نام پر ایک خطیر رقم کا تقاضا کرتے ہیں اور گزشتہ دس ماہ سے مارکیٹ کے دکاندار جیسے تیسے اُن کے تقاضے پورے کر رہے ہیں جبکہ اب معاملہ اُن کے بس

سے باہر ہو گیا ہے۔

شیر دل کے لیے چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ یہ لوگ جس ظلم کا رونا اُس کے سامنے رو رہے تھے اُس کا اظہار پولیس کے سامنے نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے پولیس کے سامنے مجرموں کی نشاندہی سے مکمل معذوری ظاہر کر دی تھی اور پولیس نے حسبِ روایت "نامعلوم حملہ آوروں" کے خلاف رپٹ درج کر لی تھی۔

○

اس صورتِ حال نے شیر گل کا پارہ آسمان پر چڑھا دیا۔ اس نے اپنی قومی غیرت کے ہاتھوں بے بس ہو کر نزدیکی تھانے میں اپنی طرف سے حملہ آوروں کے خلاف رپٹ درج کروا دی جس میں کمال الدین کو ملزم نامزد کر دیا۔

پولیس والوں نے پہلے تو بہت زور لگایا کہ شیر گل کا دماغ ٹھیک ہو جائے لیکن اس نے بھی جیسے یہ ضد بنالی تھی اور اپنے اعلیٰ افسران کے سمجھانے کے باوجود اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

اُس روز وہ گھر کی طرف جا رہا تھا جب گھر کو مڑنے والے رستے پر دو کاروں نے اچانک اُسے روک کر بریک لگانے پر مجبور کر دیا۔

"کیا بات ہے کیا بدتمیزی ہے؟"

شیر گل یہی سمجھ رہا تھا جیسے یہ آوارہ سے لڑکے ہیں اور اُسے شرارتاً تنگ کر رہے ہیں، لیکن اچانک ہی تین کلاشنکوفیں اُس طرف سیدھی ہو گئیں۔

"ایک ہفتے کے اندر اندر اس شہر سے نکل جاؤ۔ اس صوبے کے کسی شہر میں اگر تم دکھائی دیے تو تمہارے ساتھ وہ سلوک ہوگا۔ جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تم کتے کی موت مر جاؤ گے اور کوئی تمہارا پُرسانِ حال نہیں ہوگا ____ سمجھے تم....؟"

اُن میں سے ایک نے جو اُن کا لیڈر دکھائی دے رہا تھا شیر گل کو دانت پیستے

ہوئے کہا۔

شیر گل ایک لمحے کے لیے بھی نہیں گھبرایا تھا۔

اُس نے سوچا وہ کوئی چور ڈاکو نہیں۔ قانون کا رکھوالا ہے اور ان غنڈوں کی یہ مجال کہ اُلٹا اُسے دھمکیاں بھی دینے لگے ہیں لیکن اُس نے مصلحتاً خاموشی اختیار کیے رکھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُن کو اشتعال دلا کر بے موت مارا جائے کیونکہ ان سب کے چہروں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اگر وہ اُن کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی کہتا تو وہ اُسے مار ڈالتے۔

وہ خاموشی سے اُن سب کو گھورتا اور اپنا غصہ ضبط کیے کھڑا رہا۔

"سمجھے تم ____!" اُن میں سے ایک نے اُس کا گریبان جھٹکا اور اُسے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

"ناؤ گیٹ لاسٹ" ____ دوسرے نے اُسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ شیر گل منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔

دونوں کاریں جس طرح آئی تھیں اسی طرح واپس چلی گئیں۔

شیر گل نے اگلے روز نزدیکی تھانے میں ایک اور رپٹ درج کروا دی جس میں لسانی تنظیم پر الزام لگایا کہ وہ لوگ اُسے جان سے مار دینا چاہتے ہیں۔ رپورٹ درج کروانے کے اگلے ہی روز اُسے اُس کے محکمے کے افسرِ اعلیٰ نے طلب کر لیا۔

"مذاق بنا کر رکھ دیا ہے تم نے ڈیپارٹمنٹ کو ____ ڈوب مرنے کا مقام ہے کیا تم دوسری ایجنسیوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ ہم بے بس، گدھے اور اُلو کے پٹھے ہیں کہ جس کا جی چاہے ہمیں رستے میں روک کر گالیاں اور دھمکیاں دے کر چلتا بنے۔ شیر گل اپنا نہیں تو ایجنسی کی عزت کا خیال کرو۔ بہت نام ہے ہمارا بہت محنت سے ہمیں یہ مقام ملا ہے۔ آخر تم نے خود کو اتنا بے بس کب سے

سمجھ لیا۔ ہمارے پاس کسی شے کی کمی نہیں ـــــ تم ....." غصے سے انہوں نے
بات ادھوری چھوڑ کر ہونٹ کاٹنے شروع کر دیئے۔

"میں نے کوئی غلطی نہیں کی سر! میں نے ڈیپارٹمنٹ کا وقار داؤ پر نہیں لگایا۔
مجھے ایجنسی اور حکومت پر اعتماد ہے۔ میں نے صرف قانونی کارروائی کی ہے اور
نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف جن کا تعلق لسانی تنظیم سے تھا رپورٹ درج کرائی
ہے تاکہ اگر وہ لوگ اپنی دھمکی پر عمل کر گزریں تو کم از کم آپ کو ملزم تلاش کرنے
میں آسانی رہے" ـــــ شیر گل نے ٹھنڈے دماغ سے کہا۔

"شیر گل اگر تم اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو یہ پیشہ چھوڑ کر کہیں دکان کھول
کر بیٹھ جاؤ۔ ناؤ گیٹ آؤٹ" ـــــ افسرِ اعلیٰ کا بلڈ پریشر بڑھنے لگا تھا۔

شیر گل چپ چاپ باہر آ گیا۔

اُس نے آٹھ روز تک اس واقعے پر اپنے کسی ساتھی سے بات نہیں کی
اپنے معمول کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اس درمیان اُسے کسی نے کچھ نہیں کہا
شیر گل نے یہی جانا کہ اُن لوگوں نے محض دھمکی دی تھی۔ وہ خود بھی جانتے
تھے کہ اتنی بڑی اور طاقتور خفیہ ایجنسی کے افسر کو اس طرح اغوا کرنا یا
دھمکیاں دینا بچوں کا کھیل نہیں۔

عفت مآب

نجمہ کو اُس نے معمول کے مطابق اُس کے کالج کے سامنے اُتارا اور اپنی راہ
لی۔ وہ اپنی بہن کو جاتے ہوئے خود اتارتا تھا جبکہ واپسی کا سفر وہ اپنی سہیلیوں کے
ساتھ کرتی تھی جو اس کے محلے میں رہتی تھیں اور وہ اکٹھے ہی بس پہ گھر آ جایا
کرتے تھے۔

بس سٹاپ کالج کے نزدیک ہی تھا بس ایک سڑک پار کرنی پڑتی تھی اور
وہ اطمینان سے اپنے گھر پہنچ جایا کرتے تھے۔

آج لسانی تنظیم کی دھمکی کو گیارہواں دن ہو رہا تھا گو کہ شیر گل نے اس
درمیان کبھی بھی کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔ اُسے خود پہ اعتماد تھا اور وہ
جانتا تھا کہ ان لوگوں نے ان کے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔ وہ تین سے وہ
قابو آنے والا نہیں تھا ـــ!!

لیکن ـــــ

آج جب اپنی اکلوتی بہن کو یہاں اتار کر وہ معمول کے مطابق واپس مڑا تو
نجانے کیوں اس کا دل دھک سے رہ گیا ـــــ!!

اُسے یوں لگا جیسے کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے ـــــ اُس کی چھٹی
حس نے جیسے جھنجھوڑ کر گہری نیند سے بیدار کر دیا تھا۔

موٹر سائیکل کے ہینڈل پر جسے اس کے ہاتھ کی ہتھیلی اُسے پسینے میں بھیگتی محسوس ہو رہی تھی۔

چند لمحے کے لیے وہ رُک گیا ——— اُس نے چاہا کہ نجمہ کو آج کالج نہ جانے دے اور آواز دے کر واپس بُلا لے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کی غیرت اور انا کے خلاف ہوتا۔ یوں بھی اب تک نجمہ کالج کے دروازے پر پہنچ چکی تھی۔

آج پہلی مرتبہ اس نے اپنی بہن کو کالج سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا وہ رُکا کھڑا رہا اور تب تک دیکھتا رہا جب تک کہ وہ دروازے سے اندر نہیں چلی گئی۔

"یا الٰہی رحم کرنا" ——— اس کے دل سے دُعا نکلی۔

اس نے سوچا کہ واپسی پر اُسے خود لے جائے گا اُسے اندازہ تھا کہ نجمہ کو ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان چھٹی ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر وہ تھوڑا سا مطمئن ہو گیا تھا لیکن تھانے پہنچنے کے بعد بھی اُسے ایک لمحے کے لیے قرار نہیں آ رہا تھا۔ اُس کا دل ہاتھوں سے نکلا جاتا تھا ایک بے نام سی گھبراہٹ، یاسیت اور کچھ ہو جانے کے خوف نے اس کو بے کل کیے رکھا۔

بارہ بجے کے نزدیک اُسے اچانک ایک ایمرجنسی حکم موصول ہو گیا۔ ان لوگوں نے یہاں سے پندرہ بیس میل دُور ایک خفیہ اڈے پر چھاپہ مار کر ایک خطرناک دہشت گرد کو گرفتار کرنا تھا۔

حکم کی تعمیل سے انکار کا مطلب سرکاری قوانین کے مطابق بغاوت تھا جس کی کم از کم سزا ملازمت سے برطرفی ہوتی یوں بھی آج کل اس کے اپنے افسرِ اعلیٰ سے لسانی تنظیم کے حوالے سے کوئی خوشگوار تعلقات نہیں چل رہے تھے۔ وہ بھی خود کو بزدل یا کام چور ظاہر کر کے اپنی "اے سی آر" (خفیہ محکماتی رپورٹ) خراب

کروانا نہیں چاہتا تھا۔

نجمہ کو سپردِ خدا کر کے وہ مہم پر روانہ ہو گیا۔

O

نجمہ حسبِ معمول چھٹی پر اپنی سہیلی کے ساتھ کالج سے باہر آ رہی تھی۔ کالج کی دیواریں لسانی تنظیم کے طلبا ونگ کے نعروں اور جھنڈوں سے اَٹی پڑی تھیں اور طالبات کی زیادہ تعداد نے تنظیم کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے اپنے سینوں پر سجا رکھے تھے کچھ لیڈر قسم کی طالبات نے تو تنظیم کے جھنڈے والے لباس بھی پہن رکھے تھے۔

لیکن ———

نجمہ اور اس کی سہیلی عارفہ ان سب باتوں سے بے نیاز مطمئن اپنے گھر کو جا رہی تھیں۔ انہیں اُن کے والدین نے یہی بتایا تھا کہ کالج میں انہیں صرف تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل کیا گیا ہے۔ اگر "غیر نصابی اور صحت مند سرگرمیوں" کا مطلب سیاست میں حصہ لینا اور توڑ پھوڑ کرنا ہی تھا تو وہ اپنی اولاد کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔

نجمہ اور عارفہ معمول کے مطابق سر جھکائے چپ چاپ بس سٹاپ کی طرف جا رہی تھیں جب اچانک ایک جیپ ان کے نزدیک آ کر رُکی اور اُس میں سے لسانی تنظیم کے تین مسلح غنڈے کود کر باہر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے کلاشنکوف اور باقی دونوں نے پستول پکڑ رکھے تھے۔

ایک پستول بردار غنڈے نے نجمہ کا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔ عارفہ نے پہلی ہی نظر میں اُسے پہچان لیا تھا یہ لسانی تنظیم کے طلبا ونگ کا سرکردہ لیڈر ذاکر تھا جس کے متعلق یہ بات عام طور پر کہی جاتی تھی کہ وہ "باباصاحب" کی خصوصی

شفقت حاصل ہے۔

ذاکر تنظیم کا بگڑا ہوا غنڈہ تھا۔ "بابا صاحب" کا خاص آدمی ہونے کے سبب اس شہر میں کسی سرکاری یا غیر سرکاری افسر کی جرأت نہیں تھی کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔۔!!

عارفہ اس قدر دہشت زدہ تھی کہ خوف کے مارے اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

"بھاگ جا سالی! خبردار جو اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نکالا۔ ورنہ۔۔۔۔!"

غنڈے نے اس کی چٹیا پکڑ کر اس کے سر کو اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ اُسے گردن ٹوٹتی محسوس ہوئی۔

"بھاگ جا۔۔۔۔" اس غنڈے نے اُسے زور کا جھٹکا دے کر آگے کی طرف دھکیلا۔ عارفہ منہ کے بل زمین پر گری۔

خوف اور سر میں ہونے والے شدید درد کی وجہ سے اپنا وجود بے جان ہوتا تھا لیکن زندہ رہنے کی خواہش نے اُسے جیسے تیسے اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اپنی کتابیں وہیں چھوڑ کر دیوانہ وار چیختی چلاتی جس طرف منہ تھا اسی طرف بھاگنے لگی۔۔۔۔

نجمہ یوں تو عام سی لڑکی لیکن شبیر گُل خان کی بہن بھی تھی۔ اس نے ایک لمحے میں صورتِ حال کی نزاکت کا احساس کر لیا تھا۔

اگر یہ لوگ اُسے اغوا کرنے آئے تھے تو اغوا کر لے کے بعد باعزت زندگی اُسے کبھی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس بات کا علم ہوگا کہ نجمہ کا تعلق کسی امیر گھرانے سے نہیں کہ اُسے اغوا کرنے کے بعد تاوان میں خطیر رقم ہاتھ آجائے۔

پھر اس کے اغوا کا مقصد کیا تھا؟

اگلے ہی لمحے اُسے اس سوال کا جواب مل گیا کہ یہ کوئی انتقام ہو سکتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بھائی جس ایجنسی میں کام کرتا ہے اُس کے ہاتھوں لسانی تنظیم کو کتنی زک اُٹھانی پڑتی ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ اُس کے بھائی کے کیے جرم کی سزا اُسے دینا چاہتے تھے۔

اغوا کے بعد اُس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟

اس تصور نے اُس کے رگ و پے میں آگ بھر دی۔ وہ آبرو باختہ ہو کر زندہ رہنے کی بجائے آبرومندانہ طریقے سے مر جانا بہتر سمجھتی تھی۔ یہی اُس کی خاندانی روایت تھی۔ اگر وہ ان بھیڑیوں کے ہاتھوں اپنی عزت لٹا کر زندہ بھی رہ جاتی تو بھی اُسے زندہ درگور ہونا تھا۔ پھر کیوں نہ وہ اپنی روایت نبھائے۔

اس کے لیے بندوق پستول کوئی ایسی انوکھی شئے نہیں تھی۔ اس کا بچپن اور لڑکپن انہی کھلونوں سے کھیلتے گزرا تھا۔

دوسرے ہی لمحے نجمہ نے اپنے بازو کو زور سے جھٹکا دیا۔

غنڈے کے لیے اس کا ردِ عمل بالکل غیر متوقع تھا۔ اُن کا واسطہ آج تک عارفہ جیسی بے بس اور بے کس لڑکیوں سے رہا تھا۔ جن کی آدھی جان انہیں دیکھ کر نکل جایا کرتی تھی اور وہ اس خوف سے بھی ہتھیار ڈال دیا کرتی تھیں کہ کہیں ان کی "گستاخی" اور "حکم عدولی" کی سزا اُن کے والدین کو نہ بھگتنی پڑے۔

نجمہ نے چاہا کہ بھاگ جائے لیکن اچانک ہی ذاکر نے اس کے پیٹ میں زور دار لات ماری اور نجمہ تلملا کر بالکل اُس غنڈے پر گری جو اپنے ساتھی کی مدد کے لیے اس کی طرف لپکا تھا۔

نجمہ کے اچانک ٹکرانے سے پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا
کے بالکل نزدیک ــــــــ !!

زمین پر گری نجمہ نے ہاتھ بڑھا کر پستول پکڑا اور قہر کی دیوی کی طرح
اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اِس سے پہلے کہ لسانی تنظیم کے غنڈے سنبھلیں اُس نے پستول
سیدھا کیا اور دیوانہ وار اُس کی لبلبی دباتی چلی گئی

بپھری ہوئی شیرنی کے ہاتھ میں پستول کے شعلوں نے سب سے پہلے اُس
غنڈے کو چاٹا جو ذاکر بھائی کا خصوصی باڈی گارڈ اور ہر بُرے کام میں دست راست
تھا۔

اُسے زمین پر گرتے دیکھ کر ذاکر نے اپنی گن سیدھی کی اور عالمِ وحشت
میں کلاشنکوف کا پورا برسٹ عفت مآب مسلم زادی کے مقدس بدن میں اُتار دیا
ساری گولیاں سامنے کی سمت سے اُس کو لگی تھیں۔

کیا مجال جو زمین پر گرتے ہوئے بھی اُس کا دوپٹہ اُس کے سر سے کھسکا ہو
نجمہ کو ایک سانس کی بھی مہلت نہیں ملی تھی جب جنت کے سارے دروازے اُس کے لئے
کُھل گئے۔

خون اس کے جسم سے فوارے کی طرح اُچھلا اور پتھریلی زمین پر بہنے لگا
کے زمین بوس ہوتے ہی ساحلی شہر کی تیز ہوا نے اپنا رُخ ذرا بدلا وہ چادر
اُس کے دوپٹے کو لپیٹے ہوئے تھی اور پھسل کر نیچے گر پڑی تھی ہوا کے تیز جھونکے
سے اِس طرح اُڑ کر اُس کے بدن پر گری کہ اُس کا سارا ستر ڈھانپ لیا۔

شاید قدرت نے جنت کی اس حور کا چہرہ مکروہ اور منافق لوگوں کو دکھانے
کا سامان کر دیا تھا۔ سفید چادر اس کے بدن سے اُبلتے خون میں ڈوب کر
اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔

بے ہوش ہوتی عارفہ نے آخری منظر یہی دیکھا کہ ذاکر نے کلاشنکوف کا پورا
برسٹ نجمہ کے سینے میں اُتارا ہے اور وہ اپنے اوسان کھو بیٹھی۔ سڑک کنارے لگے
لوہے کے جنگلے کو تھام کر اُس نے سنبھلنا چاہا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کی
گردن جنگلے پر لوٹ گئی۔ اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔

عروس البلاد کے سینکڑوں شہریوں نے غیرت کا یہ جرأت مندانہ کھیل بڑی
بے غیرتی سے دیکھا اور خوفزدہ بھیڑوں کی طرح کونوں کھدروں میں چھپ کر اپنی
دانست میں خود کو محفوظ کرنے لگے۔

شاید کسی عقلمند نے اپنے حواس قابو رکھے تھے اور فون پر اس خونی ڈرامے
کی اطلاع ہنگامی پولیس کو دے دی تھی جو شاید پہلے سے "سیٹ ٹائمنگ" کے
مطابق وہاں پہنچ رہی تھی۔

ذاکر نے اس احساس کے بعد کہ اُس کا شکار زندہ اُن کے ہاتھ نہیں لگا۔
احساسِ توہین سے تلملا کر دیوانہ وار ہوا میں فائرنگ شروع کر دی۔ وہ اور اُس
کے غنڈے ساتھی زور زور سے گالیاں دے کر ہجوم کی سمت ہوا میں گولیاں
چلا رہے تھے۔ اُن کے مردہ ساتھی کی خون میں لت پت لاش کسی ٹرک کے ٹائروں
تلے کچلے جانے والے کتے کی طرح اُن کے قدموں میں پڑی تھی۔

ذاکر بھائی نے عفت مآب شہیدہ کی لاش کو ٹھوکر مار کر اپنا غصہ نکالا
اور گالیاں بکتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک کار میں سوار ہو کر ہوا ہو گیا۔

اس اطمینان کے بعد کہ دہشت گرد یہاں سے دفع ہو گئے ہیں ایمرجنسی پولیس
کے بہادر جوان اپنی برق رفتار اور جدید آلاتِ حرب و ضرب سے سجی سجائی
جیپوں کے ہوٹر بجاتے وہاں پہنچ گئے۔

انہوں نے دونوں لاشوں کے گرد بڑی تنظیم اور ترتیب سے گھیرا ڈالا اور

مجمع کو بھگانے کے لیے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ اس بات کا علم ہونے پر کہ وہاں ایک "بیہوش" وکٹم "VICTAM" بھی موجود ہے سائیر جنسی سکواڈ کے کمانڈر نے اپنی جیپ کے وائرلیس سے ایمبولینس طلب کی اور غنڈوں کے بعد پولیس کی فائرنگ سے خوف زدہ شہریوں نے ڈرتے ڈرتے اپنے مکانات کی کھڑکیوں سے یہ منظر بھی دیکھا کہ لسانی تنظیم کے طبی ونگ کے رضا کاروں کی دو ایمبولینس وہاں پہنچیں جن میں سے ایک میں دونوں لاشیں اور دوسری میں بے ہوش عارفہ کو ڈال کر وہ لوگ زور زور سے ہوٹر بجاتے ہسپتال کی طرف چل دیے۔

○

شیر گل کو آج نجانے کیوں اپنی بزدلی پر غصہ آرہا تھا۔

اُن لوگوں نے بڑا کامیاب آپریشن کیا تھا اور شام ڈھلے اپنے مشن سے واپس لوٹے تھے۔ اس دوران اُسے رہ رہ کر اپنی بہن کا خیال آتا رہا۔ اس کی چھٹی حس اُسے بار بار کسی آمدہ خطرے کا احساس دلا کر بے چین کرتی رہی اور شیر گل اسے اپنی بزدلی سمجھتا رہا۔

اس نے بالآخر خود کو یہ سمجھا کر قدرے مطمئن کر دیا کہ اس کی بہن کو [illegible] اپنی عزت کی حفاظت کا طریقہ آتا ہے اور اس کام کے لیے وہ کسی کی مدد کی محتاج نہیں ہے۔ اگر خدانخواستہ ایسا وقت آ ہی گیا تو وہ اپنی حفاظت کر لے گی۔

بڑے دنوں بعد آج اس کا افسر اعلیٰ خوش ہوا تھا۔ واقعی اُن لوگوں نے بڑی کامیابی سے تاوان کے لیے ایک سرکاری افسر کے بیٹے کو اغوا کرنے والے گروہ کو گرفتار کیا تھا اور بطور خاص یہ کارنامہ بھی انجام دیا کہ اغوا ہونے والے بچے کو ملزم نقصان نہ پہنچا سکیں۔

"ویل ڈن ———" افسر اعلیٰ نے اس کو شاباش دی۔

"شکریہ سر ———!" اُس نے اظہارِ تشکر سے کہا۔

رپورٹ لکھتے ہوئے شام گہری ہو چلی تھی۔ جب وہ رپورٹ مکمل کر کے نکلا۔ تو رات ہو گئی تھی۔

اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ قدرے مطمئن تھا کہ آج جان پر کھیل کر اس نے ایک اعلیٰ سرکاری افسر کے بیٹے کو اغوا کاروں کے چنگل سے نجات دلائی ہے۔ اپنے دفتر سے بمشکل تین چار فرلانگ کے فاصلے پر اس کی موٹر سائیکل اچانک ایک جیپ سے ٹکرائی۔ اگر وہ اچانک بریک نہ لگاتا تو بہت نقصان ہو جاتا۔ غصے سے تلملا کر اس نے موٹر سائیکل کھڑی کی اور چاہا کہ اس جیپ والے کا دماغ درست کر دے جس نے تمام ٹریفک قوانین بالائے طاق رکھ کر اس کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔

لیکن ———

جیسے ہی وہ موٹر سائیکل کھڑی کر کے سیدھا ہوا۔ جیپ سواروں نے اچانک اس کی طرف بندوقیں سیدھی کر کے اُسے ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا۔ اس سے پہلے کہ شیر دل کو صورتِ حال کی سمجھ آئے کسی تربیت یافتہ دہشت گرد نے اس کی پشت سے اس کی کنپٹی پر زوردار ضرب لگائی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح دائیں طرف اُلٹ گیا۔

زمین پر گرنے سے پہلے اُسے چار مضبوط ہاتھوں نے تھام لیا ———!!

عین اُن لمحات میں لسانی تنظیم کے طبی ونگ کی ایک ایمبولینس وہاں آئی اور چار مضبوط ہاتھوں نے شیر گل کو اٹھا کر اس میں پھینک دیا۔ ایمبولینس میں موجود مستعد رضا کاروں نے دوسرے ہی لمحے اسے سٹریچر پر ڈال کر اس طرح جکڑ

دیا تھا کہ اب وہ اپنی مرضی سے اپنے جسم کو ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔

سائرن بجاتی ایمبولینس لسانی تنظیم کے ہسپتال کی طرف تیز رفتاری سے
دی تھی اور دوسری جیپ میں موجود غنڈے دوسری سڑک پر گھوم گئے۔

تھوڑی دیر بعد شیر گل "۹۵" میں پہنچ گیا ——!!

جس ایمبولینس میں اُسے یہاں لایا گیا تھا۔ اتفاق سے اُسی ایمبولینس
دوپہر اس کی بہن کی لاش لائی گئی تھی اور جس عمارت کے تہہ خانے میں اُسے
پھینکا گیا تھا۔ اس عمارت کی اوپری منزل سے اُس کی بہن کی لاش تھوڑی دیر
اس کے لواحقین کو بوجھل دلوں کے ساتھ تنظیم کے طبی ونگ کے رضاکاروں نے
سونپی تھی۔

شیر گل کو ہوش آیا تو اُس نے خود کو مضبوط سلاخوں والی حوالات میں بند
اس کے ایک پاؤں میں زنجیر ڈال کر ایک مضبوط سلاخ سے باندھی گئی تھی۔ دو
سروں پر مضبوط تالے لگے تھے۔

اپنی گردن اُسے اکڑی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور گردن گھمانے میں وہ
دقت محسوس کر رہا تھا۔

ہمت کر کے وہ اُٹھ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب شاید صبح ہو گئی
تھی۔ تھوڑی دیر بعد اُسے اپنی طرف آتی قدموں کی چاپ سنائی دی پھر اس نے
سلاخوں کے باہر عارف میاں کو کھڑے دیکھا جس کے عقب میں تین اور مسلح
غنڈے موجود تھے۔ اُن میں سے ایک نے کلاشنکوف تھام رکھی تھی۔

ٹارچر سنٹر

"کیوں بیٹا؟ اب معلوم پڑا آٹے دال کا بھاؤ —— سالا بڑا اکڑتا تھا۔ ابے
تجھے کہا تھا ایک ہفتے میں بھاگ جا اس شہر سے اور تُو ابھی تک یہیں پھر رہا
ہے۔ اب بھگت بیٹا —— بھگت اب۔ دیکھتا ہوں کون سالا تجھے بچانے
آتا ہے۔"

یہ کمال الدین تھا۔

لسانی تنظیم کا سرکردہ ممبر اور مقامی کونسلر جس کے خلاف شیر دل نے ایف
آئی آر درج کروائی تھی اور اسے مارکیٹ میں فائرنگ کا ذمہ دار گردانا تھا۔
اور جس کو پولیس نے آج تک پوچھنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی تھی۔ بجائے اس
کے کہ وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہوتا آج شیر دل اُس کی تنظیم کا قیدی تھا
اور کمال الدین اس کی بے بسی کا تمسخر اڑا رہا تھا۔

یہ عبرت کی جا تھی۔

ایک ذمہ دار سرکاری افسر ہونے کے ناطے اُس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام
تھا۔ اس کا جی چاہا کہ ابھی زمین پھٹے اور وہ اس کے اندر سما جائے۔

لیکن ——

اس کے سوچنے سے زمین نہیں پھٹ سکتی تھی۔ آسمان نہیں گر سکتا تھا نہ

ہی اتنی آسانی سے اس کی جان چھوٹ سکتی تھی۔ اُس نے لسانی تنظیم کو اپنی جہیز
میں للکار کر ایسا گناہ کر دیا تھا جس کا کفارہ آسانی سے ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس
کے لیے اُسے بہرحال ایک طویل اور اذیت ناک عمل سے گزرنا تھا۔

"دیکھو میاں! ہم ایک مرتبہ وارننگ ضرور دیا کرتے ہیں۔ یہ ہمارا اصول ہے
لیکن ہمارے حکم پہ عمل نہ کرنے والے کو ہم معاف نہیں کیا کرتے یہ بھی ہمارا اصول ہے
جس پہ ہم سختی سے کاربند ہیں۔ ہمارے لیے تم جیسے کیڑے مکوڑوں کو جان سے مار
دینا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ چیونٹی کو پاؤں سے مسل دینا، لیکن ہم تمہیں زندہ درگور
کر دیں گے تاکہ تم اپنے ساتھیوں کے لیے مثال بن جاؤ اور اشتہار بن کر
شہر میں گھومتے پھرو کہ جس نے تنظیم سے ٹکرانے کی کوشش کی وہ اپنے انجام کو
پہنچا" — اس مرتبہ عارف میاں اس سے مخاطب تھے۔

عارف میاں نے یہاں آنے سے پہلے اچھی خاصی چڑھا رکھی تھی یوں بھی اب
اس کا شمار تنظیم کے بڑے غنڈوں میں ہونے لگا تھا اور وہ اب اپنے "بڑے"
ہونے کا ثبوت دینے ہی یہاں آیا تھا۔

"بکواس بند کرو — ذلیل انسان تم نہیں جانتے میں کون ہوں —
تم سے جو بھی بن پڑے کر گزرو — یاد رکھنا اگر تم نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تو
اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرو گے —"

بالآخر شیر گل پھٹ پڑا۔

"لاؤ سالے کو ابھی اس کا مزاج ٹھنڈا کرتا ہوں" — عارف میاں نے
حکم دیا۔

دروازہ کھلا اور تنظیم کے رضاکار اُسے گن پوائنٹ پہ جانوروں کی طرح
گھسیٹتے اس کمرے کی طرف لے آئے جہاں وہ اپنے "مجرموں" کو سزا دیا کرتے

شیر گل کو ایک لوہے کی کرسی پر اس طرح جکڑ دیا گیا کہ اُس کے بازو کرسی
کے بازوؤں سے بندھے تھے اور ٹانگوں کو زنجیر سے باندھا گیا تھا۔

"شیر گل۔ تمہارے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ اپنے استعفیٰ پر دستخط کر
دو جو ٹائپ شدہ ہمارے پاس موجود ہے اور چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔"
عارف میاں نے ایک کونے میں دھری میز پر رکھی فائل کی طرف اشارہ کیا۔

"شٹ اپ — تم یہ حسرت ہی دل میں لے کر مر جاؤ گے کہ اپنی مرضی
سے کوئی بات مجھ سے منوا سکتے تھے" — شیر گل دھاڑا۔

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی —"

عارف میاں کے اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ اس کی پشت پر موجود رضاکاروں
نے جلتے ہوئے سگریٹ اس کے دونوں کندھوں پر رکھ دیے۔

شیر گل کے کندھوں پر رکھے انگارے اُس کے سارے بدن میں دہکنے
لگے تھے لیکن کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹ دانتوں
تلے دبا لیے۔

"عموماً یہ اختتام ہوتا ہے انسپکٹر! لیکن ہم آغاز اس سے کرتے ہیں۔ اس
لیے تم اندازہ کر لو کہ ہم کہاں تک جا سکتے ہیں — میں تمہارے بدن کی
ہڈیوں کا گودا نکال لوں گا — تمہارے جسم میں ڈرل سے اتنے سوراخ کر دوں
گا کہ تمہاری شناخت ممکن نہ رہے۔"

عارف میاں پر ایک جنونی کیفیت طاری تھی۔
وہ عالمِ وحشت میں درندوں جیسی حرکات کر رہا تھا۔ دونوں رضاکاروں
کے جلتے سگریٹ مسلسل شیر گل کے کندھوں سے چپکے رہنے کی وجہ سے بجھ گئے
تھے اور اب وہ ہیٹر پہ پہلے سے رکھی پتلی پتلی لوہے کی سلاخیں گرم کر رہے تھے۔

اچانک ہی عارف میاں نے ایک کونے پر دھری میز پر ترتیب سے رکھے سامانِ اذیت میں سے لوہے کی ایک موٹی سی سلاخ کا انتخاب کیا اور شیر گل کے جسم کو جلترنگ کی پیالیوں کی طرح بجانے لگا۔

ماہر موسیقار کی طرح جو چھوٹی سی چھڑی سے پیالیاں بجا کر جلترنگ سے آواز پیدا کرتا ہے۔ اُس نے بڑی تیزی سے شیر گل کی ہڈیاں بجانا شروع کر دیں۔ وہ شیر گل کے ٹخنوں سے کندھوں تک تمام ہڈیوں پر تیزی سے ہاتھ چلا رہا تھا۔

شیر گل کو اپنا بدن ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے حلق سے بے اختیار چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ جب یہ تینوں درندے دیوانوں کی طرح قہقہے لگانے لگتے تھے۔

اُن کے قہقہے اور شیر گل کی چیخیں اکٹھے بلند ہوتی تھیں اور سننے والوں کے کلیجے پھٹ جانے کا سماں پیدا کرتی تھیں۔

"چلاؤ۔۔۔ جلاؤ اسے ۔۔۔ جلا دو سالے کو" ۔۔۔ عارف نے اچانک ہاتھ روک کر دونوں رضا کاروں کو حکم دیا جو اپنے ہاتھوں میں لوہے کی سلاخیں جن پکڑنے کے لیے لکڑی کے دستے لگائے گئے تھے ۔۔۔ پکڑے اپنی باری کے منتظر کھڑے تھے ۔۔۔ !!

انہوں نے درندوں کی طرح قہقہے لگاتے ہوئے باری باری دونوں سلاخیں اُس کے کندھوں پر بالکل اسی جگہ رکھ دیں جہاں پہلے سگریٹ کے جلنے سے نشان موجود تھے۔

زندہ انسان کا گوشت جلنے لگا ۔۔۔ !!

شیر دل کے حلق سے ذبح ہونے والے بکرے جیسی کربناک چیخیں بلند ہو رہی تھیں لیکن ان چیخوں پر ان وحشیوں کے قہقہے غالب تھے۔

اچانک ہی اس کی گردن ڈھلک گئی۔

وہ بے ہوش ہو چکا تھا ۔۔۔ !!

"پانی ڈالو ۔۔۔ پانی ڈالو" ۔۔۔ عارف میاں نے اپنے رضا کاروں کو حکم دیا جو ننھے بچوں کی طرح کلکاریاں مارتے ہوئے اُس کا بدن جلا رہے تھے۔

دونوں نے سلاخیں دوبارہ اپنی جگہ پر فٹ کر دیں اور پانی کا گلاس بھر لائے۔ ان میں سے ایک نے زور زور سے پانی کے چھینٹے شیر گل کے منہ پر مارے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھولیں پھر بند کر لیں۔

"ایسے ڈاکٹر کو بلاؤ بے" ۔۔۔ عارف میاں نے کمرے کے باہر موجود گارڈ کو حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر وہاں موجود تھا۔

یہ تنظیم کے طبی ونگ کا ڈاکٹر تھا۔ جس نے پھرتی سے شیر گل کا بلڈ پریشر، دل کی دھڑکن اور جسم کی عمومی حالت کا جائزہ لیا۔

"تھوڑا آرام چاہیے مریض کو ۔۔۔ ابھی بھی مرے گا نہیں، لیکن تھوڑا آرام کرنے دو تو بڑا مزہ دے گا ۔۔۔"

ڈاکٹر نے جو خون پینے والا ڈریکولا دکھائی دے رہا تھا مسکراتے ہوئے عارف میاں سے کہا۔

"پھینک دو سالے کو اور کل تک مرنے نہ دینا" ۔۔۔

عارف میاں نے رضا کاروں کو حکم دیا اور خود باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ منے بھائی کی طرف جا رہا تھا جہاں انہیں آج ایک اہم میٹنگ میں شامل ہونا تھا۔ اب وہ کل صبح تک فارغ تھا کیونکہ اس کا "مریض" کم از کم ۲۴ گھنٹے آرام چاہتا تھا۔

شیر گل کو ہوش آیا تو وہ زنجیر کی بندشوں سے آزاد تھا۔ ہوش آنے پر اُ
جسمانی اذیت کے جس عمل سے گزرنا پڑا اُس کے بعد اُس کے دل سے دوبارہ
کی دعائیں نکلنے لگی تھیں۔

لیکن ـــــ

یہ دُعا قبول نہ ہوئی۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ بمشکل اُ
نے کوٹھڑی کے کونے میں دھرے مٹی کے گھڑے سے مٹی کے پیالے میں
انڈیلا اور ایک ایک گھونٹ کر کے پینے لگا۔

یہاں عام حالت میں شاید ایک ہی پہریدار موجود رہتا تھا جواب بے نیاز
سے ٹہلتا اُس کے نزدیک آیا اور اُسے ہوش میں آتے دیکھ کر کسی کو اطلاع دینے
چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہی ڈاکٹر دو مسلح رضاکاروں سمیت اُس کے سرہانے موجود
تھا۔ ڈاکٹر نے وہاں موجود پہرے دار کو دروازہ کھولنے کا حکم دیا اور اُس
کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔

شیر دل کے لیے اپنے جسم کو جنبش دینا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے
دو بندوقوں کی نالیاں اُس کی طرف تنی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر نے دوبارہ اس کا جسمانی معائنہ کیا اور چپ چاپ باہر آ گیا۔ باہر
اُس نے پہرے دار کو کچھ ہدایات دی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ اس کے لیے کھانا لے آئے۔ جبکہ ڈاکٹر کے
آنے والے رضاکاروں نے ایک ٹرے میں کچھ دوائیاں بھی اٹھا رکھی تھیں۔

" دیکھو میاں میں ڈاکٹر ہوں اور میرا فرض ہے کہ تمہیں قابلِ تفتیش بنا
رکھوں۔ اگر تم یہ گولیاں کھا لو تو قدرے افاقہ ہو جائے گا ـــــ اور ہاں
تم نے مار کھانے کا مصمم ارادہ کر رکھا ہے اس لیے ضروری ہے کہ تم کھانا

کھاتے رہو ـــــ "

یہ کہہ کر اُس نے جنونیوں کی طرح ہنسنا شروع کر دیا۔

شیر گل نے اُس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے علم تھا وہ انتہا پسند
جنونیوں کی قید میں ہے اور یہاں سے سلامتی کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ
وہ اپنے ذہن کو غیر حاضر نہ ہونے دے۔

ڈاکٹر نے اُس کے جلے ہوئے جسم پر کوئی سفوف چھڑکا تو اُسے قدرے سکون
محسوس ہوا۔ جس کے بعد اُسے کھانا کھلانے کا حکم ملا۔ خلافِ توقع کھانا اچھا تھا جو
اُس نے ہمت کر کے زہر مار کر لیا۔ وہ بہرحال اپنی جسمانی توانائیاں برقرار رکھنا
چاہتا تھا۔

کھانا ختم کرنے پر اُسے گولی کھانے کا حکم ملا اور گولی نگلنے کے چند منٹ
بعد ہی اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ غالباً یہ کوئی نشہ آور نیند لانے والی گولی
تھی اور یہاں موجود قصائی اپنے شکار کی تڑپ کا مزہ دیکھنے کے بعد اُسے کچھ دیر
کے لیے آرام کروا رہے تھے، تاکہ دوبارہ اُس کا جسم ان کی جنونی حرکات کا
متحمل ہو سکے۔

اس مرتبہ اس کی آنکھ کھلی تو شیر گل نے اندازہ کیا کہ شاید شام ڈھل چکی
ہے۔ یہاں وقت ماپنے کا کوئی آلہ موجود نہیں تھا۔ ایک تہہ خانے میں بند بے بس
قیدی کے لیے دن اور رات کی تمیز ممکن ہی نہیں تھی۔

شیر دل کا سارا بدن سُلگ رہا تھا ـــــ !!

لوہے کی گرم سلاخوں اور جلتے ہوئے سگریٹوں کی آگ اس کی نس نس میں
دوڑ رہی تھی۔

ابھی تک اُس نے ہمت کر کے اپنی پشت پر ہاتھ پھیر کر زخم کا جائزہ بھی

نہیں لیا تھا۔ بس ایک ہی دُھن اس کے دماغ پر سوار تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ یہاں سے نکل جائے۔ اس بات کا تو اُسے علم تھا کہ یہ لوگ اُسے جان سے نہیں ماریں گے۔ اگر ان کا یہی ارادہ ہوتا تو بڑی آسانی سے اغوا کے وقت ہی اُسے عملی جامہ پہنا لیتے۔

یہ لوگ اُسے سِسکا سِسکا کر تڑپا تڑپا کر اپنی برتری اور شیر گُل کی بے بسی کا احساس دلانا چاہتے تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ شیر گُل جب یہاں سے جائے تو اپنے ساتھیوں کے لیے نمونۂ عبرت بن جائے اور آئندہ پولیس کی طرح ایجنسی کے بھی کسی ملازم کو اُن کے کسی بھی حکم کی سرتابی کی جرأت نہ ہو۔

شیر گُل نے ان مذبح خانوں کی یاترا کرنے والوں کی کہانی سُن رکھی تھی۔ اُن لوگوں کے جسموں میں چھید کرنے کے بعد، اُن کی کھال جلانے کے بعد انہیں کسی گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا۔

یہ جنونی جو زبان اور زمین کے حوالے سے خود کو منظم کر رہے تھے انسانیت کی سطح سے گر کر درندگی کی سطح پر اُتر آئے تھے۔

○

اُس نے اس بات کا اندازہ تو لگا لیا تھا کہ یہاں صرف ایک ہی پہریدار ہوتا ہے۔ شاید اس جگہ آنے والوں کی طرف سے فرار کی کوشش کا خیال ہی "وہ" والوں کے دل میں نہیں آیا تھا۔

اس وقت تہہ خانے کے سارے بلب روشن تھے۔ اسی ایک بات سے شیر گُل نے اندازہ لگایا تھا کہ رات ہو چکی ہے۔ کیونکہ جب اُسے تفتیش کے لیے لے جایا گیا تو اکا دکا بلب ہی روشن تھے۔

اُسے جو بھی کرنا تھا ابھی کرنا تھا۔ ابھی اس کا جسم بہرحال اس قابل تھا کہ یہاں سے آزادی تک کا فاصلہ طے کر سکے۔ اگر ایک مرتبہ اور وہ وحشیوں کی بھینٹ چڑھ جاتا تو پھر شاید وہ طویل عرصے تک اپنی مرضی سے اپنے جسم کو جنبش دینے کے لائق بھی نہ رہتا۔

اس کے جسم سے اُٹھنے والا کرب اُسے پاگل کیے دے رہا تھا۔ درد کی شدت اس کے اندر انتقام کی آگ کو بھڑکا رہی تھی۔

کچھ سوچ کر اُس نے اچانک ہی اپنے لوہے کے دروازے کی سلاخوں کو جھنجھوڑ دیا۔ فوراً تہہ خانے کی سیڑھیوں کے نزدیک موجود "مسلح رضاکار" اس کے سر پر پہنچ گیا۔

اس نے شیر گُل کو گالیاں دیتے ہوئے دوبارہ ایسی حرکت کرنے پر گولی مارنے کی دھمکی دیتے ہوئے خاموش رہنے کی تلقین کی۔

"مجھے چائے لا کر دو ـــــ میرا دماغ پھٹ رہا ہے ـــــ"

شیر گُل تو کسی اور سلوک کی توقع کر رہا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ پہرے دار واقعی چائے کا ایک گلاس تھامے اس طرف آ رہا تھا۔ اس کی چال سے شیر گُل نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس وقت وہ شراب کے نشے میں بدمست ہے۔ جس وقت شیر گُل نے دروازے کی سلاخوں کو ہلایا تھا شاید وہ اس وقت شغل مے نوشی میں مشغول تھا ـــــ !!

یہ شیر گُل کی خوش قسمتی تھی کہ ایسا پہرے دار اس کے حصے میں آ گیا تھا۔ جو تنظیم کا بگڑا ہوا شہزادہ تھا ـــــ !!

آج چونکہ یہاں اکیلا قیدی شیر گُل ہی تھا جس کے "کیس آفیسر عارف میاں" نے کل آنا تھا اور اس قید خانے کا اصول یہی تھا کہ یہاں موجود پہرے دار ہی

کیس آفیسر کی موجودگی میں یہاں کا انچارج ہوا کرتا تھا۔

بدمست اور وحشی پہرے دار نے یہ موقع غنیمت جانا اور وہ شراب کی بوتل کے ساتھ بسر کرنے کے لیے شباب بھی یہیں لے آیا تھا۔ اس جیسے لاڈلے رضا کار کی خدمت کے لیے لسانی تنظیم کی خواتین ونگ میں کئی رضا کارائیں" موجود تھیں۔

پہرے داروں کے آرام کے لیے بنی سیڑھیوں کے ساتھ ہی موجود چھوٹی سی کوٹھڑی میں وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ شغل مے نوشی میں موجود تھا جب شیر گل نے ہنگامہ کھڑا کیا۔ ان حالات میں اُس کے لیے قیدی کی اس گستاخی کو نظر انداز کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ فی الوقت وہ یہی چاہتا تھا کہ شیر گل خاموش رہے تاکہ وہ اپنا گھناؤنا کھیل اچھی طرح کھیل سکے اور اپنی محبوبہ کو رخصت کرنے کے بعد ہی اس سے نمٹنا چاہتا تھا۔ چائے اُس نے قیدی کے لیے خود تیار کی تھی۔

○

جب پہرے دار چائے کا گلاس لے کر وہاں پہنچا تو شیر گل نے بیقراری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سلاخوں سے دونوں ہاتھ باہر نکال دیئے تاکہ چائے کا گلاس تھام سکے۔ بدمست "رضا کار" نے سلاخوں سے باہر لٹکے اُس کے ہاتھوں کو دیکھا تو غصے سے انہیں ٹھوکر مارنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ اس نے چاہا کہ اپنے بوٹ سے شیر گل کے ہاتھوں پر ٹھوکر مارے۔ جیسے ہی اس کا پاؤں حملے کے ارادے سے اُٹھا اُس کے ہاتھوں میں بجلیاں بھر گئیں۔!

اذیت اور انتقام کی شدت سے دیوانگی کے عالم میں اُس نے رضا کار کے پاؤں کو جھٹکا مارا اور وہ دھڑام سے کمر کے بل زمین پر گر گیا۔ اب اس کے دونوں پاؤں شیر گل کے دونوں ہاتھوں میں تھے۔

سلاخوں والے دروازے اور کمرے کے فرش کے درمیان وہ خلا جو ان دنوں

نے اندر موجود قیدیوں تک کھانا پہنچانے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ شیر گل کے کام آیا، وہ رضا کار کو اس وقت تک گھسیٹتا رہا جب تک اس کی ٹانگیں اس خلا میں پھنس نہیں گئیں ——— !!

اب اس کے دھڑ تک شیر گل کی رسائی ممکن ہو گئی تھی۔

دوسرے ہی لمحے اس نے پہرے دار کو اس طرح دبوچ لیا کہ اس کے منہ سے کوئی آواز نکالنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ شیر گل سلاخوں کے پیچھے اس کی ٹانگوں پر بیٹھا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے پہرے دار کی گردن اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبا رکھا تھا اور اپنا دباؤ مسلسل اس کی گردن پر بڑھا رہا تھا۔ پہرے دار کے لیے جسم کو جنبش دینا ممکن نہیں رہا تھا۔ شراب کے نشے میں وہ پہلے ہی اپنے قابو میں نہیں تھا۔

اس کا دم گھٹنے لگا تھا ——— !!

بمشکل دو منٹ کی جدوجہد نے اُسے ادھ موا کر دیا تھا۔ پھر اس کی گردن ڈھلک گئی تھی۔ شیر گل کو اس بات سے کچھ علاقہ نہیں تھا کہ وہ مر گیا ہے یا بے ہوش ہوا ہے۔ اُس نے بے حس و حرکت پہرے دار کی پتلون کی جیب سے چابیوں کا گچھا برآمد کیا اور اب وہ اپنے ہاتھ کی دسترس میں موجود دروازے کے تالے پر مختلف چابیاں آزما رہا تھا۔

اُس کی مراد جلد ہی بر آئی اور تالا کھل گیا ——— !!

شیر گل کی حالت اُس زخمی چیتے جیسی تھی جس پر خونخوار کتوں کی فوج نے حملہ کر دیا ہو۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے نیم مردہ پہرے دار کو اندر گھسیٹ لیا۔

بجلی کی سرعت سے اُس نے پہرے دار کو کپڑوں سے بے نیاز کر دیا اور

اس کے کپڑے پہن لیے۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے کوٹھڑی کے سامنے رکھی [illegible]
کی کلاشنکوف اٹھالی اور پوری قوت سے بندوق کا ہتھا نیم مردہ پہرے دار [illegible]
سر میں رسید کیا۔

اپنی دانست میں اُس نے اب پہریدار کو مار ڈالا تھا۔

کلاشنکوف ہاتھوں میں پکڑے چوکس اور زخم خوردہ ٹائیگر کی طرح وہ تیزی
پر بھاگتا ہُوا سیڑھیوں کے کونے پر بنے پہریدار کے کمرے تک پہنچا اچانک اس نے [illegible]
ایک برہنہ رضاکارہ کو برآمد ہوتے دیکھا۔ جو شاید کسی پیش آمدہ خطرے کا احساس
ہونے پر گھبرا کر باہر نکل آئی تھی۔

شیر گل کو اس صورت حال نے ایک لمحے کے لیے تو بوکھلا کر رکھ دیا تھا
لیکن اس سے پہلے کہ خوفزدہ رضاکارہ کے حلق سے چیخ برآمد ہو شیر گل نے بجلی کی
پھرتی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

خبردار اگر آواز نکالی تو ــــ" اس نے رضاکارہ کے کان میں سرگوشی کی
اس کے ساتھ ہی اُسے قریباً گھسیٹتا ہُوا اُسی کوٹھڑی تک لے گیا جہاں
اس کا محبوب موجود تھا۔ اچانک صدمے اور منہ پر شیر گل کے ہاتھ کے دباؤ سے [illegible]
اندام رضاکارہ جلد ہی اپنے حواس کھو بیٹھی۔

شیر گل نے اُسے بھی اُسی کوٹھڑی میں پھینکا اور کوٹھڑی کو تالا لگا کر چابیاں
اپنی جیب میں ڈال کر راہ لی۔

○

تہہ خانے کی سیڑھیوں کے اوپری سرے پر لوہے کا ایک اور جنگلا موجود تھا
شیر گل کے پاس موجود چابیوں میں سے ایک نے یہ تالا بھی کھول دیا۔ اب وہ ایک
نیم روشن راہداری میں چل رہا تھا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتا اب وہ کافی لمبا [illegible]

کے اُس ڈھیر تک پہنچ گیا تھا جسے عبور کرنے کے بعد اُس نے باہر نکلنا تھا۔

باہر سے آنے والی تازہ ہوا کے جھونکے نے اُسے احساس دلا دیا تھا کہ منزل
نزدیک ہے وہ مزید چوکس ہو گیا ـــ!!

اب وہ اس راستے پر چل رہا تھا جو گراؤنڈ فلور کی طرف جا رہا تھا۔ یہ سارا
سفر اس نے اندازے سے طے کیا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اس طلسم ہوشربا سے کس
طرح نکل پائے گا۔

ایک دروازے سے جیسے ہی وہ باہر نکلا سامنے اُسے لفٹ نظر آ گئی۔ شیر گل
نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور لفٹ میں سوار ہو کر گراؤنڈ فلور کا بٹن دبا دیا۔ دوسرے ہی
لمحے لفٹ رُک گئی۔

اس نے کلاشنکوف کو فائرنگ کی پوزیشن میں کرتے ہوئے دروازہ کھولا اور
نکل آیا۔

یہ ایک طویل برآمدہ تھا جس کے ایک کونے میں "استقبالیہ" تھا اور دیواروں
کے ساتھ ساتھ مریضوں کے لواحقین بیٹھے تھے۔ بندوق کو بازو سے قدرے چھپا
کر وہ تیزی سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل دیا۔

ابھی تک کسی نے اُس پر شک نہیں کیا تھا ـــ!!

برآمدے کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے اُس نے ایک ایمبولینس رُکتے دیکھی جس
سے طبی ونگ کا رضاکار چابی کا چھلا گھماتا باہر نکلا۔ جیسے ہی اس کی نظر اپنی طرف
آتے شیر گل پر پڑی اُسے کچھ شک گزرا اور اچانک ہی اُس نے شیر گل کو ٹھہرنے
کے لیے کہا۔ شیر گل نے اُس کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے ـــ
رائفل سیدھی کر لی تھی لیکن رضاکار کو شاید زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا یا پھر اُسے
شیر گل کی طرف سے مزاحمت کی اُمید ہی نہیں تھی۔ اس نے شیر گل کی وارننگ کو

خاطر میں لائے بغیر پستول نکالا اور چاہا کہ شیر گل پر گولی چلائے جب اچانک رضا
کے ہاتھ میں پکڑی کلاشنکوف نے شعلہ اُگلا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

شیر گل اُڑتے پرندے کو نشانہ لگا کر گرا سکتا تھا۔ اس نے ایک ہی
گولی رضا کار کے سینے میں اُتار دی۔ اور اُسے سنبھلنے کی مہلت بھی نہیں مل سکی۔

"بھاگو شیر گل ـــ بھاگو ـــ" اُس کی چھوٹی جِنّ نے چلّاتے ہوئے کہا۔

شیر گل نے پھرتی سے گرنے والے کے ہاتھ میں موجود ایمبولینس کی چابی
سنبھالی اور زقند بھر کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب وہ ایمبولینس کو باہر جانے
والے راستے پر بھگا رہا تھا۔

ایمبولینس موڑتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا کہ استقبالیہ سے کچھ لوگ
بھاگتے ہوئے ڈرائیور کی مدد کو آ رہے تھے۔

شیر گل نے ایمبولینس کو پہلا موڑ اتنی تیزی سے گھمایا تھا کہ وہ اُلٹتے اُلٹتے
بچ گئی۔ راستے میں کھڑی دو موٹر سائیکلوں کو اس نے ٹکر مار کر پرے پھینک دیا تھا
اور اب برق رفتاری سے باہر جانے والی سڑک پر ایمبولینس بھگا رہا تھا۔

یہ علاقہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔

ایجنسی کے ہر عہدے دار کو سب سے پہلے لسانی تنظیم کے اس ہیڈ کوارٹر میں
بھیس بدل کر "ریکی" کرنے بھیجا جاتا تھا۔ رات ہونے کے سبب ٹریفک کا زیادہ
دباؤ نہیں تھا۔ یوں بھی ایمبولینس کے سائرن سن کر لوگ راستہ چھوڑ دیتے تھے۔

اب اُسے اپنے تعاقب کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور تین چار سڑکوں پر ایمبولینس کو گھما دیا۔ اس
درمیان پولیس کی گشتی پارٹی پر بھی اس کی نظر پڑی تھی۔

لیکن ـــ

انسپکٹر شیر گل خان اب کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

ایک قدرے ویران سڑک پر اُس نے ایمبولینس روک دی۔ اس کے ڈیش بورڈ
پر رکھی سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا اُٹھا لی۔ بجلی کی سی پھرتی سے اس نے ایمبولینس کا
بونٹ کھولا۔ پٹرول سپلائی کرنے والا پائپ جھٹکا دے کر توڑ ڈالا اور اس اطمینان
کے بعد کہ اب مطلوبہ مقدار میں پٹرول بہہ چکا ہے۔ کچھ فاصلے سے ماچس کھولی اور
اس سے کچھ تیلیاں باہر نکال کر ڈبیا میں پھنسائیں۔ پھر ایک تیلی سلگا کر ماچس کو
آگ دکھائی اور آگ کا گولہ انجن پر پھینک کر دیوانہ وار ایک طرف بھاگ اُٹھا۔

اُس کے تعاقب میں لسانی تنظیم کے جنگی ونگ کی ایمبولینس سے شعلے بلند ہو
رہے تھے۔ ایسی ہی ایک آگ اس کے دل و دماغ میں بھی لگی تھی۔ اگر اس کو موقع
ملتا تو وہ "۹۵" کو اسی طرح جلا کر راکھ کر دیتا۔

پریس کانفرنس

اس محلّے میں بنے بھائی کی آمد ہی اتنی بڑی خبر تھی کہ ارد گرد کے محلّوں سے
بھی لوگ یہاں جمع ہونے لگے تھے۔

بنے بھائی سیدھے عارفہ کے گھر پہنچے تھے۔ تنظیم کے سینکڑوں کارکن مکان
کے باہر موجود تھے۔ بنے بھائی کے ذاتی محافظوں نے پریس والوں کو جو بنے بھائی
کی آمد کی خبر سن کر یہاں جمع ہو گئے تھے، مکان کے باہر ہی روک رکھا تھا۔
پریس والوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

عارفہ کے والد کے لیے بیٹی کا حادثہ اب حادثہ جانکاہ بننے لگا تھا۔
جب وہ اپنی بیٹی کے بیہوش ہونے کی خبر سن کر تنظیم کے طبّی مرکز پہنچے
تو اُن کی ملاقات وہاں ایم پی اے پرویز خان سے ہوئی جس نے میر صاحب سے
پہلی بات یہی کہی کہ وہ اپنی بچی کی دلجوئی اور عیادت کریں لیکن ابھی کسی کے
سامنے وہ بات نہ دہرائیں جو اُن کی بچی اُنہیں بتائے گی۔

پولیس کو کیا بیان دینا ہے؟
اس کا فیصلہ وہ لوگ خود کریں گے۔

"لیکن خان صاحب پولیس والے تو ابھی بیان لینے آجائیں گے"۔۔۔ میر صاحب
نے گرم و سرد چشیدہ تھے اور ایک زمانہ دیکھ رکھا تھا پرویز خان کے تیور دیکھ کر

اندازہ لگا لیا کہ اُن کے لیے سوائے ہاں میں ہاں ملانے کے اور کوئی چارہ کار باقی
نہیں رہا۔ اُن سے زیادہ لسانی تنظیم کو کون جانتا ہوگا کہ وہ خود بھی ایک زمانے میں
اس میں شمولیت کی غلطی کر چکے تھے۔

"ٹھیک ہے جناب جو آپ کا حکم"۔۔۔ میر صاحب نے دست بدست عرض کی۔
جب وہ عارفہ کے کمرے میں داخل ہوئے تو اُن کی بیٹی کے ہوش حواس
بحال تھے۔

والد کو دیکھتے ہی عارفہ اُن سے لپٹ گئی اور سسکیاں لیتے ہوئے اُس نے سارا
واقعہ بیان کر دیا۔ میر صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دل الگ سے خون
رو رہا تھا۔ انہوں نے بچی کو نارمل کیا۔ تسلی دی اور ساتھ ہی نصیحت کے لہجے میں
اس سے درخواست کی کہ وہ پولیس کو ابھی کوئی بیان نہ دے۔

"پولیس کے لیے بیان تنظیم کے لوگوں نے تیار کیا ہے تم صرف اس پر دستخط کر دینا"۔۔۔
میر صاحب نے کہا۔

"لیکن ابّا میاں انہی لوگوں نے تو نجمہ کو قتل کیا ہے اور ان ہی کے کہنے پر....."
"بیٹی اس وقت تمہاری حالت ایسی نہیں کہ تم پر مزید بوجھ ڈالا جا سکے۔ صرف
ایک بات ذہن نشین کر لو تمہارا صرف ایک بھائی ہے جو میرے بعد تم تین بہنوں کا
واحد سہارا ہے۔ اگر تم یہ نہیں چاہتی کہ اس کا انجام بھی تمہاری سہیلی نجمہ جیسا ہو تو
اپنی زبان بند کر لو اور جس طرح یہ لوگ کہتے ہیں اس پر عمل کر دو"۔۔۔
انہوں نے اپنی بیٹی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

عارفہ کو اندازہ تھا کہ ابّا میاں کچھ غلط نہیں کہہ رہے۔۔۔!
وہ دودھ پیتی بچی نہیں تھی۔ اُسے ابھی تعلیم حاصل کرنی تھی۔ اس شہر میں
اپنے گھر والوں کے ساتھ زندگی گزارنا تھی۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میر صاحب

کی ریٹائرمنٹ کی عمر آ رہی تھی۔ تین بہنیں بیاہنے والی تھیں اور جوان بھائی کی تنخواہ سے
کر بھی وہ ظالموں کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا سکتی تھی۔

اس نے بادلِ نخواستہ اپنے ضمیر کی ملامت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے باپ
کا حکم مان لیا ــــــ!

اس کا دل خون رو رہا تھا۔

نجمہ اس کی سب سے عزیز سہیلی تھی۔ وہ متعدد مرتبہ نجمہ کے گھر گئی تھی۔ دور دراز
کے پہاڑوں سے آنے والی نجمہ اس کی ماں اور شرمیلے بھائی کے حسنِ سلوک نے
اُسے بہت متاثر کیا تھا۔ لسانی تنظیم کے پراپیگنڈہ کے برعکس نجمہ کے گھر والے
اُن سے بدرجہا بہتر انسان تھے۔ وہ شرافت، نیکی اور انسانی احترام کا بہترین نمونہ
تھے۔ سیاست انہیں چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔

اس نے شیر گل، نجمہ یا اس کی ماں کے منہ سے کبھی ایک لفظ بھی سیاست کے
موضوع پہ نہیں سنا تھا۔

نجمہ کی ماں نے کبھی اس میں اور اپنی بیٹی میں فرق نہیں جانا تھا۔ اپنے آبائی
صوبے کی نجانے کتنی سوغاتیں نجمہ کی ماں نے عارفہ کو سونپی تھیں۔

اُس نے ایک مرتبہ عارفہ سے منت کے لہجے میں کہا تھا کہ اُن کی بیٹی کو زمانے
کے اتار چڑھاؤ کا کچھ اندازہ نہیں۔ اُسے اس بات کا علم نہیں کہ درسگاہوں میں تعلیم
کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے اس لیے وہ نجمہ کی رہنمائی کرتی رہا کرے۔ نجمہ کو تو اس
شہر کی سڑکوں کا بھی اندازہ نہیں کہ کون سا راستہ کدھر کو لے جاتا ہے۔

اور ــــ اُس نے کتنے اعتماد سے کہا تھا کہ خالہ جی آپ بے فکر رہیں میرے
جیتے جی کوئی نجمہ کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا۔

بے چاری نجمہ کی بوڑھی ماں ــــ جس نے اس کی بات پر فوراً یقین کر

لیا تھا۔

"واہ عارفہ بی" ــــ اُس نے خود پر طنز کیا ــــ! خوب وعدہ نبھایا ہے تم نے
ــــ اور اب اپنی مُردہ سہیلی کا خون بھی بیچے جا رہی ہو ــــ اس کے قاتلوں سے
سمجھوتہ کر رہی ہو۔ محض اس لیے کہ تمہاری بہنوں اور بھائیوں کی جانیں اور عزتیں
محفوظ رہیں۔

کیا نجمہ کسی کی بیٹی نہیں ؟

کسی کی بہن نہیں تھی ؟

اُف میرے خدایا ــــ میں کیا کروں ؟ کدھر جاؤں ؟

وہ سسک پڑی۔

جانے کب تک آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کا تکیہ بھگوتے رہے۔

○

لسانی تنظیم کی طرف سے بُلائی گئی اس پریس کانفرنس میں مقامی ایم پی اے
پرویز خان، کونسلر کمال الدین، اینٹے بھائی اور تنظیم کے کچھ اور سرکردہ لیڈر تھے انہوں
نے اخبار نویسوں میں عارفہ کے والد کے کانپتے ہاتھوں سے عارفہ کے بیان کی کاپیاں
تقسیم کروا دیں۔

اس بیان کہا گیا تھا کہ "مخالف لسانی تنظیم" کے غنڈوں نے لڑکیوں کے کالج
سے کچھ فاصلے پر لسانی تنظیم کے طلبا ونگ کے ایک ممبر پہ حملہ کیا وہ اپنی جان بچانے کے
لیے بھاگا تو اس پر فائرنگ شروع کر دی گئی جس سے وہ موقع پہ مارا گیا۔ مرنے
والی طالبہ نجمہ کے حملہ آور "ہم زبان" تھے اور اُسے اغوا کرنے آئے تھے شاید نجمہ
نے ان لوگوں کا کوئی حکم ماننے سے انکار کیا ہوگا اور ان کی "لسانی تنظیم" کے طلبا
ونگ کا نوجوان نجمہ کو اس کے "ہم زبان حملہ آوروں" سے بچاتا ہوا اپنی جان سے

ہاتھ دھو بیٹھا۔

اس کے ساتھ ہی پرویز خان نے جو کہ تنظیم کا عہدے دار بھی تھا۔ اخبار نویسوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تنظیم غنڈہ گردی، دہشت گردی یا مار پیٹ کے بجائے امن اور صلح پر یقین رکھتی ہے اور وہ لوگ اپنی کمیونٹی کی خدمت کا جذبہ لے کر میدان میں آئے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مخالفوں کی گولیوں کا جواب وہ مسکراہٹوں ہی سے دیتے رہیں گے۔ اگر پولیس نے "مخالف لسانی تنظیم" کے حملہ آوروں کو گرفتار نہیں کیا تو سارا شہر سراپا احتجاج بن جائے گا۔

ایک اخبار نویس نے اٹھ کر پوچھنا چاہا کہ کیا وہ عارف سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ ابھی اس کا سوال نامکمل ہی تھا جب اس کے ایک ہیٹی بند بھائی نے اسے بازو کھینچ کر نیچے بٹھا دیا۔

"باؤلا ہو رہا ہے سالے — کیا نیا نیا آیا ہے صحافت میں — بچہ کا بیٹھا رہ۔"

اور وہ بے چارہ خاموش بیٹھ گیا —!!

"کوئی سوال؟" بنے بھائی نے اخبار نویسوں سے پوچھا جن پر سکوت طاری تھا۔

"نہیں بنے بھائی" — ایک سرکردہ اخبار نویس نے جواب دیا۔

"او کے۔ خدا حافظ" — بنے بھائی نے پریس کانفرنس کا تنتا نمٹاتے ہوئے کہا۔

"خبر ٹھیک ٹھاک لگنی چاہیے بھائیو —!" ذاکر نے اخبار نویسوں کی طرف معنی خیز مسکراہٹ اچھالی۔

"ضرور لگے گی ذاکر بھائی۔ کیوں نہیں لگے گی —" ایک سینئر اخبار نویس نے بے حیائی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

جس اخبار نویس نے سوال پوچھنے کی جرأت کی تھی اور اس کے ساتھی نے اسے بٹھا دیا تھا وہ بڑا غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ بے چارہ ریاض بھٹی نیا نیا رپورٹر بھرتی ہوا تھا۔ دفتر پہنچ کر وہ سیدھا ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں گیا جنہوں نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی فرمایا۔

"بھٹی صاحب میں اس وقت بہت مصروف ہوں آپ برائے مہربانی تشریف لے جائیں آپ کو اکاؤنٹس والے ہی سب کچھ بتا دیں گے" — ایڈیٹر صاحب نے گھنٹی کا بٹن دبا کر چپراسی کو اندر بلایا۔

"دوسرے مہمان کو لے آؤ" — انہوں نے ریاض بھٹی کی موجودگی کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے حکم دیا۔

بے چارہ ریاض بھٹی اکاؤنٹس برانچ کی طرف چل دیا۔ اس وقت تک اسے یہی امید تھی کہ شاید اس کی تنخواہ کا معاملہ جم گیا ہو کیونکہ گزشتہ تین ماہ سے وہ دو چیک ہی تنخواہ لے رہا تھا یا پھر......؟

اس سے آگے کچھ سوچتے ہوئے اسے خوف محسوس ہوتا تھا۔

اکاؤنٹنٹ نے ایک نگاہ بے نیازی اس پر ڈالی اور دو چیک بنا کر اس کے آگے رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ٹائپ شدہ حکم اسے تھما دیا گیا۔ جس کے مطابق اس کی کارکردگی سے انتظامیہ مطمئن نہیں تھی اس لیے اس کی چھٹی کروائی جا رہی ہے۔ اور طے شدہ معاہدے کے مطابق اسے ایک تنخواہ زائد ادا کی جا رہی تھی۔

ریاض بھٹی کو فوراً سمجھ آ گئی۔

اس کے نوجوان خون نے پھر اُبالا کھایا۔

"اپنے ایڈیٹر سے کہنا اگر پیسے ہی کمانے ہیں تو اس سے بہتر بھی کاروبار موجود ہیں۔ کوئی اور دھندہ شروع کر دے۔ جس میں اس کی آمدن بھی زیادہ ہو گی اور بڑے گھر بھی اس سے خوش بھی زیادہ رہیں گے۔"

اس نے دو چیک پر سائن کر کے پیسے اپنی جیب میں ڈالے اور بوڑھے اکاؤنٹنٹ کو ہکا بکا چھوڑ کر اپنی راہ لی۔

ریاض بھٹی جاننا تھا اسے کس جرم کی سزا ملی ہے؟ جس اخبار میں وہ کام کرتا

تھا اس بیراب تک دو مرتبہ لسانی تنظیم کا حملہ ہو چکا تھا اور رپورٹنگ سے کیمپ
اُن کے لیے کسی ایسے آدمی کا وجود تو بالکل ناقابلِ برداشت تھا جس کے دماغ
ان سے متعلق معمولی سا کیڑا بھی کلبلا سکے ۔۔۔ !

روانگی سے پہلے اُس نے اپنے "ڈیک" پر موجود ساتھیوں کو یہ فقرہ
کہا تھا کہ اگر کوئی اُلو کا پٹھا ریت میں اپنا سر چھپا کر یہ سمجھ لے کہ وہ طوفان
کے خطرے سے بچ گیا ہے تو اُس سے بڑا گدھا روئے زمین پر نہیں ہو سکتا

○

باباصاحب کو اُن کے سلیپنگ روم میں انسپکٹر شیر گل کے فرار کی خبر
سنائی گئی تھی۔ خبر سنانے والے کی خوش قسمتی تھی کہ اُن کو فون کا سہارا میسر تھا۔
اگر کوئی براہِ راست یہ خبر اُن تک پہنچاتا تو باباصاحب اُس کو فوراً جان سے
مار دیتے ۔۔۔ !

یہ مجرمانہ غفلت تھی ۔۔۔

ناقابلِ معافی جرم ۔۔۔

جس کسی سے بھی یہ جرم سرزد ہوا تھا اُس کی کم از کم سزا اذیت ناک موت
تھی۔ باباصاحب نہیں چاہتے تھے کہ مستقبل میں دوبارہ اُس مجرمانہ غفلت کا اعادہ
ہو ۔۔۔ اس "۵۹" پر درجنوں سرکاری ملازموں کا دماغ ٹھیک کرنے کے لیے
لایا گیا تھا اور اپنی سزا بھگت کر وہ یہاں سے واپس بھی گئے تھے۔

لیکن ۔۔۔

نہ کسی کو آنے کے راستے کا علم تھا نہ کسی کو جانے کے راستے کی خبر تھی۔ انسپکٹر
شیر گل نہ صرف زندہ نکل گیا تھا بلکہ اُس نے "۵۹" بھی دیکھ لیا تھا اور یہ بھی جان
لیا تھا کہ اس کا محلِ وقوع کیا ہے ؟

باباصاحب کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا ۔۔۔ !!

"کس کی غفلت سے ہوا یہ سب کچھ" ۔۔۔ انہوں نے فون پر دھاڑتے
ہوئے پوچھا۔

فون کرنے والے نے جواب میں ڈرتے ڈرتے انہیں ساری کہانی سُنا دی۔

باباصاحب نے فوراً بڑے بھائی سے فون ملانے کا حکم دیا اور بے چینی سے
خواب گاہ کے چکر کاٹنے لگے۔

اگلے ہی لمحے اُن کے خواب گاہ والے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس فون کی خصوصیت
یہ تھی کہ اس پر ہونے والی گفتگو کو کوئی ایجنسی ٹیپ نہیں کر سکتی تھی۔

انہوں نے بڑے بھائی کو فون پر کچھ ہدایات دیں اور استراحت کے لیے چلے
گئے۔ اُن کا حکم تھا کہ اب صبح سے پہلے انہیں بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

بڑے بھائی تھوڑی دیر بعد "۵۹" پر موجود تھے۔ اُن کی ملاقات تہ خانے
میں شیر گل والی کوٹھڑی میں بند دونوں "رضا کاروں" سے کرائی گئی۔ جن کے
جسموں پر ایک ایک چادر موجود تھی۔

بڑے بھائی کے حکم پر دونوں کو طبی ونگ کے رضا کاروں والے کپڑے پہنائے
گئے اور تالا توڑ کر باہر نکالا گیا۔

بڑے بھائی نے موت اور سزا کے خوف سے لرزاں دونوں کو تسلی دی اور
اپنے ساتھ چائے پلائی۔

دونوں طبی ونگ کے رضا کاروں کے لیے یہ سلوک بڑا ہی غیر متوقع تھا۔ وہ تو
خود کو کسی بڑی سزا کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے۔ دونوں کو احساس ہی نہ
ہو سکا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔

چائے نوشی کے بمشکل ایک منٹ بعد انہیں اپنے سر بھاری معلوم ہوئے اور پھر

ٹریننگ کیمپ

"یہ ہے تمہارا نیا پاسپورٹ اور رقم" ـــــ بڑے بھائی نے عارف میاں کی
ایک لفافہ پھینکا ـــــ !! تم کل کی فلائیٹ سے انڈیا جا رہے ہو۔ کچھ دن وہاں
موج میلہ کرو۔ تمہاری گھر والی جانے کب سے بانہیں پھیلائے تمہاری
"شکریہ بڑے بھائی!"

عارف میاں نے لفافہ اٹھا لیا۔

وہ آج شام ایک ہنگامی حکم پہ یہاں پہنچا تھا۔ جبکہ انسپکٹر شیر گل
فرار میں اس کی کوئی غلطی نہیں تھی بلکہ وہ وہاں موجود ہی نہیں تھا اس
نے اسے کچھ نہیں کہا تھا ورنہ "زندہ بچ رہنے والے ڈاکٹر" کی جگہ عارف میاں
ہو جانے والا ڈاکٹر" بننا پڑتا اور جلی ہوئی ایمبولینس سے دو کے بجائے تین
برآمد ہوتیں۔ فی الوقت انہیں شیر دل یا اس کی ایجنسی کی طرف سے کوئی ال
موصول نہیں ہوا تھا کہ وہ کوئی نوٹس لیتے۔

لیکن ـــــ

یہ کسی وقت بھی ممکن تھا ـــــ

لسانی تنظیم کا اصول تھا کہ جو کارکن کسی کامیاب آپریشن میں حصہ لے
کچھ مدت کے لیے منظر سے غائب کر دیا جاتا تھا۔ خصوصاً وہ کارکن جسے مجا

لیل جنس نے اپنے کیمپوں میں تربیت دی ہوتی۔ وہ یوں بھی تنظیم کا قیمتی اثاثہ تھے۔
لیے ان کا خاص خیال رکھا جاتا۔

عارف میاں کے گھر والوں کے وارے نیارے ہو گئے تھے ـــــ !!

صاحبزادے نے دنوں میں گھر کی حالت بدل کر رکھ دی تھی۔ حالت بدلی تو حالات
بھی بدلے اور کبھی نان جویں کو محتاج رہنے والے عارف میاں کے والدین کے اطوار
بھی بدل گئے۔ انہوں نے بھی امیروں والی عادتیں اپنانا شروع کر دیں۔

بھارتی مہمانوں کا آنا جانا عام لگا رہتا تھا ـــــ !

انہیں آم کھانے سے مطلب تھا اس لیے گٹھلیاں گننے کا تردد کبھی نہ کرتے۔
عارف میاں کے ابا کچھ کچھ سمجھنے لگے تھے کہ ان کے صاحبزادے نے بھی وہی کام
شروع کر دیا ہے جو ان کے دوسرے رشتہ دار کر رہے تھے اور یہ کوئی ایسی معیوب
بات بھی نہیں تھی تجارت تھی۔

دے دلا کر سب کر رہے تھے ـــــ !!

باقی کاروباروں میں کون سی ایسی ایمانداری اور اصول پسندی کارفرما تھی۔
اگر دیکھا جاتا تو زندگی کے اس حمام میں سارا شہر ہی ننگا تھا۔ پھر وہ کیوں پریشان
ہوتے۔

عارف میاں نے دہلی روانگی سے پہلے نوٹوں کی ایک گڈی اماں جان کو تھمائی
اماں کا چہرہ تمتما اٹھا۔ انہوں نے بے ساختہ بیٹے کی بلائیں لیں اور اس کے بازو پہ
امام ضامن باندھ کر اس کے ساتھ ایئر پورٹ کی طرف چل دیے۔

ایئر پورٹ کی عمارت سے جہاز کی سیٹ تک کا فاصلہ عارف میاں نے ایسے طے
کیا جیسے وی آئی پی کیا کرتے ہیں۔ کیا مجال جو کسی نے اس کا سامان چیک کیا ہو
ان کے ہاتھ میں وہ بریف کیس پکڑا تھا جس میں کچھ پیغامات اور اہم دستاویزات

موجود تھیں جو وہ رخصت بڑے بھائی نے بطورِ خاص انہیں دی تھیں اور کروہ کیسے تنہائی ہیں۔

کیا مجال جو کسی نے اس بریف کیس میں جھانکنے کا تکلف بھی کیا ہو۔

دہلی کے ہوائی اڈے پہ اس کا استقبال کرنے کے لیے "دوست" موجود تھے۔ انہوں نے عارف میاں کا استقبال ہیرو کی طرح کیا۔ مینا کشی تو بار بار چمٹ جاتی تھی اور اس کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ پتہ جانے کب سے اس نے عارف میاں کے سامنے آنسو بہانے کے لیے ذخیرہ کر رکھے تھے۔

عارف میاں مینا کشی پہ مٹے مٹے جاتے تھے۔

بات بات پہ اس کی بلائیں لیتے۔

جب مینا کشی نے انہیں یہ خبر سنائی کہ ڈاکٹروں کے مشورے کے خلاف بچے کے جنم سے اس کی جان کو خطرہ لاحق تھا اور اس کی مرضی کے خلاف گھر والوں نے اس کا حمل ضائع کروا دیا تو وہ باقاعدہ ہچکیاں لے کر رونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

یہ الگ بات کہ عارف میاں نے اس کا دل رکھنے کو کچھ اداکاری کے جوہر بھی دکھائے تھے اور اس پر بظاہر دلی رنج و غم کی تصویر بننے کی کوشش کی۔ جب کہ دل ہی دل میں انہوں نے اس پہ خدا کا لاکھ مرتبہ شکر ادا کیا تھا۔ اس مرحلے پر عارف میاں مینا کشی کے بطن سے اپنی "سنتان" پیدا کرنے کی خواہش نہیں رکھتے تھے۔

یوں بھی اب ان کے نزدیک عورت کا مصرف یہ نہیں رہ گیا تھا اور وہ اس سے اپنی محبت صرف اس کے جسم تک محدود رکھنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

کر گئے ہیں۔ "را" نے بڑی ہوشیاری سے مینا کشی کی شادی کا طوق ڈال دیا تھا۔ بریف کیس مینا کشی کے ساتھیوں نے سنبھال لیا تھا اور وہ لوگ کل صبح ملنے کا وعدہ کر کے دونوں کو مینا کشی کے فلیٹ پر چھوڑ گئے تھے۔

مینا کشی یہاں اکیلی تھی ——

اس نے عارف میاں کو بتایا کہ اس کے بھائی کی پوسٹنگ بمبئی میں ہو گئی ہے اور وہ اب یہاں اکیلی رہتی ہے۔

عارف میاں نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

اس درمیان عارف میاں اسے مسلسل یقین دلاتے رہے تھے کہ وہ بھی اس کے فراق میں تڑپتے رہے ہیں۔ ساری رات دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں گزار دی۔ دونوں اپنی محرومی کا بدلہ ایک دوسرے سے خوب خوب چکا رہے تھے۔

صبح مینا کشی اور عارف دیر تک گہری نیند سوتے رہے۔

عارف میاں کی آنکھ کھلی تو سورج کی روشنی فلیٹ کی کھڑکیوں پہ دستک دے رہی تھی اور اطلاعی گھنٹی بڑے شریفانہ انداز میں بج رہی تھی۔

مینا کشی بھی اس درمیان آنکھیں ملتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے عارف کو اپنی بیداری کا "ثبوت" دینے کے بعد سلیپر پہنے اور اپنا گاؤن سنبھالتی دروازے کی طرف چل دی۔ اس درمیان عارف میاں باتھ روم میں پہنچ چکے تھے۔ جہاں مینا کشی نے انہیں "دوستوں" کی آمد سے مطلع کیا۔

○

پندرہ بیس منٹ بعد وہ "دوستوں" کے درمیان موجود تھا۔

"میرا نام بھاٹیہ ہے —— !"

ایک ڈھلتی عمر کے گہری آنکھوں والے گنجے شخص نے سندھی لہجے میں اردو

بولتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"عارف ـــــ" عارف میاں بھاٹیہ کا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

دونوں کے درمیان معمول کی گفتگو ہوئی۔ اس درمیان بھاٹیہ کے ساتھ والے دونوں نوجوان خاموشی سے بیٹھے عارف کا جائزہ لیتے رہے۔ انھوں نے اب تک کسی قسم کی گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا۔

بھاٹیہ کی گہری اور پُراسرار آنکھیں اس قربانی کے بکرے کا وزن کر رہی تھیں اور دل ہی دل میں وہ شاید اس کی کوئی قیمت بھی لگا چکا تھا۔

"عارف میاں انقلاب تو آپ لوگوں نے خود ہی لانا ہے۔ ہم تو آپ کے دوست ہیں اور پس پردہ رہ کر ہی آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں بین الاقوامی دنیا میں ہمارا امیج ایک غیر جانبدار اور سیکولر ملک کا ہے۔ ہم کسی ملک کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ آپ پر یہ بات واضح کر دوں کہ آپ کی مدد کرنے کے لیے ہمیں حکومت کی طرف سے کوئی آشیرواد حاصل نہیں۔ یہ تو ہم کچھ لوگ جو ۴۷ء کے بعد ہجرت کر کے اُدھر آ گئے تھے۔ اپنے طور پر اپنے کو بروئے کار لاتے ہوئے آپ کی مدد کر رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ جلد از جلد آزاد ملک قائم کریں اور ہم سب دوبارہ مل جل کر اچھے ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کریں ـــــ میرا کہنے سے مطلب یہ ہے کہ ہم ساری دنیا اور اپنی کو ناراض کر کے آپ کے ساتھ دوستی نبھا رہے ہیں اور جواب میں اسی سلوک کی توقع رکھتے ہیں ـــــ میں آپ کو یہ سب کچھ اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ چند روز بعد ٹریننگ کیمپ میں جا رہے ہیں۔ جہاں آپ کی ملاقات اپنے دوسرے انقلابی سے بھی ہوگی اور ہم آپ کو چند ہفتوں میں اس قابل کر دیں گے کہ آپ پاک

آرمی کے ساتھ ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی طرح آہنی ہاتھوں سے نمٹ سکیں۔ لیکن اس مرحلے میں آپ پر یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ دوستی یکطرفہ نہیں رہنی چاہیے" ـــــ!!

بھاٹیہ نے ایک لمحے کے لیے رک کر سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیرتے ہوئے کن انکھیوں سے عارف کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔

وہ اس کھیل کا بہت پرانا کھلاڑی تھا ـــــ

اس کے ہاتھوں اب تک سینکڑوں پاکستانی نوجوان گمراہ ہو کر خطرناک تربیت اور ہتھیاروں سے لیس، اپنے وطن فروش لیڈروں کے اشاروں پر بندروں کی طرح ناچتے ہوئے اپنی دھرتی ماں کی آبرو سے کھیل رہے تھے۔

بھاٹیہ پاکستانی صوبہ سندھ کے امور پر ماہر سمجھا جاتا تھا اور تین اہم ترین تربیتی کیمپ براہِ راست اس کی نگرانی میں چل رہے تھے۔

"آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے" ـــــ اس نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

"عارف میاں جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اپنی ہمت سے بڑھ کر آپ کے ساتھ دوستی نبھا رہے ہیں لیکن ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ آپ کی کمانڈ کے لیے بھی یہ بات ناقابلِ برداشت ہوگی کہ ایک مرتبہ ہمارے ہاتھوں سے گزرنے اور اپنے چند ساتھیوں سے آشنائی کے بعد اگر آپ نے کبھی غداری کا تصور بھی کیا ـــــ میرا مطلب ہے اگر کہیں دُور دُور تک آپ کے ذہن میں یہ خیال ہے کہ یہاں سے تربیت حاصل کر کے واپس جانے کے بعد آپ پاکستانی انٹیلی جنس کے ساتھ مل جائیں گے یا اپنے کسی ساتھی کا انکشاف گرفتاری کی صورت میں کر دیں گے تو میں آپ کو یہ باور کروا دوں کہ آپ کے سارے خاندان کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر

مرنے پر مجبور کر دیا جائے گا ۔۔۔۔ آپ کے شہر میں کبھی کبھی جو پُراسرار لاشیں ملتی ہیں اُن
کی حقیقت سے آپ سے زیادہ اور کون آگاہ ہوگا کیونکہ اب آپ کا شمار لسانی تنظیم
کے ذمہ دار کارکنوں میں ہونے لگا ہے ۔۔۔۔ آپ کو ناصرہ نامی لڑکی کا کیس تو یاد
ہوگا جس کے بھائی کی غداری کی سزا اُسے ملی تھی اور بڑے بھائی کے حکم پر اسے
کے ساتھ کئی دنوں تک اجتماعی آبروریزی کے بعد اُسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے
پر مجبور کر دیا گیا تھا ۔۔۔۔ عارف میاں آپ بھی دو بہنوں کے بھائی ہیں اس
حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کیجیے ۔"

جب بھاٹیہ عارف میاں کو بظاہر ناصحانہ انداز میں سمجھا رہا تھا عارف کو اپنے
جسم میں خون کی جگہ خوف سرسراتا محسوس ہوتا تھا ۔

اس درمیان مینا کشی چلی گئی اور لوازمات کی ٹرالی کھینچتی اندر آ گئی ۔

بھاٹیہ نے دوبارہ اس موضوع کو نہیں چھیڑا تھا اب وہ لوگ معمول کی ہلکی
پھلکی گفتگو کر رہے تھے ۔

بھاٹیہ کا لب و لہجہ بدل گیا تھا اور اس کے دونوں ساتھی بھی اب شائستہ
تھے ۔ انھوں نے باتوں باتوں میں مختلف سوالات کر کے عارف میاں سے بہت سی
کام کی باتیں معلوم کر لی تھیں اور اس کی اکثر باتوں کو نوٹ بھی کرتے جاتے تھے ۔

آٹھ دس روز تک عارف میاں نے جی بھر کے گلچھرے اڑائے جس کے
بعد انھیں دہلی کے نواحی علاقے میں واقع ایک کیمپ میں بھیج دیا گیا ۔

اُن کی نو بیاہتا مینا کشی کو ہفتے کے آخری دو دن اپنے شوہر نامدار کے
ساتھ گزارنے کی خصوصی اجازت دی گئی تھی ۔

○

سجوار شاہ کے لیے کیپٹن مالک رام کو سمجھانا ناممکن ہو چکا تھا ۔

یہ شخص ہر کام اپنی مرضی اور منصوبے کے مطابق کرنے پر بضد تھا ۔ سجوار شاہ اگر
اُسے مشرق کی سمت لے جانا چاہتا تو چند قدم اُس کے ساتھ چل کر اچانک وہ اپنی سمت
تبدیل کر لیتا تھا ۔ اس کے چاروں ساتھی بھی ایک ایک کر کے سجوار شاہ کے پاس
پہنچ چکے تھے ۔

لیکن ۔۔۔۔

کیپٹن مالک رام نے اُسے سختی سے اس بات کی ہدایت کی تھی کہ وہ اُس
کے ساتھیوں کو اس کی قیام گاہ یا پناہ گاہ سے ہرگز آگاہ نہ کرے ۔ اس کی ہدایت
پر سجوار شاہ کو اس کے چاروں ساتھیوں کو چار الگ الگ ٹھکانوں پر رکھنا پڑتا
تھا اور بوقت ضرورت ہی وہ انھیں اپنے پاس بلاتا تھا ۔

جس ماحول میں پل کر سجوار شاہ جوان ہوا تھا وہاں ایسی صورت حال کا
تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ۔

اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات کرنے والوں کو وہ زمین میں زندہ گاڑ دیتا
تھا ۔ اس کے بعد کیپٹن مالک رام کی طرف سے ہر بات میں اپنی مرضی ٹھونسنا گویا
ناقابل برداشت تھا ۔

لیکن ۔۔۔۔

"وڈا سائیں" نے اُسے حکم دیا تھا کہ وہ آنے والے مہمان کی ہدایت کے مطابق
کام کرے گا اور اسے ناراض ہونے کا موقع نہیں دے گا ۔

"بچہ ! یہ ہمارے موالی ہیں ۔ قدم قدم پہ ہمارا سہارا بنتے ہیں ۔ جس بندے پہ بُرا
وقت آنے لگے اُسے ہم ان کے پاس ہی تو بھیجتے ہیں پناہ لینے کے لیے ۔ اور بچہ !
یہ جو ہمارا ٹھاٹھ باٹھ ہے ناں ۔۔۔۔ یہ بھی انھی کے دم قدم سے ہے ۔۔۔۔ بابا !
تم تو جانتے ہو کہ حکومت اور اس کے چمچے کس طرح ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے لگے ہیں ۔

ہم اکیلے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ـــــ بچہ! سو پچاس ڈاکو پیدا کر کے ہم ایک ز
اور منظم فوج سے ٹکر نہیں لے سکتے ـــــ اس کے لیے ہمیں کوئی مضبوط آسرا چاہیے۔
تم جانتے ہو کہ پارلیمان کا موڈ کیسا چل رہا ہے۔ اگر انھوں نے ہمارے سروں سے
اُٹھا لیا تو کوئی بھی ہاری کا بیٹا یہاں کا ایم پی اے یا ایم این اے بن کر ہماری گردن
دبوچ لے گا ـــــ بابا! ہم اتنا مہنگا اور جدید ترین اسلحہ کہاں سے خریدیں گے۔
جو سمگلنگ کا دھندہ ہے ناں۔ اس سے تو بمشکل ڈیرے کا خرچ چلتا ہے۔
سجوار شاہ! وڈیرے کے بیٹے ہو تو کچھ سیاست کے داؤ پیچ بھی سیکھ لو۔"

وڈا سائیں نے اُسے کہا تھا۔

سجوار شاہ کو وڈا سائیں سے اس لیے عقیدت نہیں تھی کہ وہ ان کے
آزاد ملک بنانے جا رہا تھا۔

اس کے لیے اب بھی کوئی قدغن نہیں تھی۔

وہ جب چاہتا، جو چاہتا، اپنی وڈیرہ شاہی کے بل بوتے پر کر گزرتا۔ سارا
گوٹھ میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے حکم کے سامنے دم مار سکے۔

یہاں کی انتظامیہ حکومت کی نمک خوار ضرور تھی۔ لیکن اس کی وفاداریاں سجوار
سے تھیں۔ سجوار شاہ اگر چاہتا تو کوئی آفیسر یہاں رہ سکتا تھا ورنہ کسی کی مجال
نہ تھی کہ یہاں چند دن بھی سرکاری آسرے پہ بسر کر سکے۔

جس کی بہو بیٹی کو وہ چاہتا، اغوا کر سکتا تھا۔

اُسے وڈا سائیں سے اگر کوئی مطلب تھا تو صرف اتنا کہ اس کے ذریعے
کا مال سرحد کے آر پار با آسانی آ جا سکتا تھا۔ اس کے پالتو غنڈے اور ڈاکو
کے حکم پر کوئی بھی کارنامہ انجام دینے کے بعد بھارت میں پناہ حاصل کر لیتے
اور حالات نارمل ہونے پر پھر واپس آ کر اس کے سامنے کتے کی طرح دم ہلا

تے تھے۔

سجوار شاہ کی زمینیں جانے کب کی بانجھ ہو گئی تھیں۔

جو زرخیز زمین تھی وہ اس کے بزرگوں کی عیاشیوں کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ اب
اس کا سارا دھندہ اغوا برائے تاوان، ڈکیتیاں اور سمگلنگ کے بل بوتے پہ چل
رہا تھا۔ اس نے کراچی اور حیدر آباد میں عالیشان کوٹھیاں بنوا رکھی تھیں اور گاؤں
میں اس کا ڈیرہ یورپ کے کسی بھی محل سے کم شاندار اور کم سہولیات کا حامل
نہیں تھا۔

اس ڈیرے پر "شکار" کھیلنے کی آڑ میں بڑے بڑے سرکاری اور درباری
عمال اکثر راتوں کو گھناؤنے کھیل کھیلا کرتے تھے۔

اس علاقے میں آنے والے ہر سرکاری افسر کے سامنے مالی اور جسمانی رشوتوں
کے اتنے بڑے انبار سجوار شاہ لگا دیا کرتا تھا کہ پھر وہ سائیں کا اندھا بن
جاتا تھا۔

ہوس میں ڈوبے، مجرمانہ ذہنیت کے حامل یہ افسران جو عارضی یا سفارشی
طور پر یہاں حکومت سنبھالتے تھے ذرا سا موقع ملنے پر اپنی اصلیت دکھا دیتے۔
انہوں نے تو سرکاری نوکریاں ہی اپنی محرومیوں کا بدلہ چکانے کے لیے حاصل
کی تھیں ـــــ!

سرحد پار سے "را" کی تربیت یافتہ فاحشائیں "وڈا سائیں" کے حکم پر فوراً
ان کے پہلو کو گرمانے کے لیے سجوار شاہ کے ڈیرے پر پہنچا دی جاتی تھیں جہاں
بے ضمیر فروش ہوس میں اندھے ہو کر اپنی حیوانی حس کی تسکین میں اتنے محو ہو جاتے کہ
انہیں اپنے مرتبے کا خیال آتا نہ ہی اس عہد کا پاس کرتے جو انہوں نے کرسی پہ بیٹھنے
سے پہلے حکومت اور خدا کے سامنے کیا تھا۔

"را" کی تربیت یافتہ فاختائیں ان کی سرکاری بھیجوں میں آزادی سے گھومتیں
اپنے جسم کے ان پجاریوں کے ذہنوں میں محفوظ سرکاری راز افشا کروالینے کے بعد
ملاقات کا وعدہ کرکے اپنا راستہ ناپتیں۔

یہ سارا گورکھ دھندا سجوار شاہ نے وڈا سائیں کے حکم پر پھیلایا تھا۔

لیکن ——

اس کے بدلے وہ اپنی تجوریوں کا منہ جس تیزی سے بھر رہا تھا اس کے لیے
یہ سودا اس کے لیے بہت سستا ہو گیا تھا۔

⊙

"آج ہم بہادل سے ملاقات کریں گے تاکہ کل اپنا کام کرنے کے بعد
چلے جائیں۔"

اپنے ساتھیوں کی آمد کے تین روز بعد جب انہیں مطلوبہ اسلحہ مل گیا تو
مالک رام نے سجوار شاہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے —— شام کو چلیں گے" —— سجوار شاہ نے

"ہم اس کے ڈیرے پر نہیں جائیں گے۔ اسے گوبھٹ ماچھی والے پر بلا

مالک رام نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

ایک لمحے کے لیے سجوار شاہ کا خون ضرور کھولا۔

لیکن ——

دوسرے ہی لمحے وہ نارمل ہو گیا۔

"بابا! یہ میرا علاقہ ہے۔ چڑیا میرے حکم کے بغیر پر نہیں مار سکتی۔ تمہاری
میری ذمہ داری ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ اس کے ڈیرے پر جانے سے کوئی قیامت
ٹوٹ پڑے گی" —— اس نے بڑے دھیمے لہجے میں مالک رام سے کہا۔

"سائیں! آپ کا بہت دھنواد! ہمیں آپ پر پورا پورا بھروسہ ہے لیکن ہم نہیں
چاہتے کہ ہماری وجہ سے آپ پر کوئی آنچ آئے —— میرے خیال سے آپ کو میری
تجویز پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے" —— مالک رام نے بڑی بے نیازی سے
جواب دیا۔

"ٹھیک ہے بابا۔ ٹھیک ہے" —— سجوار شاہ نے ہتھیار ڈال دیے۔

چند منٹ بعد سجوار شاہ کا خاص آدمی بہادل ڈاکو کے لیے ایک اہم پیغام لے
کر جا رہا تھا جس میں اسے شام کے بعد گوبھٹ ماچھی والے خضر اڈے پر پہنچنے کی
تلقین کی گئی تھی۔

سہ پہر کو اچانک ہی مالک رام کے کہنے پر سجوار شاہ کو روانگی کا پروگرام
بنانا پڑا۔

مالک رام ہی کی خواہش پر اس کے دو ساتھیوں کو دو مختلف راستوں سے
دو الگ الگ گدڑیوں کی شکل میں یہاں تک لے جایا گیا تھا۔

شام ڈھلے سب شیطان ایک جگہ جمع ہو چکے تھے۔

اس وقت بہادل کے سامنے کیپٹن مالک رام سجادل کے روپ میں موجود تھا۔
اس کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ شخص بھارتی فوج کا کیپٹن ہے۔

سجادل، ایک کاغذ پر پنسل کی مدد سے ایک نزدیکی جگہ سے گزرتی ریلوے
لائن کا نقشہ بنا کر بہادل کو سمجھا رہا تھا کہ یہاں سے پنجاب سے آنے والی ایکسپریس
نے کل شام کو گزرنا ہے۔

اس نے ریلوے لائن کے گرد نشانات لگا کر بہادل کو سمجھایا تھا کہ کس کس
جگہ وہ لوگ چھپیں گے؟

کہاں کہاں سے فائرنگ ہو گی؟

اگر مزاحمت ہوئی تو اس کا مقابلہ کس طرح اور کس حکمتِ عملی سے کیا جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کام مکمل ہونے کے بعد فرار کے لیے کس نے کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔

"سائیں بہت خطرناک کام ہے ــــ کہیں میرے ساتھی انکار ہی نہ کر دیں۔ بہت سے بے گناہ مارے جائیں گے۔"

مہاول کچھ گھبرا رہا تھا۔

"تمہیں ڈاکو کس نے بنایا ہے؟ تمہیں تو کوئی اٹھائی گیرا ہونا چاہیے تھا۔" سجاول نے اس کا تمسخر اڑایا تو مہاول کو طیش آگیا۔

"اپنی زبان بند کرو۔ اگر سائیں کا حکم نہ ہوتا تو ابھی تمہاری زبان کاٹ کر رکھ دیتا"ــــ اس نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

"بابا مہاول ــــ بابا چپ کرو ــــ تم حالات کو نہیں سمجھتے۔ ڈی سی بڑا اکھڑ بندہ ہے۔ بہت لمبے ہاتھ ہیں اس کے ــــ تمہارے دونوں گرفتار بھائیوں کو پھانسی لگوائے گا۔ اس کا تبادلہ کروانے کے لیے یہ کام ضروری ہے ــــ یہ سنبھالو اور بندے سجاول سائیں کے حکم کے مطابق کل وہاں چھپا دینا۔ سجاول اور اس کے ساتھی وہاں موجود ہوں گے"ــــ

سجوار شاہ نے معاملہ خود سنبھال لیا اور کرنسی نوٹوں سے بھرا ایک چھوٹا سا بیگ مہاول کی طرف بڑھا دیا۔

"ٹھیک ہے سائیں جو حکم"ــــ مہاول نے بددلی سے نوٹوں کا بیگ تھام لیا۔

⊙

لاہور سے کراچی جانے والی ایکسپریس معمول کے مطابق لیٹ تھی۔

جب ڈرائیور اس علاقے میں پہنچا تو آسمان پر تارے جگمگانے لگے تھے جبکہ انہیں شام سے پہلے کراچی ہونا چاہیے تھا ــــ لائن آگے کلیئر تھی ــــ

ڈرائیور نے رفتار معمول سے کچھ بڑھا دی تھی اور اب وہ انجن میں مستعد کھڑا باہر فضاؤں میں گھور رہا تھا۔

اچانک ہی اسے بریک کی طرف بادلِ نخواستہ ہاتھ بڑھانا پڑا کیونکہ کچھ آگے والا سگنل ڈاؤن نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ آگے کچھ رکاوٹ ہے۔

گاڑی ایک مرتبہ پھر رک گئی۔

جس جگہ وہ لوگ رکے تھے یہاں دور دور تک سوائے جھاڑیوں اور درختوں کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

سواریوں نے ایک مرتبہ پھر غصے سے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ قریباً تمام ڈبوں کی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ مسافر گردنیں باہر نکالے صورتِ حال کو سمجھنے میں کوشاں تھے کچھ لوگ گاڑی سے نیچے بھی اتر آئے تھے جب اچانک ہی ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

ریل کی پٹڑی کے دونوں اطراف سے ان پر گولیاں برسنے لگیں ــــ!

اچانک صورتِ حال نے مسافروں کو دہشت زدہ کر دیا۔ خوف سے چیختے چلاتے کچھ لوگ ڈبوں سے باہر چھلانگیں لگانے لگے اور کچھ ڈبوں کی سیٹوں کے نیچے دبک گئے۔

پندرہ منٹ تک مسلسل فائرنگ ہوتی رہی۔

اس کے بعد زبردست دھماکے ہوئے۔ حملہ آور راکٹ لانچر سے گولے پھینکنے لگے چار گولے پھینکے کے بعد دیگرے انجن میں لگے۔ ڈرائیور اور اس کا مددگار انجن کے ساتھ

ہڑبڑا کر جھٹک سے اُٹھ گئے۔

اس کے ساتھ ہی فائرنگ۔۔ رُک گئی۔

اب وہاں آسمان کا کلیجہ شق کرتی زخمیوں کی چیخ و پکار تھی یا پھر دم توڑتے

مسافروں کی بے بسی ـــــ!!

انجن کی آگ دوسرے ڈبے تک منتقل ہو چکی تھی جہاں سے جھلستے مسافر

دیوانہ وار باہر چھلانگیں لگا رہے تھے۔

چاروں طرف کہرام برپا تھا ـــــ!

حملہ آور جس طرح یہاں پہنچے تھے اُسی طرح خون کی ہولی کھیل کر واپس لوٹ

روایت

شیر گل کی اچانک گمشدگی بجمہ کے قتل اور لسانی تنظیم نے گو کہ "ایجنسی" کے لوگوں

کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا، لیکن اُنہیں ابھی تک اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر

شیر گل کہاں غائب ہو گیا۔

لسانی تنظیم میں موجود ایجنسی کے ایک "سورس" نے یہ اطلاع تو پہنچا دی تھی کہ

وہ لوگ شیر گل کو اغوا کر کے اسے سبق سکھانے کے لیے یہاں لائے تھے لیکن یہ بھی

تصدیق کر دی تھی کہ وہ جان بچا کر نکل گیا ہے۔

وہ کے باہر کیا واقعات پیش آئے۔

اس سوال کا حتمی جواب ابھی ان لوگوں کو نہیں مل رہا تھا ایک خیال یہ بھی تھا کہ

فرار ہوتے ہوئے شیر گل کہیں تنظیم کے رضا کاروں کے ہاتھوں نہ مارا گیا ہو؟

لیکن ـــــ

ابھی تک اس مفروضے کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔ جب تک وہ لوگ اس کی لاش

اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتے وہ اس بات پہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔

اس دوران شہر کے مختلف کونوں کھدروں سے ملنے والی پُراسرار لاشوں پہ

ایجنسی نے کڑی نظر رکھی تھی اور معمول کے مطابق جب بھی کوئی بے شناخت لاش جس

پہ جگہ جگہ تشدد کے نشانات موجود ہونے ملتی، ایجنسی کے لوگ بطور خاص اس ہسپتال

میں اس خیال سے اس کی شناخت کے لیے جانے کہ شاید یہ انسپکٹر شیر گل کی لاش ہی نہ ہو ــــ ؟

آج پندرہ دن ہونے کو آرہے تھے لیکن اس کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا ــــ !!

اس کے رشتہ داروں کا کہنا تھا کہ اگر زندہ ہوتا تو اپنی بہن کے جنازے پر ضرور آتا۔

شیر گل کی والدہ کی طرف سے اعلیٰ حکام کا دروازہ کھٹکھٹانے کا سلسلہ جاری تھا وہ "ایجنسی" کی طرف سے مایوسی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کا اصرار بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ زندہ یا مردہ اس کے بیٹے کی اطلاع اُن لوگوں کو ضرور ملنی چاہیے۔

ایک سرکاری ملازم کا اس طرح یکایک غائب ہو جانا چپ چاپ نظر انداز کر دینے والی بات بھی نہیں تھی۔

اس روز جب ایجنسی کے افسران کی ایک ٹیم اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں شیر گل کی برادری کے لوگ اس مسئلے کو پولیس کے ذریعے زیادہ ہوا نہ دینے لگیں انہیں سمجھانے اور اس کی بہن کا پرسہ کرنے کے لیے اس کے گھر پہ پہنچی تو شیر گل کا چاچا زمان اپنے رشتہ داروں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

ایجنسی کے افسر اعلیٰ نے بچہ کی شہادت پہ اظہار افسوس کرتے ہوئے جب ان لوگوں سے کہا کہ وہ قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور دیں گے تو اچانک ہی خان زمان کے غیر متوقع جواب نے اسے بوکھلا دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں جناب ــــ ! یہ بوجھ ہماری گردن پہ ہے۔ ہم اسے جانتے ہیں۔ آپ براہ مہربانی جس طرح بھی ممکن ہے شیر گل کی زندگی یا موت کا پتہ کریں تاکہ ہم ذہنی طور پہ ایک راہ لگ سکیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے اچانک غائب ہو جانے پہ ہمیں کس قدر پریشانی لاحق ہو گی ــــ" ریٹائرڈ صوبیدار خان زمان نے کہا۔

افسر اعلیٰ صاحب چند ثانیے تک تو اس کی طرف حیرانگی سے دیکھتے رہے پھر اچانک ہی سنبھل گئے۔

"ہماری کوشش جاری ہے۔ آپ خود ریٹائرڈ فوجی ہیں، صورت حال کو بہتر سمجھتے ہوں گے ــــ یہ تو ممکن نہیں کہ اپنے ایک افسر کی اس طرح اچانک گمشدگی پہ ہم ہاتھ پیر باندھ کر بیٹھ جائیں گے۔ ــــ یہ سرکاری معاملہ ہے خان صاحب! ہم سے زیادہ اس کی سنگینی سے اور کون باخبر ہو گا ــــ آخر وہ ہمارا ہونہار آفیسر ہے۔ اگر اس طرح سرکاری افسران اغوا ہونے لگیں تو ......"

اپنی بات اس نے ادھوری چھوڑ دی تھی اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کہے؟ اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے اُسے مناسب الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔

"بہرحال آپ کا شکریہ ــــ" صوبیدار خان زمان نے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اپنے دفتر پہنچ کر افسر اعلیٰ نے ایک انسپکٹر کو بطور خاص ہدایت کی تھی کہ وہ صوبیدار خان زمان پر خصوصی نظر رکھے۔

"مجھے اس بوڑھے فوجی کے ارادے ٹھیک نظر نہیں آتے۔" اس نے اپنے ماتحت کو رازداری سے سمجھایا۔

○

شیر گل کا جسم تو زخموں سے چور چور تھا ہی ــــ لیکن بچہ کی موت کی خبر نے اسے اندر سے بھی توڑ کر رکھ دیا۔

اُسے اپنا چھ فٹ کا وجود ریت کی طرح بکھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی بہن کی شہادت

کی خبر اُسے اخبارات کے ذریعے ملی تھی۔ وہ رہ رہ کر یہ پچھتاوا اُس کی جان کو آ گیا تھا کہ آخری لمحات پر اُس نے اپنے دل کی بات کیوں نہ مان لی۔

کوئی طاقت اُسے بار بار احساس دلا رہی تھی کہ اُس کی بہن کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے اور وہ اُس کی مدد کو نہ پہنچ سکا ——!

وہ جسمانی طور پر اپنی بہن کے جنازے میں شمولیت کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

رات وہ "۵۱" سے فرار ہو کر سیدھا شہر کے جنوبی حصے میں اپنے ایک دوست کے پہنچا تھا جو ایک ادارے سرکاری محکمے میں ملازم تھا اور ایک سرکاری کالونی میں رہائش رکھتا تھا۔ اسی سبب شیر گل کو یہ امید ضرور تھی کہ وہ یہاں چند روز اطمینان سے گزار کر اپنی ذہنی اور جسمانی حالت کو معمول پر ضرور لا سکے گا۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ اُس کے بدن کی تمام ہڈیاں سلامت تھیں۔ اس عقوبت خانے سے نکلنے والا شاید وہ ایسا واحد خوش قسمت رہا ہو گا جو اپنے پورے سلامت جسم کے ساتھ جان بچانے میں کامیاب رہا۔

بے گناہ نجمہ کی موت نے اُسے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

ایک ایک لمحہ اُس پر قیامت ڈھا رہا تھا۔

وہ جانتا تھا اُس کی بہن کو بھائی کے جرم کی سزا دی گئی ہے۔ اُسے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ یہ لوگ اُس کی بہن کو قتل کرنے نہیں آئے تھے بلکہ اُسے اغوا کرنے کے لیے آ کر ڈرانا چاہتے تھے اور حملہ آوروں کے گھناؤنے عزائم کو سمجھتے ہوئے ہی اُس نے اپنی جان دے دینا احسن خیال کیا ہو گا۔

بہن کی موت کا جو جان لیوا پچھتاوا اُس کی جان کو آ گیا تھا۔ اُس سے نجات کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ اُس کے قاتلوں کو اپنے انجام تک پہنچایا جائے۔

لسانی تنظیم کے آگے مقامی انتظامیہ کی حیثیت کیا تھی؟

اس کا شیر گل سے زیادہ بہتر اندازہ کون لگا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا تعلق ایک حساس ایجنسی سے تھا جس کا کام ہی لسانی تنظیم کے مکروہ عزائم پر نظر رکھنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسی کی ایجنسی کے لوگ "نظر رکھنے" سے آگے کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ سیاست اور ہوسِ اقتدار کی آہنی فصیلوں کو عبور کرنا کسی بھی حساس ادارے کے دائرہ اختیار میں شامل نہیں تھا۔

"بابا صاحب" کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونے والے ہوسِ اقتدار کے اندھوں کی قطار لگی رہتی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ بابا صاحب ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے ہر کوئی اس کے چرن چھونے کو باؤلا ہوا جاتا تھا۔

لیکن ——

نجمہ کا خون رائیگاں نہیں جائے گا!

بالآخر اُس نے فیصلہ کن لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا جس کے ہاں اُس نے پناہ لے رکھی تھی۔

"شیر گل میں بھی تمہیں یہی کہنے والا تھا کہ سرکار دربار سے اپنی معصوم بہن کے خون کا حساب نہ مانگنے جانا۔ خواری اور ذلت کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ آج تمہیں اپنی روایت پر انحصار کرنا ہو گا —— اپنے دشمن سے بدلہ لینے کی روایت۔ اس دشمنی کی بنیاد ہم نے نہیں رکھی۔ ذلیل دشمن کو اگر تم سے کچھ شکایت تھی تو وہ تم پر حملہ کرتا۔ یہ بے غیرتی ہو گی اگر ہم اسے اپنی بہن کا خون معاف کر دیں۔ شیر دل ابھی تمہارے قبیلے کے جوان اتنے کمزور بھی نہیں ہو گئے کہ وہ نجمہ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے سرکاری اداروں کا سہارا ڈھونڈتے پھریں۔ میں بھی جانتا ہوں کہ لسانی تنظیم کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ تمہاری ایجنسی ہی کیا یہ حکومت بھی اس کے سامنے بے بس ہے، لیکن ہمیں مثال قائم کرنا ہو گی۔ ہمیں بتانا ہو گا کہ کم از کم ہم بے بس نہیں ہیں —— ہم میں ابھی اتنی غیرت...

باقی ہے کہ اپنی بے گناہ بہنوں کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکیں۔
کے ساتھی کا جوش و بدلی تھا۔

"ثابت خان۔ تم کسی بھی طرح جہاں زمان خان کو میرا پیغام پہنچا دو۔ ملاقات کی
لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ ایجنسی کے لوگ سائے کی طرح اُس کے پیچھے
ہوں گے۔ کہیں اُس کے تعاقب میں وہ مجھ تک نہ پہنچ جائیں۔ میں ابھی پیش نہیں
چاہتا۔ ثابت خان اگر یہ قرض چند روز تک میں نے نہ اتارا تو خدا کی قسم میں
مر جاؤں گا۔"

"تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں اپنا کام خوب سمجھتا ہوں۔"

اُس روز شام گئے ثابت خان سیر کرنے کے بہانے خان زمان تک پہنچ گیا۔
اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ شیر گل کا خدشہ ٹھیک ہے۔ یہاں دو پُراسرار چہرے
نظر آئے تھے۔ اُسے حیرانگی بھی ہوئی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا کہ ظالموں پر گرفت
کے بجائے ان لوگوں کو یہ فکر لگی رہتی ہے کہ کہیں مظلوم اپنا انتقام نہ لے لیں۔

گھر کے ایک کمرے میں اُس نے رازداری کے ساتھ خان زمان تک ساری
منتقل کر دی تھی۔ اور اُسے بتا دیا تھا کہ اُن لوگوں کی آپس میں ملاقات کس
ممکن ہے؟

"تم مطمئن رہو بچے! میں نے بھی پندرہ سال ملٹری انٹیلی جنس ڈیوٹی کی ہے۔
میں جانتا ہوں ہمیں کس طرح اور کہاں ملنا ہے۔"

اُس نے ثابت خان سے شیر گل کا ایڈریس لے کر اُسے اس نصیحت کے
ساتھ واپس بھیجا تھا کہ شیر گل کو فی الوقت اپنے گھر سے باہر نہ نکلنے دے۔

○

عائزہ پر ایک طرح سے جنونی کیفیت طاری ہونے لگی تھی ——

اس نے ابھی تک ذہنی طور پر اپنے والدین کے بزدلانہ فیصلے کو قبول نہیں کیا
تھا۔ اس کی بے گناہ اور پاکدامن سہیلی نے اُس کی آنکھوں کے سامنے اپنی عزت
کی [illegible] حفاظت کرتے ہوئے جان کا نذرانہ پیش کیا تھا اور وہ اُس کے جنازے میں بھی لسانی
تنظیم والوں کے خوف سے شرکت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ ایک سیدھی سادی لڑکی تھی جس کی زندگی کا مقصد تعلیم حاصل کر کے اپنے
والدین کا سہارا بننا اور وقت آنے پر اپنا گھر بسانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

لیکن ——

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اُس کی سوچ کا دھارا بدلنے لگا تھا۔

اُس کے اندر ایک نفرت سی پیدا ہونے لگی تھی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُس
درندے کا منہ نوچ لے جس نے اس کی آنکھوں کے سامنے اُس کی معصوم سہیلی کو
[illegible] اس جرم میں مار ڈالا کہ اُس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی جرأت کیوں کی؟
پہلے پہل تو وہ چپ رہی تھی۔ شاید ابھی وہ صدمے کی حالت سے گزر رہی
تھی۔ پھر اچانک ہی اُس میں ایک تبدیلی آئی اور اُسے اپنے والدین کی بزدلی پر غصہ
آنے لگا تھا۔ اگلے روز تو اُس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس مسئلے پر اپنے باپ سے
باقاعدہ بحث بھی کر لی تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جو کچھ اُس کی آنکھوں نے دیکھا
وہ پولیس تک کس طرح پہنچائے۔ وہ چاہتی تھی کہ چیخ چیخ کر ساری دُنیا کو اس
گھناؤنے جرم کی خبر کر دے۔

لیکن ——

وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

اُس روز جب اچانک اُس نے اپنے والدین سے نجمہ کے گھر جانے کی ضد
شروع کی تو وہ پریشان ہو کر رہ گئے۔

"بیٹی تم صورتِ حال کو جاننے کے باوجود بالکل بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ یہ تو بالکل ایسی ہی خواہش ہے جیسے کوئی بچہ آسمان سے چاند توڑ لانے کی ضد کرنے لگے۔"

اس کے بوڑھے اور جہاندیدہ باپ نے اُسے صورتِ حال کی نزاکت کا احساس دلانا چاہا۔

"ابا میاں ایک تو آپ نے مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ بلوایا۔ قاتلوں کو مظلوم بنوایا اور اب اپنے ضمیر کی خلش مٹانے کے لیے آپ مجھے اپنی مرحومہ سہیلی کی والدہ کے گھر جا کر پرسہ کرنے سے بھی روک رہے ہیں یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کیا ہم سب نے کل خدائی عدالت میں نہیں جانا۔ یہی ہے آپ کی تربیت! کا رونا آپ ساری زندگی روتے آئے ہیں۔"

وہ پھٹ پڑی۔

"چپ کر جا لڑکی۔ خدا کے لیے خاموش ہو جا۔ اگر تیرے باغیانہ خیالات کی بھنک بھی اس گھر کی دیواروں سے باہر نکل گئی تو زمین ہم پر تنگ ہو جائے گی۔ بیٹی تجھے ثریا کی کہانی شاید بھول گئی ہے۔ اُس نے یہی جرم کیا تھا۔ اُس نے بھی صرف اغوا کاروں کی شناخت کی تھی۔ اس کے بعد کس طرح اجتماعی [illegible] کے بعد اُس کی مسخ شدہ لاش گھر کے دروازے کے سامنے پھینکی گئی تھی۔ بیٹی! اُس کا باپ آج تک پاگل بنا سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہے۔ سارا [illegible] جانتا ہے کہ اس کی بیٹی کے ساتھ کس نے کیا ظلم کیا۔ لیکن کسی کی جرأت ہے [illegible] کے خلاف منہ کھولے ـــــ بیٹی ہم بے چارے تو خیر کسی قابل ہی نہیں لیکن [illegible] لوگ اپنی حفاظت کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ بھی گونگے اور بہرے بنے ہوئے [illegible] بیٹی! میں بھی جانتی ہوں کہ اس بڑھاپے میں جب کسی بھی لمحے خدا کے

کا بلاوا آ سکتا ہے ہمیں قوانینِ قدرت کو چیلنج نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اتنا بڑا جھوٹ بولنے پر تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہیے تھا، لیکن تمہارے سچ کی قیمت کیا ہوتی؟ ـــــ شاید تم اس کا اندازہ نہ کر پاتی۔ تمہارے اکلوتے بھائی کو یہ درندے کتے کی موت مار ڈالتے اور ہم سب کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کر دیتے ـــــ کیا تمہیں یہ سب کچھ گوارا ہوتا؟ کیا تم ثریا جیسے انجام کا تصور بھی کر سکتی ہو ـــــ؟"

عارفہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دی۔

"لیکن امی جان اُن لوگوں کو ہمارے تعزیت کے لیے جانے پہ کیا اعتراض ہو گا۔" اس نے روتے ہوئے پوچھا۔

"اسے بغاوت سمجھا جائے گا۔ بیٹی! وہ سمجھیں گے کہ تمہارا دماغ خراب ہونے لگا ہے اور کسی بھی لمحے تم سچ کہہ سکتی ہو۔ اس طرح تو تمہارے سارے کیے کرائے پہ پانی پھر جائے گا۔"

امی جان کی بجائے ابا میاں نے جواب دیا۔

○

عارفہ نے ایک مرتبہ پھر دل پہ پتھر رکھ لیا تھا ـــــ

وہ جانتی تھی کہ جو بغاوت اس کے اندر جنم لے رہی ہے اس کی قیمت اُسے اکیلے ادا نہیں کرنی پڑے گی۔ سارا خاندان اس عذاب کا شکار ہو گا۔

پانچ چھ روز بعد اُس نے بالآخر کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح گھر بیٹھے رہنے سے تو اب اُسے وحشت ہونے لگی تھی۔

عارفہ کے لیے یہ تجربہ بڑا حیران کُن تھا کہ کالج میں کسی بھی لڑکی نے کھل کر ثمر کی حمایت کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ کسی نے اس کو احساس نہیں دلایا تھا کہ اس نے بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔

لسانی تنظیم کے سٹوڈنٹ ونگ کی تین چار لڑکیوں نے جو لپتے "کارنامولا" کی وجہ سے کالج میں خاصی شہرت رکھتی تھیں البتہ اُس کو "مجرموں کو بے نقاب کرنے" پر مبارک باد دیتے ہوئے اُس کا حوصلہ بڑھایا تھا اور اُسے بتایا تھا کہ لسانی تنظیم کی اعلیٰ کمان اس کے اس جرأت مندانہ بیان پر بہت خوش ہوئی ہے اور اب سے اس کا شمار تنظیم کے خاص وفاداروں میں ہونے لگا ہے۔

عارفہ کے لیے یہ نئی مصیبت آگئی تھی۔

یہ تو وہ جانتی تھی کہ اس طرح حیلوں بہانوں سے یہ لڑکیاں اُس کی نیت میں آنے والے کسی بھی فتور سے آگاہ ہونے کی سعی لاحاصل کر رہی ہیں۔

یہ اطلاع کہ وہ "تنظیم کے وفاداروں" میں شامل ہو گئی ہے، اس کے لیے خطرے کی گھنٹی ضرور بن گئی تھی۔

اگر خدانخواستہ تنظیم کے کسی بڑے نے اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کر دی تو وہ کہیں کی نہیں رہے گی۔

ان ہی پریشان کُن سوچوں کے ساتھ آج وہ کالج سے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اس شہر پر موسم بھی چند دنوں سے بڑا عجیب اُترا تھا۔ اچانک ہی گھٹائیں لہرائیں اور چھا جاتیں۔ مینہ برسنے لگتا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ اچانک ہی آسمان بادلوں سے بھر گیا تھا۔ وہ اکیلی ہی تیز تیز قدموں سے بس سٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ جب اچانک ایک سڑک کا موڑ مڑتے ہوئے ایک موٹر سائیکل سوار اُس کے قریب آ کر رک گیا ـــ!

"آپ ـــ!" عارفہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں۔ میں ـــ" سوار جس نے اپنا چہرہ ہیلمٹ سے ڈھانپ رکھا تھا اب ہیلمٹ ہاتھ میں پکڑے اُس سے مخاطب تھا۔

"یہ شیر گل تھا ـــ!!

"مجھے افسوس ہے"..... عارفہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"دیکھو عارفہ۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں جانتا ہوں تم نے کس مجبوری کی حالت میں یہ بیان دیا ہو گا۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ اس طرح راستے میں کسی خاتون کو روک کر بات کرنا میرے نزدیک بھی انتہائی معیوب ہے۔ میری تم سے صرف ایک درخواست ہے کہ اگر تم قاتلوں کو پہچانتی ہو تو اُن کی شناخت مجھے بتا دو"

شیر دل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نجمہ کا خون غنڈے ذاکر نے کیا تھا" ـــ عارفہ پھٹ پڑی۔

خدا جانے وہ کب سے اس لمحے کی منتظر تھی۔

اُس نے لسانی تنظیم کے طلبا ونگ کے ان تمام غنڈوں کی نشاندہی کر دی جنہیں وہ پہچانتی تھی۔

"شیر گل میں ایک کمزور لڑکی ضرور ہوں۔ میرے والدین کی بے بسی نے میرے منہ پر تالے ضرور لگا دیے ہیں لیکن میرا ضمیر ابھی زندہ ہے ـــ اگر میں تمہارے کسی کام آ سکوں تو مجھے...."

"شکریہ۔ میری اگلی درخواست ہو گی کہ اس ملاقات کا تذکرہ تم زندگی میں کبھی بھی کسی سے نہ کرنا" ـــ شیر گل نے کہا۔

"میں تمہاری کامیابی کے لیے خدا سے دُعا گو ہوں" ـــ عارفہ نے جواب دیا۔ لیکن ـــ

اُس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی شیر گل نے موٹر سائیکل سٹارٹ کر دی تھی۔ آسمان اچانک اتنے زور سے دھاڑا کہ شہر نگاراں کے مکینوں کے دل دہل کر رہ گئے۔

خان زمان نے اچانک ہی کراچی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔!

افسرِ اعلیٰ کے سامنے ماتحت کی رپورٹ موجود تھی جس میں انکشاف کیا گیا تھا کہ خان زمان کل صبح سات بجے والی ٹرین سے اپنے گاؤں واپس جا رہا ہے تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔۔۔!

نجانے کیوں انہیں خان زمان کی طرف سے کسی نہ کسی مصیبت کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اس بوڑھے فوجی کے تیور اسے ہمیشہ خطرناک دکھائی پڑتے تھے۔

اس خبر نے ان کے سر سے ایک بوجھ اتار دیا تھا۔ اپنی تشفی کے لیے انھوں نے ایک انسپکٹر کو مستقل خان زمان سے چپکا دیا تھا جو اسے دو تین سٹیشن دور تک چھوڑ کر آیا تھا اور اب اس نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ خان زمان اس شہر کو چھوڑ کر جا چکا ہے۔

خان زمان نے واقعی شہر چھوڑ دیا تھا۔

لیکن۔۔۔

تعاقب کرنے والے کو علم ہی نہ ہو سکا کہ وہ کراچی سے حیدر آباد تک ہی گیا تھا جہاں وہ چپ چاپ ٹرین سے اتر گیا۔

عام درجے میں سفر کرنے کے سبب نہ کسی نے اس کے چڑھنے کا نوٹس لیا تھا نہ ہی اترنے کی پرواہ کی۔ ٹرین کا یہ ڈبہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور کسی کو کسی دوسرے کی فکر کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

حیدر آباد کے اسٹیشن پر اس کا ایک میزبان اس کا منتظر تھا۔!

دونوں چپ چاپ ایک رکشہ میں بیٹھ کر اپنے گھر تک آ گئے جہاں شام ڈھلے تک خان زمان نے آرام کیا۔

شام کے بعد کراچی جانے والے ایک ٹرک پر وہ ڈرائیور کے مددگار کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔ اس نے اپنا حلیہ بالکل ڈرائیوروں جیسا بنایا ہوا تھا۔۔۔!!

ٹرک اپنے معمول کے مطابق علی الصباح اڈے پر پہنچ گیا۔

ٹرک سٹینڈ پر کسی نے اس کی آمد کا نوٹس نہیں لیا۔

یہاں بھی ایک میزبان جو اس شہر میں ٹیکسی چلاتا تھا اس کا منتظر تھا۔ میزبان نے خان زمان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی ٹیکسی میں بٹھا کر میٹر ڈاؤن کر لیا۔ قریباً آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک سرکاری کالونی تک پہنچ گیا۔ اس کالونی کے ایک کوارٹر میں جس کے دروازے کے باہر ثابت خان کے نام کی تختی لگی تھی ٹیکسی رک گئی۔

زندگی آہستہ آہستہ بیدار ہو رہی تھی۔۔۔!

کالونی میں رہنے والے سرکاری ملازمین اپنے اپنے کام پر روانہ ہو رہے تھے۔ وہ سب بڑی افراتفری کے عالم میں دکھائی دے رہے تھے۔

کسی کو کیا پڑی کہ ثابت خان کے گھر کے باہر رکنے والی ٹیکسی سے اترنے مسافر کے متعلق کچھ سوچتا۔

اس کالونی میں ملک کے قریباً تمام صوبوں کے لوگ رہائش پذیر تھے اور مہمانوں کا آنا جانا یہاں اکثر لگا رہتا تھا۔

یوں بھی ثابت خان کوئی ایسا اہم شخص نہیں تھا کہ اس کے ہاں آنے جانے والوں کا کوئی نوٹس لیتا۔

کسٹم میں نوکری کی وجہ سے لوگ یوں بھی اس کی کچھ زیادہ ہی عزت کرتے تھے۔

ڈرائیور ٹیکسی کے اندر ہی بیٹھا رہا اور خان زمان اپنے استقبال کے لیے پہلے سے گھر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ دروازہ گھر کے ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا جس کے ایک صوفے پر شبیر گل اس کا منتظر تھا۔

دونوں نے گرمجوشی سے معانقہ کیا۔

دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں۔

دونوں کے دلوں میں طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔

اس طوفان کی شدت سے دونوں بخوبی آگاہ تھے۔

اُن کے سروں پر ایک بڑا بوجھ آن پڑا تھا۔ یہ بوجھ جب تک ان کے سر سے نہ اُترتا دونوں چین کی نیند نہیں سو سکتے تھے۔

"بے فکر ہو جاؤ بیٹا! ان بوڑھی ہڈیوں میں ابھی اتنی جان باقی ہے کہ ہم اپنی معصوم بچی کے خون کا حساب بے باق کر سکیں۔۔۔ خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں دشمنوں کو معاف نہیں کروں گا۔ بیٹا! میں تم سے اب بھی یہی بات کہوں گا کہ ضد چھوڑ دو۔ تم نوجوان ہو تمہیں ابھی بہت عرصہ زندہ رہنا ہے۔ تم پر بہت ذمہ داریاں ہیں۔۔۔ میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ یا مجبوری نہیں ہے۔۔۔ تم اپنی لڑکی کے پاس جاؤ اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔" بوڑھے خان زمان نے کہا۔

"ناممکن چاچا! ناممکن! میں جانتا ہوں یا خدا کی ذات کہ گزشتہ آٹھ دس دنوں میں کسی ذہنی عذاب سے گزر رہا ہوں جب تک اپنے ہاتھ سے قاتلوں کا گلا نہ گھونٹوں گا۔۔۔ مجھ پر کھانا اور نیند حرام رہے گی۔"۔۔۔ شیر گل کی آنکھوں میں خون جھلک رہا تھا۔

خان زمان کی جہاندیدہ نظروں نے اس کے سینے میں انگڑائیاں لیتے طوفان کو پڑھ لیا تھا۔ وہ بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ جب تک نجمہ کے قاتل کیفر کردار تک نہیں پہنچیں گے شیر گل کو سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔

شیر گل کو اس مرحلے پر سمجھانا بیکار تھا۔۔۔!!

"میں فارغ نہیں بیٹھا۔ میں نے ذاکر کے ٹھکانے تلاش کر لیے ہیں بیٹا!"

جتنی جلدی ممکن ہو جائے اتنا ہی بہتر ہوگا"۔۔۔ شیر گل نے اُسے بتایا۔

"تم شاید ساری رات جاگتے رہے ہو۔۔۔ تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ شام ڈھلے پہلے مجھے ایک نظر ان ٹھکانوں کا جائزہ لینا ہے۔ جس کے بعد حکمتِ عملی طے کریں گے۔"

بوڑھے فوجی نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

اس دوران ثابت خان نے جس کے بچے کچھ دنوں سے اپنے آبائی وطن گئے ہوئے تھے ان دونوں کے لیے ناشتہ تیار کر لیا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہونے پر شیر گل نے ایک کاغذ اپنے اور خان زمان کے درمیان پھیلایا تھا جس پر لکیریں کھینچ کر وہ اُسے ذاکر سے متعلق اپنے طے کردہ پلان سے آگاہ کر رہا تھا۔ ثابت خان اس دوران اپنی ڈیوٹی پر جا چکا تھا۔

خان زمان کے ماتھے پر کئی سلوٹیں اُبھر آئی تھیں۔

وہ ان لکیروں کی جزئیات پر غور کر رہا تھا۔ ایک ایک نقطے کی وضاحت اس نے شیر گل سے طلب کی تھی۔

راستے جن کی نشاندہی اس نے کی تھی سے متعلق مکمل تفصیلات اس نے پوچھی تھیں۔ ان راستوں کو ملنے والے راستوں سے متعلق جانا تھا۔ بالآخر اس نے اپنے ہاتھ سے دو نشان لگائے تھے۔

"یہ وہ محفوظ مقام ہیں جہاں سے باآسانی فرار ممکن ہے"۔۔۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے"۔۔۔ شیر گل نے اُس کے فیصلے پر صاد کر دیا۔

دونوں دوسرے کمرے میں سستانے کے لیے چلے گئے۔

دونوں ہی دیر گئے تک بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ بالآخر انہیں اونگھ آ ہی گئی۔

ثابت خان کی آمد سے پہلے دونوں تیار بیٹھے تھے۔

سہ پہر کو شیر دل اور خان زمان دونوں ایک ٹیکسی لے کر نکل گئے۔ ٹیکسی [illegible]
کے ایک ساتھی کی تھی جسے شیر گل ڈرائیور کے روپ میں چلا رہا تھا اور خان زمان [illegible]
سواری کی صورت میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔

تین گھنٹے تک وہ ٹیکسی کو شہر کی مختلف سڑکوں پر گھماتے رہے۔ اس
درمیان متعدد مقامات پر رک کر بوڑھے فوجی نے ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے صورتحال
کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ آنے جانے والے راستوں کی تفصیل مانگی تھی۔

تین گھنٹے بعد جب وہ ٹیکسی سٹینڈ پر واپس پہنچے تو دونوں ایک منصوبے پر
متفق ہو چکے تھے۔

○

اگلے روز چھٹی کا دن تھا

اس کالونی میں چھٹی کے دن اکثر لوگوں کے ہاں مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا
اس روز معمول کے مطابق ثابت خان کے بھی کچھ رشتہ دار یہاں جمع ہوئے تھے۔
ان کی تعداد قریباً دس تھی۔

دوپہر تک یہ لوگ ثابت خان کے گھر پر موجود ٹیلیفون پر مختلف پیغامات
سنتے رہے۔ بالآخر انہیں مطلوبہ ٹیلیفون آگیا۔

شاید یہ لوگ اسی فون کے منتظر تھے ۔۔۔!!

شیر گل، بوڑھا خان زمان اور اس کے دو ساتھی فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

روانگی سے پہلے ان سب نے مل کر کامیابی کی دعا کی۔

یہ لوگ دو مختلف ٹولیوں میں باہر نکلے تھے ۔۔۔!

ایک ویگن میں شیر گل، خان زمان اور ان کے دو ساتھی بیٹھے تھے جبکہ ان
کے تعاقب میں ایک ٹیکسی میں چار اور ساتھی آ رہے تھے ۔۔۔!!

آدھے گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ایک سڑک سے ملحقہ آبادی کے کونے میں ویگن
رک گئی۔ ٹیکسی اس سے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

ویگن کو رکتے دیکھ کر سگریٹ پان کی ایک دکان سے ایک نوجوان لمبے لمبے ڈگ
بھرتا ان کے نزدیک آ گیا۔ اس نے ویگن چلانے والے سے اس طرح اچانک ہاتھ
ملایا تھا جیسے راہ چلتے اچانک کسی شناسا سے ملاقات ہو جائے۔

"کوٹھے پر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ موجود ہے۔ ابھی واپس چلا جائے گا۔
دونوں اس کار میں آ سکتے ہیں" ۔۔۔ اس نے سڑک کے دوسری طرف ایک کونے
میں کھڑی سفید رنگ کی شیراڈ کی طرف اشارہ کیا اور آگے نکل گیا۔

"چلو" ۔۔۔ پچھلی سیٹ سے خان زمان نے سرگوشی کی۔

ویگن آگے کی طرف رینگ گئی۔

"گاڑی کو الٹے ہاتھ لے جا کر تھوڑا آگے پارک کر دو" ۔۔۔ دوسرا حکم ملا۔

ویگن ڈرائیور نے اطاعت کی۔

ٹیکسی ان کے تعاقب میں تھی لیکن یہ لوگ وہاں سے ہٹ کر مخالف سمت کی سڑک
کے کنارے اس طرح کھڑے ہو گئے تھے کہ وقت آنے پر اپنے ساتھیوں کی مدد بھی کر
سکیں اور آسانی سے فرار بھی ہو سکیں۔

یہ کراچی کی جدید سہولیات سے آراستہ کالونی تھی جہاں عام آدمی پھٹکنے کا تصور
بھی نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن ۔۔۔

اس کالونی میں سب ہی شریف اور عزت دار لوگ نہیں رہتے تھے۔ زیادہ تعداد
[illegible] لوگوں کی تھی جن کا دھندا ہزاروں کو کروڑوں میں بدلنے والا تھا ۔۔۔!!
اس کالونی کے ایک عالی شان بنگلے میں پرائیویٹ کوٹھی خانہ بھی تھا جہاں سے

شہر کے رؤسا اور اعلیٰ افسران کو لذت کام و دہن میسر آتی تھی۔

لسانی تنظیم کے اکثر بڑوں کو بھی یہیں سے لڑکیاں سپلائی کی جاتی تھیں۔
کے طلبا ونگ کا لیڈر اور "بابا صاحب" کا چہیتا ذاکر بھی اس بنگلے کے ایک کمرے
داد عیش دینے آیا کرتا تھا۔

یہ بات وہ سب جانتے تھے کہ اس شہر میں ہوا بھی اُن کی مرضی کے
نہیں چل سکتی۔

لیکن ——

"بابا صاحب" کی خاص ہدایت تھی کہ غیر اخلاقی دھندوں میں ملوث ہونے
بہر طور رازداری کا اہتمام رکھا کریں۔ اسی لیے ذاکر بھی جب اس قحبہ خانے
تھا تو اپنی گاڑی سامنے والی سڑک پہ پارک کر کے پیدل آیا کرتا تھا تاکہ
آنے جانے کا کسی کو علم نہ ہو ——!!

شیر گل اور اُس کے ساتھیوں نے بڑی تگ و دو کے بعد پتہ چلایا تھا
کا سب سے کمزور پوائنٹ کون سا ہو سکتا ہے اور اس کی نظر انتخاب
ٹھہری تھی۔

ذاکر کی خصوصی داشتہ تلاش کرنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں
اس علاقے کے ٹیلی فون ایکسچینج میں موجود ان کی برادری کے "ایس ڈی او"
سے استفادہ کرنے کے بعد انہوں نے کوٹھی خانے کے ٹیلی فون ٹیپ کرنے کا
بھی کر لیا تھا۔

ذاکر عموماً دن کے اوقات میں یہاں آیا کرتا تھا۔ اُس کی داشتہ کے
پر شیر دل کے ساتھیوں نے کڑی نظر رکھی تھی اور اُس روز جب انہیں پتہ
کو ملا کہ ذاکر اپنی محبوبہ سے ملنے آ رہا ہے تو وہ سب سجدہ شکر بجا لائے۔

انہیں جو کچھ بھی کرنا تھا۔ آج اور ابھی کرنا تھا۔

⊙

ذاکر نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

اپنی حفاظت سے وہ کبھی غافل نہیں رہا تھا۔ وہ کبھی غیر مسلح اپنے گھر سے باہر نہیں
جاتا تھا۔ اس کے ساتھ دوست کے روپ میں کوئی نہ کوئی تنظیم کا غنڈہ ضرور چپکا رہتا تھا۔
اس کی کار میں ہر وقت دو جدید اسلحہ سے مسلح غنڈے موجود رہتے تھے۔

لیکن ——

اپنی معشوقہ سے ملنے کے لیے وہ اکثر مسلح جلوس کے بغیر ہی آیا کرتا تھا۔ یوں
بھی اس علاقے میں لسانی تنظیم کی اتنی دہشت قائم تھی کہ کوئی نظر اُٹھا کر بھی اس
کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

آج بھی وہ معمول کے مطابق اپنی حرام کاری سے فراغت کے بعد اپنے ساتھی
کے ہمراہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی کار کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ تو طاقت کا نشہ تھا کچھ
معشوقہ سے ملاپ کا خمار اور سب سے بڑھ کر اس شراب کا اثر جو اس نے اپنی
کے کوٹھے پہ پی تھی۔ وہ خود کو آسمان پہ تیرتا محسوس کر رہا تھا۔

گو کہ اس کے ساتھی نے بھی کسی حرام کاری میں کمی نہیں کی تھی لیکن اس کے
قائم تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ آج اس کے "باس" نے کچھ زیادہ ہی چڑھا لی
یا پھر یوں ہی آج وہ کچھ زیادہ ہی نشے میں دکھائی دے رہا تھا۔

"ذاکر بھائی، سنبھل کے"۔ اس کے ساتھی نے ذاکر کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر
صورت حال کی سنگینی کا احساس دلانا چاہا۔

"ابے چپ کر بزدل کہیں کے —— کسی سالے کی جرأت ہے جو ہماری طرف آنکھ
اٹھا کر بھی دیکھے —— سالوں کو بھون کر رکھ دوں گا!"

شراب کے نشے میں دُھت وہ اول جلول بکنے لگا ۔۔۔!

اس کے ساتھی کے لیے آج ذاکر بھائی کو سنبھالنا ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ غ
گنیمت تھی کہ آج چھٹی کی وجہ سے یہاں کوئی خاص رونق دکھائی نہیں دے رہی تھی
ویسے بھی یہ بڑی ماڈرن آبادی تھی جو کچھ بھی تھا یہاں چار دیواری کے اندر تھا ۔۔۔
صرف سناٹا اور خالی سڑکیں تھیں جن پر سے کبھی کبھی کوئی تیز رفتار گاڑی زن سے
گزر جاتی یا پھر کسی بنگلے سے برآمد ہوئے نوکر اور کار یں ۔۔۔!!

ہر بنگلے میں جدید اسلحہ سے لیس مسلح چوکیدار موجود تھا۔

لیکن ۔۔۔

بنگلے کے اندر ۔۔۔!

یہ لوگ بھی باہر جھانکنے کا تکلف کم ہی کیا کرتے تھے اور عموماً بنگلوں کے
سے ملحقہ اندر ہی چھوٹی سی چیک پوسٹ میں بند رہتے تھے اور اونگھتے رہتے تھے
بنگلوں کے مین گیٹ پر مضبوط تالے لگے ہوئے تھے گھنٹی کی آواز پر دروازہ
کھلنے سے پہلے یہ مستعد چوکیدار دروازے میں موجود سوراخ سے صورت کا
جائزہ لینے کے بعد ہی دروازہ کھولا کرتے تھے۔

ذاکر بھائی جسے شراب کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی تھی آپے سے باہر تھا
اُس نے اپنی جیکٹ کی جیب میں موجود پستول ہاتھ میں تھام لیا تھا اور
ساتھی کی منت سماجت کے باوجود اُسے دوبارہ جیب میں رکھنے سے

بڑی عجیب صورت حال تھی ۔۔۔!

اس کے ساتھی کے لیے نشے میں دھت ذاکر بھائی کو سنبھالنا مشکل ہو رہا
تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ اگر ذاکر بھائی نے ترنگ میں آکر فائرنگ شروع کر دی تو
مسئلہ کھڑا ہو جائے گا ۔۔۔!!

پولیس والے تو اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی بھاگ جائیں گے یا پھر انہیں
احترام سے محفوظ ٹھکانوں پر پہنچا دیں گے۔

لیکن ۔۔۔

"بابا صاحب" انہیں معاف نہیں کریں گے۔ بابا صاحب کا حکم تھا کہ اس علاقے میں
کوئی غنڈہ گردی کا مظاہرہ نہیں کرے گا کیونکہ یہاں کے مکین اُن کی پارٹی کا
بہت بڑا ذریعہ آمدن تھے ماہانہ لاکھوں روپے فنڈ کے نام پر اُن سے وصول
کیے جاتے تھے۔

اس علاقے کے بڑے بڑے سمگلر لسانی تنظیم کو باقاعدگی سے اپنی حرام کی
کمائی کا ایک چوتھائی حصہ بھیج دیا کرتے تھے گو کہ ان لوگوں کا سیاست سے کبھی
دُور کا واسطہ بھی نہیں رہا تھا۔

لیکن ۔۔۔

انہوں نے بابا صاحب کو کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنے علاقے میں تنظیم کے کسی
رُکن کی غنڈہ گردی برداشت نہیں کریں گے۔ بہرحال وہ شریف اور پُرامن شہری
تھے اور اپنے معمولات زندگی میں کسی طرح کی ہنگامہ آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

ذاکر بھائی کے ساتھی کو یہی فکر دامن گیر تھی کہ اگر خدانخواستہ ذاکر بھائی
نے ایک آدھ ہوائی فائر بھی کر دیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

اس نے کسی نہ کسی طرح ذاکر بھائی کے ہاتھ میں پکڑا پستول لے کر اپنی جیکٹ
کی جیب میں رکھ لیا تھا اور اب اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اُسے گاڑی کی
طرف لا رہا تھا ۔۔۔!!

ذاکر بھائی کا نشہ اچانک ہی ہرن ہو گیا تھا اور اس کے ساتھی کے
ہاتھ پاؤں بھی اس ناگہانی آفت سے پھول گئے تھے جو اچانک اُن پر آن

پڑی تھی۔

ویگن اس طرح اچانک اُن کے سروں پر نازل ہوئی تھی کہ کسی کو کانوں کان
خبر نہ ہو سکی۔ مضبوط ہاتھوں نے دونوں کو دبوچ کر بے بس کر دیا تھا۔ حملہ آوروں
نے انہیں اس طرح اور اتنی تیزی سے جکڑا تھا کہ وہ ڈھنگ سے ان کو کبھی
نہیں دیکھ پائے تھے۔

سڑک سنسان تھی۔۔۔

اکا دکا گاڑی جو یہاں سے گزرتی اس کے سواروں کے پاس اس ہنگامہ
کو دیکھنے کے لیے شاید وقت ہی نہیں تھا۔ یوں بھی خان زمان کی کمان میں اس
کے۔ انھوں نے اس برق رفتاری سے ایسا کام کیا تھا کہ شاید کسی کو کانوں
کان خبر نہیں ہوئی تھی۔

دونوں کے منہ ٹیپ سے بند تھے ان کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور
ویگن میں بے بس بھیڑوں کی طرح ڈھیر تھے۔

ویگن تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔

دوسری سڑک پر موجود ٹیکسی سواروں نے ویگن کی روانگی کا انتظار کیا پھر
اُن کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہی وہ لوگ اپنے محفوظ ٹھکانوں پر پہنچ چکے تھے
یہ ایک موٹر گیراج تھا جس کے ایک حصے میں گیراج کے مالکان رہائش پذیر
بھی تھے۔۔۔!!

چھٹی کی وجہ سے گیراج بند تھا۔

ویگن میں سے اُٹھ کر ایک سوار نے اُس کے مین گیٹ کا تالا کھولا اور
ویگن کو اندر لے گئے۔

دونوں زیرِ حراست درندوں کو جب ڈنڈا ڈولی کر کے باہر نکالا گیا تو ان
کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی تھیں ان کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو سکا کہ انہیں کس
راستے سے کہاں لایا گیا تھا۔ اور یہ لوگ کون ہیں؟

وہ تو ڈھنگ سے ان کی شکل بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔۔۔!!

دونوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر دیا گیا تھا اور علیحدہ علیحدہ کمروں
میں لے جایا گیا تھا۔ ذاکر کی آنکھوں سے پٹی کھلنے پر اُس کے منہ پر پانی سے
بھرا گلاس پھینک کر اغوا کاروں نے اپنا تعارف کروایا تھا۔

"تم نے اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ تم بچ نہیں سکتے۔ کتے کی موت مارے
جاؤ گے۔"

خان زمان اور شیر دل کی شکل پر نظر پڑتے ہی ذاکر نے غصے سے بے قابو
ہو کر بولنا شروع کر دیا۔

"شاید موت کے صدمے نے ابھی سے تمہارا دماغ کر دیا ہے۔" شیر گل کی
آواز میں جانے کیا قہر چھپا تھا کہ ذاکر کو ایک سنسنی اپنے سارے جسم میں دوڑتی
محسوس ہوئی۔

"پھر بھی مرنے سے پہلے تم جی بھر کے بکواس کر سکتے ہو۔ افسوس اس سے زیادہ
ہم تمہیں کوئی رعایت نہیں دیں گے۔ تم ایک بزدل اور بے غیرت دشمن ہو۔ تم نے
ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی کی جان لی ہے۔ اس لیے ہم سے کسی اچھی موت کی
توقع نہ رکھنا۔ میری خواہش تھی کہ تمہیں گولی مار کر تمہارا کام تمام کر دیا جاتا لیکن
نہیں۔۔۔ تم اس سے بڑی سزا کے مستحق ٹھہرے ہو۔ تمہارا انجام بہت بھیانک ہو گا۔
ایسے بے گناہوں کو محض اپنی طاقت کی نمائش کرنے کے لیے موت کی نیند
سلا دیا۔۔۔ تم بھی مرو گے۔ آج ہی مرو گے لیکن بہت بُری موت۔۔۔" شیر گل

چھنکارا اور ذاکر سہم کر رہ گیا۔

"میں اب بھی تمہیں یہی کہوں گا کہ تم مجھے جانتے نہیں.....“ ذاکر نے سنبھل کر

کہنا چاہا۔

"میں تمہیں جانتا ہوں ، تم جس ملک کا کھاتے ہو اسی کو ڈستے ہو، چند دولت اور

ہوسِ اقتدار میں اندھے حکمرانوں کو بیوقوف بنا کر اور قتل و غارت گری کا بازار گرم

کر کے تم شاید یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ اب تمہارے راستے کی تمام رکاوٹیں ختم ہو گئی ہیں۔

یاد رکھنا تم شال بن جاؤ گے ۔ ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جب ہم جیسے بے بس اور

انسان تم ایسے وحشی درندوں کو کچل سکتے ہیں تو حکومت تمہارے منہ میں لگام کیوں نہ

دیتی ـــــــ ؟“

بوڑھے خان زمان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

⊙

شیر گل اپنے افسرِ اعلیٰ کے سامنے موجود تھا ـــــــ !!

وہ آج صبح سیدھا دفتر پہنچا تھا ۔ دفتر پہنچنے پر اس کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔

افسرِ اعلیٰ کے حکم پر اس کا طبی معائنہ بھی کروایا گیا ۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق اس

پر بے پناہ تشدد کیا گیا تھا ـــــــ !!

شیر گل نے اپنی گمشدگی کی رپورٹ درج کرواتے ہوئے لسانی تنظیم کے ایک

ایم پی اے اور کونسلر پر الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے پانچ مسلح ساتھیوں کے

اُسے اغوا کیا اور "۹۰" میں لے جا کر اس پر تشدد کرتے رہے ۔

"انہیں اس بات کا غصہ تھا کہ میری معصوم بہن نے ان درندوں کی مزاحمت

کیوں کی اور وہ زندہ اُن کے ہاتھ کیوں نہیں لگی“ ـــــــ اُس نے اپنے بیان

شیر گل نے اپنے اغوا کی وجوہات میں مارکیٹ میں فائرنگ کے واقعے کی

بتایا اور کہا کہ اُسے تنظیم کی طرف سے وارننگ دی گئی تھی کہ اپنا تبادلہ کروا کر یہاں

سے ہمیشہ کے لیے چلا جائے ورنہ اُسے بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ ان لوگوں کو

اس بات کا غصہ تھا کہ میں نے نہ صرف اُن کے ناجائز احکامات کی تعمیل سے انکار کیا بلکہ ملزمان کی

شناخت کرتے ہوئے اُن کے خلاف مقدمہ بھی درج کروا دیا۔

شیر گل نے بتایا کہ اغوا کار اس پر پانچ چھ روز تک تشدد کرتے رہے ۔ اس

دوران انہوں نے اس کی بہن کے قتل کی خبر بھی اخبارات میں اُسے پڑھائی اور اس سلسلے

پر اُسے ذہنی اذیت کا شکار رکھا ـــــــ شیر گل نے بتایا کہ گزشتہ تین چار روز سے انہوں

نے اس پر تشدد کرنا بند کر دیا تھا اور اسے بتایا گیا تھا کہ کسی روز بھی مناسب موقع

دیکھ کر اسے گولی مار دی جائے گی ۔ اور اس کی مسخ شدہ لاش کسی گندگی کے ڈھیر

پر پھینک دیں گے ـــ !!

اس نے بتایا کہ اس کی خوش قسمتی تھی یا پھر قدرت نے ابھی اُسے زندہ رکھنا

تھا کہ اُسے فرار کا موقع مل گیا اور کل شام وہ اغوا کاروں کے چنگل سے نکل کر پہلے اپنے

گھر پہنچا اور رات گھر قیام کرنے کے بعد صبح یہاں رپورٹ کرنے آیا ہے ۔

افسرِ اعلیٰ اور شیر گل کے ساتھیوں نے اس کی جرأت پر اُسے داد دی ۔ اس کی بہن

کی اتفاقی موت پر دُکھ کا اظہار کیا اور اُسے یقین دلایا کہ جلد ہی قاتلوں کو کیفرِ کردار تک

پہنچایا جائے گا ـــــــ !

افسرِ اعلیٰ اور اُن کے ساتھی شیر گل کے لیے اپنے دلوں میں رحم اور ہمدردی

کے جذبات محسوس کر رہے تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ قاتل کون ہیں ؟

لیکن ـــــــ

قاتلوں پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت بھی نہیں رکھتے تھے ۔

"جناب والا ! میری صرف ایک خواہش ہے کہ مجھے اسی شہر میں خدمات پر مامور

رکھی جائے۔ میں اپنے ملک کے دشمنوں کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ ہم بزدل ہیں۔ میری
معصوم بہن نے اسی لیے قربانی دی ہے اگر میں میدان چھوڑ کر بھاگ گیا تو اس کی
روح کے سامنے شرمسار ہوں گا۔۔۔۔"

"تم بے فکر رہو شبیر گل خان۔ حکومتیں بہت دیر تک مصلحتوں کا شکار نہیں رہا کرتیں
میں تمہارے جذبات جانتا ہوں۔ میں حکومت سے تمہاری ترقی کی سفارش کروں گا۔
ایجنسی کو تو تم ایسے ذمہ دار اور محب وطن افسران پر ناز ہے۔ تم لوگ ہماری آبرو ہو
اور اپنی آبرو کی حفاظت ایجنسی کا فرض ہے۔۔۔۔"

افسر اعلیٰ خاصے جذباتی ہو رہے تھے۔۔۔!!

اُن کے حکم پر شبیر گل کو علاج معالجہ کی بہترین سہولتیں فراہم کی گئیں اور ایک
ہفتے کی رخصت کے ساتھ آرام کرنے بھیج دیا گیا۔ اپنے خصوصی اختیارات کے ساتھ افسر
اعلیٰ نے اس کی جرأت مندی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اس کی اگلے درجے
ترقی کی پرزور سفارش کر دی تھی۔

⊙

شبیر گل کی آمد کے تیسرے روز اچانک لسانی تنظیم کی طرف سے ایک ہنگامی پریس
کانفرنس کا اعلان کیا گیا۔

یہ پریس کانفرنس "باباصاحب" کے آستانے پر منعقد ہوئی تھی۔ جہاں حاضری دینے
کے لیے عمال حکومت کی قطار بندھی رہتی تھی۔ پریس کانفرنس شروع ہونے سے پہلے
ہی اخبارات کے نمائندے وہاں حاضر تھے۔ کوئی ایسا رپورٹر نہیں بچا تھا جسے اس کانفرنس
کی رپورٹنگ کے لیے طلب کیا گیا ہو اور وہ یہاں حاضر نہ ہو۔۔۔۔!!

باباصاحب کی آمد پر وہ سب اسی طرح احتراماً کھڑے ہوئے تھے جیسے قدیم دور میں
بادشاہوں کے دربار میں آمد پر مصاحب گردنیں جھکا کر کورنش بجا لایا کرتے تھے۔

باباصاحب کا موڈ بڑا خراب دکھائی دے رہا تھا۔۔۔!!

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے سامنے موجود گدھوں کو بیٹھنے کی تلقین کی۔
اور اُن کی زبان انگارے اُگلنے لگی۔

"میں پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ حکومت کی بعض ایجنسیاں ہمارے اور حکومت
کے درمیان موجودہ بہترین تعلقات کو سبوتاژ کرنے پر تلی ہوئی ہیں اور ہمارے نوجوانوں
کو اشتعال دلا کر غلط اقدامات پر مجبور کر رہی ہیں تا کہ وہ ہنگامہ آرائی کریں اور ان
کے ہاتھ کوئی بہانہ لگ جائے۔۔۔!!

اس کی تازہ ترین مثال تنظیم کے طلبا ونگ کے لیڈر ذاکر بھائی کا اغوا ہے۔
ذاکر بھائی اور ان کے ایک ساتھی کو حکومتی ایجنسی کے اہلکاروں نے دو دن سے اغوا
کر رکھا ہے۔ ان کی کار ہمیں ماڈرن کالونی کے باہر ملی ہے جس کی سیٹوں کی اکھاڑ پچھاڑ
اور دیگر حالات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ذاکر بھائی کو اغوا کر کے لے جایا گیا
ہے۔ ہم نے حکومت کو پہلے ہی وارننگ دی تھی کہ ان سرکاری ایجنسیوں کو لگام ڈالے
جو ہمارے اور حکومت کے تعلقات کشیدہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔۔ اگر ذاکر بھائی یا
ان کے ساتھیوں کے خلاف کوئی مقدمہ درج ہے یا کوئی الزامات ہیں تو قانونی طریقے
پر عمل کیا جائے۔۔ میں ایجنسی والوں کو وارننگ دیتا ہوں کہ اگر انہوں نے ۲۴ گھنٹوں
کے اندر اندر ذاکر بھائی اور اس کے ساتھیوں رہا نہ کیا تو طلبا پر قابو رکھنا ہمارے
بس سے باہر ہو جائے گا۔۔۔ میری وزیراعظم اور صدر سے درخواست ہے کہ وہ ان
لوگوں کے خلاف سخت ایکشن لیں جنہوں نے ہمارے آپس کے تعلقات خراب کرنے پر
کمر باندھ رکھی ہے۔

باباصاحب اتنے غصے میں اول جلول بک رہے تھے کہ کسی بے چارے رپورٹر میں
کوئی سوال کرنے کی ہمت ہی باقی نہیں رہی تھی۔

یوں دکھائی دیتا تھا جیسے ذاکر بھائی کے اغوا نے اُنہیں بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ غصے سے بابا صاحب کا چہرہ جس پر پہلے ہی بہت لعنت برس رہی تھی مزید بھیانک ہو گیا تھا۔ وہ حسبِ روایت بڑے جوش و خروش سے گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے قہر و غضب کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ابھی بابا صاحب کا بیان جاری تھا جب اچانک ہی اُن کے ایک پرانے ساتھی نے اُن کے کان میں کچھ کہا اور وہ اچانک اُٹھ کر ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔

"بابا صاحب ایک ضروری ٹیلی فون سُن رہے ہیں۔ آپ براہِ کرم تشریف رکھیے وہ چند منٹ میں آتے ہیں"۔۔۔۔۔ بتے بھائی نے فوراً کھڑے ہو کر وضاحت کی اور اخبار نویس پہلو بدل کر رہ گئے۔ ان بے چاروں میں سے کسی کی جرأت نہیں تھی کہ کانفرنس اُدھوری چھوڑ کر یا بابا صاحب کی طرف سے روانگی کی اجازت ملے بغیر یہاں سے چلا جائے۔

قیدی بن کے رہ گئے تھے بے چارے اخبار نویس۔۔۔۔۔!!

ایک دوسرے کی طرف کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے وہ بے بسی سے ہاتھ مل رہے تھے۔ ان کے مالکان کی سخت ہدایات موجود تھیں کہ لسانی تنظیم کو ناراض کرنے کا مطلب اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا تو ہے ہی۔۔۔۔۔ ساتھیوں کا معاشی قتلِ عام بھی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ معمولی سی غلطی پر تلملا کر اخبارات کے دفاتر پر حملہ آور ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بڑے اخبار کے دفتر کو اس جرم میں آگ لگا دی تھی کہ اس اخبار نے اُن کے ایک دوسرے درجے کے لیڈر کا بیان اندر کے صفحات پر لگایا تھا جبکہ اُسے حکم دیا گیا تھا کہ: بیان باہر کے صفحے پر لگایا جائے۔

اس ملک کی تاریخ میں وہ بے رحم لمحات بھی آئے جب اخبار مالکان نے اپنے ہی ایک ساتھی کو چھوٹا کہتے ہوئے (جس کے دفتر پر لسانی تنظیم نے حملہ کر کے ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا) بابا صاحب کے دربار میں پہنچ کر اُن سے باجماعت معافی مانگی تھی اور انہیں یقین دلایا تھا کہ آئندہ کم از کم اس شہر کے کسی اخبار میں ایک لفظ بھی شائع نہیں ہو گا جو اُن کے مزاجِ شاہانہ پر ناگوار گزرے۔

بابا صاحب نے اپنے آستانے پر آئے ان اخبارات کے مالکان کا معافی نامہ قبول کرتے ہوئے انہیں تلقین کی تھی کہ وہ صحافت کی اعلیٰ اقدار اپنائیں اور اپنی من مانیاں چھوڑ دیں۔ اُن کے نزدیک صحافت یہی تھی کہ ان کی تنظیم کے ہر حکم کی اطاعت بلا چوں و چرا کی جائے۔

اچانک ہی کانفرنس ہال سے ملحقہ دروازہ کھلا اور بابا صاحب کا لٹکا چہرہ برآمد ہوا۔

انہوں نے گہرے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی اس کے باوجود بیشتر اخبار نویس یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کی آنکھوں سے نکلتے انگارے سامنے بیٹھے بے چارے اخبار نویسوں کو بھسم کر کے رکھ دیں گے۔

"وہی ہوا جس بات کی میں نے نشاندہی کی تھی۔ ان لوگوں نے بڑی گھٹیا حرکت کی ہے۔ ذاکر بھائی کی مسخ شدہ لاش شہر کے ایک چوراہے پر پھینک دی گئی ہے۔ اُن کے ساتھی کی زبان اور ہاتھ کاٹے گئے ہیں اور وہ بے چارہ قریب المرگ ایک ہسپتال میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ میں حکومتی ایجنسیوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم ان حرکتوں سے اشتعال میں آنے والے نہیں۔ میں صدر اور وزیرِ اعظم سے درخواست کروں گا کہ ذاکر بھائی کے قاتلوں کو جلد از جلد کیفرِ کردار تک پہنچائے بصورتِ دیگر حالات کی خرابی کے ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے"۔۔۔۔۔

بابا صاحب قہر برسانے لگے ـــــ!!

اس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

بیٹے بھائی نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ ذاکر بھائی کی شہادت سے بابا
کو بہت دُکھ پہنچا ہے اور اُن کی طبیعت بگڑنے لگی ہے۔ ڈاکٹر ان کا علاج
کر رہے ہیں۔

"خدا کرے اب یہ موذی کبھی ٹھیک نہ ہو" ـــــ کئی اخبار نویسوں
دل سے بددعا نکلی۔

بہت سے اخبار نویس اپنی وفاداریوں کا ثبوت دینے کے لیے
کے گرد جمگھٹا لگا کر بابا صاحب کی صحت کا رونا رونے اور ذاکر بھائی
پر پُرسہ کرنے لگے۔ پھر ایک ایک کر کے اپنے دفاتر کو روانہ ہو گئے۔

○

ذاکر بھائی کی لاش بالکل اُسی حالت میں ملی تھی جس حالت میں لسانی
تنظیم کے ہاتھوں مرنے والے بے گناہوں کی لاشیں ملا کرتی تھیں۔

اس کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے اور چہرہ بھی قدرے مسخ ہو گیا
اس لاش کے گلے میں ایک خط پرو دیا گیا تھا جس میں ذاکر کی طرف سے
بے گناہوں کے قتل کا ارتکاب کیا گیا تھا، اور ایک ایک کے قتل کی ترتیب وار
تفصیلات بھی درج تھیں۔ ان میں سے بیشتر قتل بابا صاحب کے براہ راست
حکم پر اور باقی قتل اُن کے حواریوں کے احکامات پر کئے گئے تھے۔

یوں دکھائی دیتا تھا کہ اُسے کیفرِ کردار تک پہنچانے سے پہلے اس کی
تفتیش کی گئی ہے اور اس تفتیش کے دوران اُس کی طرف سے کیے
والے جرائم کی فہرست بھی اُس کے گلے میں لٹکا دی گئی تھی۔

ان تفصیلات کی ایک ایک کاپی ملک کے تمام مقتدر اخبارات و جرائد اور
سرکاری عمّال کو بھی روانہ کر دی گئیں اور انہیں کہا گیا تھا کہ مجرم کی طرف سے
اپنے قتل کرنے کا اعتراف، جس میں اس کے قاتل ہونے کے ثبوت بھی بتا دیے
گئے ہیں اس بات کی نشاندہی کے لیے کافی ہیں کہ لسانی تنظیم دہشت گردوں کا
ایک منظم گروہ ہے جو حکومت کو بعض سیاسی حوالوں سے بلیک میل کر کے اپنا اُلو
سیدھا کر رہا ہے اگر ان لوگوں کی طنابیں نہ کھینچی گئیں تو اس ملک میں لا اینڈ آرڈر
کا خدا ہی حافظ ہو گا ـــــ جن لوگوں نے ذاکر کو کیفرِ کردار تک پہنچایا تھا انہوں
نے حلفاً اقرار کیا تھا کہ ان کا تعلق کسی تنظیم سے نہیں لیکن انصاف کا تقاضا یہی تھا
کہ ذاکر کو قتل کر دیا جاتا۔

قاتلوں نے لکھا تھا کہ انہوں نے ذاکر کے ساتھی کو نشانِ عبرت بنا کر
چھوڑ دیا ہے تاکہ حکومت کو یہ یاد کرایا جائے کہ اگر وہ لوگوں کو انصاف نہیں
دے گی اور درندوں کو اسی طرح چھوٹ دی گئی تو لوگ مقتولین کا انتقام خود
لینا شروع کر دیں گے۔

اس شہر میں ایسی جرأت مند واردات اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی ـــ!
زبانِ خلق اس قتل کو ذاکر کے آخری شکار بے گناہ بچہ کی شہادت کا
شاخسانہ قرار دے رہی تھی۔

لیکن ـــــ

اخبارات پر سکوت طاری تھا۔

اخبارات میں اس حوالے سے وہی خبریں شائع ہو رہی تھیں جو لسانی تنظیم
جاری کرتی تھی ـــــ

افسرانِ اعلیٰ کے سامنے لاش کی مختلف زاویوں سے لی گئی تصویریں اور مرنے

والے کے اعتراف کی فہرست دھری تھی۔ اس کا ساتھی لسانی تنظیم کے ہسپتال میں پہنچ چکا تھا اور ابھی لمبے عرصے تک کوئی بیان کے قابل نہیں تھا۔ گو اُس کی حالت خطرے سے باہر تھی لیکن وہ اپنی کٹی ہوئی زبان اور ہاتھوں سے درگور ہو چکا تھا۔

حکومت کے دو اعلیٰ رابطوں نے اشاروں کنایوں سے افسرِ اعلیٰ سے حوالے سے بات کی تھی کہ کہیں یہ اُن کا "کارنامہ" تو نہیں؟

افسرِ اعلیٰ بے چارے سارا دن ٹیلی فون پر صفائیاں پیش کرتے رہے۔ شام کے بعد جب وہ دفتر میں آرام دہ کرسی پہ ڈھیر پڑے تھے تو اچانک ہی ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اُن کے ذہن پہ لپکا۔

"کہیں یہ اُس بوڑھے فوجی کا کارنامہ تو نہیں" ———

لیکن وہ تو کئی روز پہلے شہر سے جا چکا ہے۔ اُن کے ذہن نے جواب دیا۔

نجانے کیوں اُن کا دل اُن کے دماغ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

دال میں ضرور کچھ کالا ہے ——— وہ بڑبڑائے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے گھنٹی بجا کر اپنے ایک ماتحت کو طلب کیا۔

"فائل نمبر ۱۳ الف لے آؤ" ——— انہوں نے حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد فائل اُن کی میز پر موجود تھی ———!!

انہوں نے فائل میں درج تفصیلات اور اپنے ماتحت کی رپورٹ دوبارہ پڑھی۔ چند ثانیوں کے لیے کچھ سوچنے لگے۔

اچانک ہی انہوں نے اپنے آپریٹر کو صوبہ سرحد کے ایک شہر میں ایجنسی کے آفس کا نمبر ملانے کو کہا۔

پانچ منٹ کے بعد اُن کے میز پہ دھرے خصوصی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ صوبہ سرحد

شہر میں ایجنسی کا افسرِ اعلیٰ لائن پہ تھا۔ مقامی افسرِ اعلیٰ نے اُسے خان زمان کے ایڈریس سے آگاہ کرتے ہوئے جلد از جلد اس کی گزشتہ چند دنوں کی مصروفیات کی تفصیل مانگی۔ دوسری طرف سے اگلے روز شام تک تفصیلات بہم پہنچانے کے وعدے کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

افسرِ اعلیٰ کی ساری رات کروٹوں کی نذر ہو گئی ———!

وہ شیر گل خان کے بیان کی فائل اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے اور ایک مرتبہ پھر بڑی باریک بینی سے اُس کی طرف سے اپنے غائب رہنے کے جواز کا جائزہ لے رہے تھے ———!!

شیر گل بھی ایجنسی کا تربیت یافتہ تھا۔ کیا مجال جو اُس کے بیان میں ذرا سا بھی جھول موجود ہو۔ اُس نے بیان میں کوئی ایسی جزئیات نہیں لکھی تھیں جن کو شک کی بنیاد بنایا جا سکتا۔ بڑی کوشش کے بعد بھی افسرِ اعلیٰ اُس کے بیان میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں نکال سکے ———!!

گزشتہ دو روز سے شیر گل ایجنسی کی نظر میں تھا۔ اس کی حفاظت کے پیشِ نظر اُس پر کڑی نگرانی لگا دی گئی تھی۔ اس دوران اُس نے سوائے ایک مرتبہ ڈاکٹر سے ملاقات کرنے اور مقامی قبرستان میں اپنی بہن کی قبر پہ فاتحہ خوانی کے کچھ نہیں کیا تھا ——— باقی سارا وقت اپنی ماں کے ساتھ اپنے گھر پہ ہی گزرا تھا ———!!

انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ابھی تک وہ کسی فیصلے پر کیوں نہیں پہنچ سکے۔!!

اگلے روز سارا دن وہ بے چینی سے صوبہ سرحد سے رپورٹ کے منتظر رہے۔ شام گئے وہاں سے بذریعہ فیکس مشین آنے والی رپورٹ اُن کے سامنے رکھ دی گئی۔ اس رپورٹ کے مطابق اُس کے گاؤں کے لوگوں نے بیان کیا تھا کہ وہ پروگرام کے عین مطابق کراچی سے گاؤں پہنچا تھا اور یہاں معمول کی زندگی گزار رہا تھا۔ ابھی تک

اس کے متعلق کوئی غلط رپورٹ کسی تھانے میں درج نہیں کروائی گئی تھی۔
ایک بہادر فوجی تھا جس نے دو بڑی جنگوں میں حصہ لیا اور ایک جنگ میں
کے ایک اعزاز سے نوازا گیا۔ گاؤں کے لوگ اُس کی بے عزت کرتے تھے۔

افسرِ اعلیٰ کا جی چاہتا تھا اپنا سر پیٹ لے ــــــ!

اس رپورٹ کی صداقت پر اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بہت چالاک بوڑھا ہے کم بخت" ــــــ وہ بڑبڑائے۔

انہیں اب بھی اس واردات میں اس بوڑھے فوجی کا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔
اُن کے علم میں پہلے سے تھی کہ فوج میں بھی خان زمان نے بہت عرصہ تک انتہائی
ڈیوٹی کی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنے جرم کا کوئی معمولی سا ثبوت بھی
نہیں چھوڑا تھا۔

جس دلیری اور ہوشیاری سے اُس نے یہ واردات کی تھی وہ کسی عام آدمی
کے بس کی بات نہیں تھی۔

انہیں شیر دل کے گھر پر اس بوڑھے سے اپنی آخری ملاقات یاد تھی!
انہوں نے اس بوڑھے کی آنکھوں کو انتقام کے شعلے اگلتے دیکھا تھا۔ انہیں
حیرانی اس بات پر ہو رہی تھی کہ اس شخص نے کتنی صفائی سے کتنا خطرناک کام

مرحلے وفا کے

عارف میاں کی ٹریننگ کیمپ میں مکمل ہو گئی تھی۔

اُن کے انچارج سجاول نے انہیں بتایا تھا کہ اُن کی ملاقات شاید پاکستان میں
نہیں ہو جائے لیکن وہ اجنبی رہیں گے جب تک کہ "سجاول" خود نہ چاہے ــــــ!!

اس مرتبہ جب وہ پاکستان آنے لگے تو مینا کشی کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتے آئے۔
انہیں حکم دیا گیا تھا کہ انہیں مینا کشی کی حفاظت کرنی ہے اور اس کے ساتھ ہر ممکن
مدد بھی ــــــ!!

مینا کشی عارف کی دُلہن بن کر اسلامی نام کے ساتھ پاکستان آئی تھی۔

اب وہ مینا کشی نہیں مسز پروین عارف تھیں۔ ایسی شادیاں چونکہ عام سی بات ہے
اس لیے کسی نے خاص نوٹس نہیں لیا۔

پروین کو عارف میاں کے والدین نے کھلے دل سے قبول کیا تھا کیونکہ ایسی
بہو جس نے آتے ہی اُن کے گھر کو چار چاند لگا دیے تھے۔ چراغ لے کر
ڈھونڈنے پر بھی انہیں نہ ملتی۔

ایک عارف میاں ضرور تھے کہ کبھی کبھی جب وہ شراب اور شباب کے نشے سے
باہر آتے تو چند لمحوں کے لیے اُن کا ضمیر انہیں ضرور ملامت کرتا۔
لیکن ــــــ

جس لسانی تحریک سے اس کا رشتہ جڑ گیا تھا وہاں ضمیر نام کی چڑیا پر نہیں تھا۔ وہاں تو احکامات تھے اور ان کی تعمیل کرنا ہوتی تھی۔ بصورت دیگر زندگی بنا دی جاتی تھی۔

یہ لوگ اپنے کارکنوں کو پہلے ایسی عادتیں ڈال دیتے تھے جو ان کا نشہ بن جاتی تھیں اور وہ اچانک ایسی شاندار زندگی گزارنے لگتے تھے کہ پھر اس بھکڑ پن کی قیمت ادا کرنے پر تیار رہتے تھے۔

بابر اس کا بچپن کا دوست اور ہم جماعت تھا۔ دونوں اتفاق سے ایک علاقے میں رہتے تھے اور تین بلاک چھوڑ کر آصف کا گھر تھا۔ آصف اس لسانی تنظیم کے طلبا ونگ کا اہم کارکن تھا اور اس علاقے کی کمان بھی وہی کر رہا تھا۔

دونوں نے تنظیم کے حکم پر تین چار "کارنامے" بھی اکٹھے انجام دیئے تھے۔ حال ہی میں تنظیم کے ایک باغی کو "سزا" دینے کا اہم فریضہ بھی انجام دیا تھا۔

اس روز بنے بھائی نے جب اچانک عارف کو ایک ہنگامی میٹنگ میں بلایا تو مقامی سیکٹر انچارج بھی وہاں موجود تھا۔

بنے بھائی کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

"سالے کتے کے پلے۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے اب ہمیں آنکھیں دکھائیں، ڈاج کریں۔ سالے کو ایسی سزا دلواؤں گا کہ ساری زندگی یاد کرتا رہے"۔ بنے بھائی غصے سے چلایا۔

"کیا بات ہے بنے بھائی! کس نے جرأت کی تمہارے حکم سے سرتابی کی"۔ عارف نے بنے بھائی کے غصے کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"اس غدار نے....."

یہ کہتے ہوئے بنے بھائی نے عارف کے سامنے ایک تصویر پھینک دی۔

یہ بابر کی تصویر تھی ــــ!

عارف میاں کو اپنے خون کا خمیر بدلتا محسوس ہوا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ اپنے چہرے کے تاثرات سے اپنے دلی جذبات کا اظہار نہ ہونے دے۔ اگر بنے بھائی کو اس پر معمولی سا شک بھی ہو جاتا کہ عارف میاں کی نیت میں کوئی فتور پیدا ہو رہا ہے تو وہیں اس کا دماغ درست کر دیتے۔

"دیکھو عارف میاں جب ہم نے تنظیم سے رشتہ جوڑ لیا تو سارے خون کے رشتے ہمارے لیے اجنبی ہو جاتے ہیں۔ یہ امتحان کی گھڑی ہے جس میں تمہیں سرخرو ہونا ہے۔ بیں شک ہے کہ بابر کا تعلق باغی گروپ سے ہے اور تنظیم کے بھگوڑوں کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے۔ تنظیم کے کسی بھی غدار سے رابطہ رکھنے کی کم از کم سزا موت ہے ــــ تم جانتے ہو۔ آصف نے چونکہ تنظیم کے لیے بہت خدمات انجام دی ہیں اس لیے زیادہ سے زیادہ یہی رعایت مل سکتی ہے کہ اسے آسان موت دی جائے۔ جتنی جلدی ممکن ہو اسے گاڑی کے نیچے دے ڈالو۔ جس قسم کی مدد درکار ہے "۵ ۹" سے لے لو۔ یہ کام جلد از جلد ہونا چاہیے"ــــ بنے بھائی پھنکارے۔

"ایسا ہی ہوگا بنے بھائی ــــ آپ بے فکر ہو جائیے"ــــ عارف میاں نے ہوشیاری دکھائی۔

"کالیا کو تم جانتے ہو ــــ مقامی سیکٹر کمانڈر ہے۔ یہ تمہاری مدد کرے گا"ــــ بنے بھائی نے کالیا کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے آج شام کو ملتے ہیں"ــــ کالیا نے اس کی طرف بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھایا۔

"او۔کے"ــــ عارف میاں باہر آ گئے۔

"اگر سالا معمولی سی گڑبڑ بھی کرے تو مار دینا"ــــ بابا صاحب نے خاص طور سے اس کا امتحان لینے کے لیے یہ ذمہ داری اس کے سر تھوپی ہے ــــ اگر اسے نکما ہونا

ہے تو ابھی ہو جائے۔ زیادہ نقصان نہ کرے" ـــــ ننھے بھائی نے سمجھایا۔

"سیدھا کر دوں گا سالے کو ـــــ کسی کی جرأت نہیں کہ باباصاحب کے حکم سے معمولی سرتابی کرے۔"

کالیا کا قہقہہ بڑا ہولناک تھا۔

○

عارف کا بند بند جکڑا جا چکا تھا۔

وہ اپنی مرضی سے شاید سانس لینے پر قادر نہیں رہا تھا۔ اس کے لیے تنظیم کے کسی بھی حکم سے سرتابی احکاماتِ الٰہی سے نافرمانی کے مصداق تھی۔ ننھے بھائی نے اسے زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندی پر پہنچایا تھا۔ اسے اس کے ہونے کا احساس دلایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تنظیم کے لیے ہر غیر قانونی کام کو قانونی جان کر انجام دیا۔

لیکن ـــــ

بابر کو قتل کرنے کا فیصلہ جو باباصاحب کے حکم پر ہوا تھا، عارف میاں نے اسے قبول نہ کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ چاہے بھی تو بابر کو قتل نہیں کر سکے گا۔ جس بات کا علم تنظیم کو اب ہوا تھا اس کا احساس عارف میاں کو بہت پہلے سے ہونے لگا تھا۔

اسے یاد آ گیا جب ایک روز وہ دونوں مخالف لسانی تنظیم میں شامل ہونے والے ایک طالب علم کے اغوا کا پروگرام بنا رہے تھے جسے انہوں نے بھیڑ "۹۵" میں بند کر کے سبق سکھانا تھا تو بابر نے اس سے کہا تھا۔

"اس بلامقصد خونریزی کا آخر کیا جواز ہے؟"

بابر کے منہ سے پہلی مرتبہ اس طرح کا فقرہ سن کر پہلے تو عارف میاں کو اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا اور انہوں نے دوبارہ اسے محض تصدیق کرنے کے لیے

"کون سی خونریزی؟"

"بھئی یہی وسیم چوہدری کو اغوا کر کے ہاتھ پاؤں توڑنے یا جسم میں سوراخ کرنے والی خونریزی ـــــ معلوم نہیں ان لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے یا پھر یہ فرعون بن گئے ہیں۔ ایک لڑکا جسے یونیورسٹی میں داخل ہوئے بمشکل تین ماہ گزرے ہیں اُسے محض اس جرم کی سزا دیے جا رہے ہیں کہ اس نے ہماری مخالف تنظیم کے دو جلسوں میں شرکت کیوں کی؟ عارف بھائی، مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے ـــــ یوں لگتا ہے، جیسے ہماری تنظیم پر بڑے نامحسوس طریقے سے دشمن نے قبضہ کر لیا ہے اور اب یہ لوگ ایک اچھے مقصد کے لیے جمع ہونے والے جانثاروں کے اس گروہ کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ گزشتہ چند ماہ سے ہم جو کچھ کر رہے ہیں آخر اس کا مطلب کیا ہے؟" ـــــ بابر نے کھل کر بات کر دی تھی۔

"بابر تم ہوش میں تو ہو ـــــ کیا بک رہے ہو....." عارف میاں نے گھبرا کر اسے اس کی اصلیت کا احساس دلانا چاہا۔

"عارف بھائی، میں ہوش میں آیا ہی اب ہوں۔ اس سے پہلے جب ہم آنکھیں بند کر کے بندروں کی طرح "باباصاحب" کی ڈگڈگی پر ناچتے رہے تو واقعی ہم ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ عارف بھائی اس ملک کے لیے میرے بزرگوں نے اپنے خون کا نذرانہ دیا تھا تو اس لیے نہیں کہ ہم زبان اور صوبے کے مسئلے پر اپنے ہی بھائی بندوں کا قتلِ عام شروع کر دیں گے ـــــ تم کہہ سکتے ہو کہ میں پاگل ہو گیا ہوں لیکن آج بالکل تم بھی میری طرح ضرور پاگل ہو جاؤ گے ـــــ آخر شراب اور شباب کے نشے میں کب تک ڈوب کر ہم اس خونی کھیل کا حصہ بنے رہیں گے۔"

بابر نے کہا اور عارف میاں نے خاموشی سے سن لیا۔

اس بات کا احساس شاید بابر کو ہو گیا تھا کہ عارف اس کے نظریات میں بغاوت کی شکایت "مرکز" میں نہیں کرے گا۔ کیونکہ ان دونوں کی دوستی اس تنظیم میں شامل ہونے

سے بہت پہلے کی تھی۔

بابر کو تو یہاں تک اُمید تھی کہ عارف میاں اس کا ساتھ دیں گے۔

لیکن ———

عارف نے اس سے کبھی اپنے بھارتی انٹیلی جنس کے جال میں پھنسنے کا ذکر نہیں کیا تھا۔

اُسے سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ یہ راز کبھی کسی کے سامنے نہ کھولے کیونکہ اس کی کم از کم سزا موت تھی۔

"بابر تم میرے دوست ہو۔ بچپن کے دوست! میں تمہیں ایک بھائی کی حیثیت سے نصیحت کرتا ہوں کہ آج کے بعد دوبارہ کبھی کسی کے سامنے یہ الفاظ نہ دہرانا۔ تمہیں شاید اس بات کا احساس نہیں کہ تم جو بغاوت کرنے جا رہے ہو اس کی قیمت چکانے کی ہمت تم میں نہیں۔"

"ہاں! ہاں، میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ میرے سارے خاندان کو زندہ درگور کر دیں گے لیکن میں کیا کروں۔ میرا دل نہیں مانتا۔ میں روز روز کی خونریزی سے تنگ آ چکا ہوں۔"

بابر نے زچ ہونے والے لہجے میں کہا تھا۔

یہ اُن دونوں کی آخری ملاقات تھی۔!!

بابر نے عین آخری لمحات میں زبردست بیمار کا "ڈرامہ" رچا کر اس مشن سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور وسیم چوہدری کے اغوا کا کارنامہ عارف میاں نے دوسرے ساتھیوں کی مدد سے انجام دیا تھا۔ چونکہ بابر نے اس سے پہلے اس نوعیت کی بہانہ بازی نہیں کی تھی اس لیے بتّے بھائی نے بھی سمجھا ہو گا کہ واقعی اسے اچانک بیماری نے گھیر لیا ہے۔

لیکن ———

اس کے بعد اس کی مشتبہ حرکات نے ان لوگوں کو بابر سے بدظن کر دیا ہو گا۔ فی الوقت عارف میاں نے یہی سوچا تھا۔

○

کالیا نے اس سے اگلے روز شام کو ملاقات کرنی تھی۔ اس درمیان منصوبے کے مطابق اس نے بابر کو دھوکے سے کہیں بلانا تھا جہاں اُن دونوں نے مل کر تنظیم کے اس غدار کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔

بابر کی موت کا کیا طریقِ کار اختیار کیا جائے۔

اس کا فیصلہ ان دونوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

عارف میاں جانتے تھے کہ پہلے ان کا ضمیر گہری نیند سو چکا ہے اور مستقبل بعید میں بھی دوبارہ بیداری کے چانسز نظر نہیں آتے۔ اس کے باوجود وہ بابر کے قتل کی گھناؤنی سازش میں حصہ دار نہیں بن سکیں گے۔!

وہ یہی سوچتا آ رہا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہے اس کا اور بابر کا سامنا ہو جائے تا کہ وہ اسے فوراً جان بچانے کی ترغیب دے سکے ——— اگر کچھ دیر ہو جاتی اور بابر فرار ہو جاتا تو فوراً اس پر شک کیا جاتا۔

یہی سوچتا وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا جب اس نے شومئی قسمت سے بابر کو ایک ٹیکسی سے اُتر کر بازار کی طرف آتے دیکھا۔

عارف جانتا تھا کہ بتّے بھائی کے حکم کے ساتھ ہی اس کی نگرانی بھی شروع ہو گئی ہو گی لیکن اسے یہ بھی اُمید تھی کہ شاید ابھی تک اس پر نگران آنکھوں کا تقرر نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح موٹر سائیکل چلاتا بابر کے نزدیک پہنچ گیا۔!

"سیدھے جیبنا ہوٹل پہنچ جاؤ۔ فوراً۔ ابھی گھر نہ جانا۔" اس نے ایک لمحے کے لیے رُک کر اس سے کہا اور سیدھا چلتا چلا گیا۔

بابر نے بھی شاید صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ کر لیا تھا۔ عارف نے
جس انداز میں بات کی تھی اس کے بعد تو اُسے بہت کچھ سمجھ آ گیا تھا۔ ایک
کے لیے اُس نے ٹھٹھک کر صورتِ حال کا جائزہ ضرور لیا تھا پھر فوراً ہی اپنا
تبدیل کر لیا تھا۔

عارف میاں نے اپنی بات کے آخر میں اُسے یہ سگنل دے دیا تھا کہ
یہاں آج موجودگی کا کوئی ثبوت یا گواہ نہیں ملنا چاہیے۔" گھبرا نہ جانے کہ وہ
ان کی زبان میں یہی تھا۔

بابر انہی قدموں پہ واپس پلٹ گیا۔

کافی دور تک اُس نے پیدل فاصلہ طے کیا تھا —!!

"جبینا ہوٹل" ان کے لیے جائے اماں تھی۔!

دونوں کبھی باقاعدگی سے وہاں نہیں گئے تھے۔ یہ اُن کے کالج کے زمانے کا
تھا اور دونوں اکثر یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ اب بھی کبھی کبھی اپنے پرانے دور کی یادیں
تازہ کرنے کے لیے دونوں یہاں آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ تنظیم کے کسی اور ساتھی کو اس
بات کا علم نہیں تھا کہ دونوں یہاں بھی بیٹھتے تھے۔ جبینا ہوٹل پہ آخری مرتبہ
آج سے تین چار ماہ پہلے بیٹھے تھے۔

بابر نے دو تین سڑکوں کو پیدل ہی عبور کیا تھا لیکن بڑی احتیاط سے
بات کا اس نے بطور خاص خیال رکھا تھا کہ اس کی یہاں موجودگی کا کسی کو علم نہ ہو
سکے۔

اس نے جان بوجھ کر وہ راستہ اختیار کیا تھا جس پہ اس کی آشنائی نہ ہونے
کے برابر تھی۔ ایک موڑ مڑتے ہوئے اس نے سامنے سے آتے رکشہ کو ہاتھ دے کر
روکا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جبینا ہوٹل یہاں سے چھ سات میل دور تھا۔ یہ کوئی بہت زیادہ فاصلہ نہیں
تھا لیکن بابر نے بطور احتیاط یہاں تک پہنچنے کے لیے راستے میں تین جگہ سواریاں
تبدیل کی تھیں۔ جب وہ ہوٹل پہ پہنچا تو عارف میاں پہلے سے اس کا منتظر تھا!

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ اپنی اس بالشت بھر کی زبان کو تالا لگا لو — اس
تنظیم میں بہت سے نوجوان تمہاری طرح کے نظریات رکھتے ہیں لیکن انھوں نے
اس طرح علمِ بغاوت بلند نہیں کیا — بابر تم گدھے ہو — تمہیں اس بات کا شعور
نہیں کہ تم دو جوان بہنوں کے اکلوتے بھائی ہو — بوڑھے والدین کی واحد اُمید
اور یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ تم اپنے ہاتھ میں تلوار تھام کر توپوں کے سامنے
کھڑے ہو جاؤ۔ تم نے سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا تم نے ....."

زمانے عارف غصے میں کیا کیا کہتا رہا اور بابر سر جھکائے سنتا رہا۔

اس نے بابر کو بتا دیا کہ تنظیم کی طرف سے کالیا اور اُسے بابر کے قتل کی مہم
سونپی گئی ہے۔

"انھوں نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے ہیں۔ جہاں میرے جیسے کانٹے کو نکالنے
کا سامان کیا ہے وہاں تمہاری وفاداری کو بھی آزمایا ہے — تم خود بہتر فیصلہ کر
سکتے ہو عارف بھائی — میرا ذہن تو ماؤف ہو چکا ہے۔" بابر نے ہتھیار
ڈالتے ہوئے کہا۔

○

اس خبر نے کہ "بابا صاحب" کی طرف سے اس کے قتل کے احکامات جاری
ہو گئے ہیں اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑا دیے تھے۔

"وقت کم ہے میرے دوست۔ جہاں تک میرے ذہن نے سوچا ہے مجھے اس
مسئلے کا ایک ہی حل نظر آتا ہے۔ تم یہاں سے گھر نہیں جاؤ گے۔ دوسرے کسی

صوبے کی طرف نکل جاؤ وہاں سے جس طرح بھی ممکن ہو سوائے بھارت کے کسی
ملک کی طرف اپنی شناخت بدل کر نکلنے کی کوشش کرو — تمہاری والدہ کو بھی
پولیس اسٹیشن میں تمہارے کل صبح سے گھر سے غائب ہونے کی رپورٹ درج کروانا
ضروری ہے — چونکہ اس فیصلے کو مقامی برانچ سے پوشیدہ رکھا گیا ہوگا اور
کی طرف سے کبھی بھی یہ تاثر نہیں دیا جائے گا کہ تم باغی ہو گئے ہو۔ خدانخواستہ وہ
کو اپنے ذلیل مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی تو یہ فوراً اس قتل کی ذمہ داری
تنظیم پر ڈال دیتے — اب بھی تمہارے پُراسرار طور پر غائب ہونے پر یقیناً
اس بات کا بھی یقین ہو کہ تم خود کہیں چھپ گئے ہو اس کے باوجود وہ تمہارے
کی خوب تشہیر کریں گے اور اس کا الزام بھی مخالف تنظیم یا پھر کسی سرکاری ایجنسی
لگا دیں گے — تھانے میں تمہارے اغوا یا غائب ہو جانے کی رپورٹ فوراً
گی کیونکہ تھانے والوں کو علم ہے کہ تم تنظیم کے آدمی ہو اور تمہارے ساتھ ان کو بھی
تعاون کرنا ہوگا۔ تم چند دنوں کے لیے دوسرے صوبے میں ٹھکانہ بناؤ۔ اپنے
سے مجھے اس فون نمبر پر آگاہ کر دینا — صرف اتنا پیغام دینا کہ عارف میاں
کہیں فلاں نمبر پر فون کر لیں — فی الحال یہ رقم رکھ لو — میں تمہارا پیغام
ہی تمہیں اور رقم پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ خالہ جان اور بہنوں کی طرف سے
مطمئن رہنا اگر اللہ تعالیٰ نے تم پر مہربانی کر دی اور دوسرے کسی صوبے میں
ٹھکانہ بن گیا تو میں اپنی کوشش سے تمہارا مکان فروخت کروا دوں گا۔ گو کہ یہ مشکل
ہوگا لیکن ان شاء اللہ ہو جائے گا — جس کے بعد میں خالہ جی اور بہنوں کو تمہارے
پاس ہی بھیج دوں گا یا پھر تم کسی دوسرے ملک کی طرف نکل جاؤ اور حالات ٹھیک
ہونے پر واپس لوٹ جانا — اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے۔ تم خدا کے لیے
نکل جاؤ۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ خالہ جان کے نام خط لکھ کر مجھے دے دو۔"

میں انہیں کہہ دینا کہ وہ میرے مشورے پر عمل کریں لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ میں
نے انہیں کیا مشورہ دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے عارف بھائی — میرے خیال سے فی الحال اس سے بہتر کوئی تجویز
نہیں ہو سکتی۔ میں تمہارے اس احسان کا بدلہ شاید کبھی نہ چکا سکوں۔ بس ایک بات
کا خیال رکھنا کہ کہیں یہ درندے میرے گھر....."

"بابر! میرا ضمیر ضرور مر گیا ہے لیکن میری غیرت ابھی نہیں مری۔ خدا جانے
شاید اللہ تعالیٰ نے مجھے نصیحت دینے کے لیے ہی اس سانحہ سے دوچار کیا ہے۔
میں بھی تمہارے راستے کا مسافر ہوں لیکن میرے پاؤں میں بہت مضبوط بیڑیاں ہیں۔
مجھے یہ بیڑیاں کاٹنی ہیں — ضرور کاٹنی ہیں اور ان شاء اللہ کاٹوں گا لیکن حکمت
سے — میں ان کو اندر سے پھاڑ کے رکھ دوں گا۔" — اسے اپنی آواز خود اجنبی
لگ رہی تھی۔

عارف میاں کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُن کی زبان سے یہ فقرے کیسے ادا ہو
رہے ہیں۔ انہوں نے تو کبھی زندگی میں اس بات کا تصور نہیں کیا تھا کہ عالمِ ہوش
میں اُن کی زبان سے کبھی کوئی ایسی بات نکل سکے گی۔

جس بُری طرح اُسے تنظیم نے اپنے شکنجے میں جکڑ کر دشمن ملک کے سامنے پھینک
دیا تھا اس کے بعد سے تو وہ اپنی مرضی سے گردن ہلانے کے لائق نہیں رہا تھا۔

"میرے خیال سے مجھے چلنا چاہیے — اچھا دوست زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔
اپنی ماں اور بہنوں کو خدا کے بعد تمہارے آسرے پر چھوڑے جا رہا ہوں۔ ممکن ہے
تو میرے گھر سے میری چیک بک لے لینا۔ میں چاہتا ہوں بینک سے رقم بھی نکلوا
لی جائے۔ اب قدم قدم پر پیسوں کی ضرورت تو محسوس ہو گی۔" بابر نے ایک کاغذ پر
اپنی والدہ کے نام پیغام لکھ کر اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"ہاں — تم چلو۔ میں انشاء اللہ حالات ٹھیک ہونے پر تم سے ضرور ملوں گا
ہمارا بچپن ضرور واپس لوٹے گا۔ گھر کی فکر۔ دل کو نہ لگانا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر
ہو" — اتنا کہہ کر اُس نے بابر کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

بابر نے اُسے جھٹکا دے کر اپنے ساتھ گلے لگا لیا۔

دونوں کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ دونوں کے دل خون رو
رہے تھے۔

لیکن —

فی الوقت دونوں لاچار تھے۔ اس شہر میں کسی کو "باباصاحب" کے خلاف
دم مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سلسلے میں نہ سرکار ان کی مدد کر سکتی تھی نہ
وہ خود اپنی جان بچانے سے زیادہ اپنے لیے کچھ کر سکتے تھے۔ پھر بھی غنیمت
تھا کہ وہ محفوظ تھے۔

○

بابر سے جدا ہو کر وہ سیدھا گھر آیا تھا۔

اس کی طبیعت بہت بوجھل ہو رہی تھی۔

مینا کشی حسبِ معمول گھر سے غائب تھی۔ عارف میاں نے اندازہ لگایا تھا
کہ آج کل وہ کچھ زیادہ ہی غائب رہنے لگی ہے۔ ضرور کوئی شکار پھانس رکھا
تھا۔ کبھی کبھی تو وہ یہ سوچتا تو لرز کر رہ جاتا کہ اس شہرِ نگاراں میں جہاں پچیس یا
تیس لاکھ غیر ملکی غیر قانونی طور پر رہائش پذیر ہیں جانے کتنی لڑکیاں مینا کشی
جیسی ہوں گی اور کتنے مرد اس کی طرح "را" کے ایجنٹ ہوں گے۔

"کیا بنے گا اس ملک کا" — جب کبھی یہ خیال آتا وہ گھبرا اُٹھتا۔

خدا جانے کون سی ایسی طاقت تھی جس نے ابھی تک اس ملک کی سالمیت

کو برقرار رکھا ہوا تھا جبکہ ہوسِ اقتدار میں اندھے اپنی زمین کا رزق کھا کر پاکستان
کے ٹکڑوں پر پلنے والے جانے کتنے انسان نما بھیڑیئے پاکستان کی رگوں پر
اپنے دانت گاڑے بیٹھے تھے۔

ان کے زہریلے دانت جسدِ ملی میں بہت دور تک اُتر گئے تھے۔ ان لوگوں
نے مادرِ وطن کا سودا کہاں کہاں نہیں کیا تھا۔

ایسے ایسے مناظر انہیں دیکھنے کو ملے تھے کہ خدا کی پناہ — !!

"باباصاحب" کے آستانے پر غیر ملکیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ لوگ آخر کیا کرنے
آتے تھے؟

ایک لسانی تنظیم جس کا وجود پاکستان کے دو تین شہروں سے باہر کہیں دکھائی
نہیں دیتا تھا۔ ایسی تنظیم کے سربراہ سے انہیں کیا مطلب ہو سکتا تھا؟

جہاں تک اپنوں کا سوال تھا ان کے تو "باباصاحب" کی چوکھٹ پر سر رگڑنے
کی بات سمجھ میں آسکتی تھی کہ وہ تو خون پینے والی جونکوں کی طرح بہر صورت اقتدار
سے چمٹے رہنا چاہتے تھے اور ہر ایسی جماعت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے
جو ان کے مذموم مقاصد کی بجا آوری میں ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکے۔

حکمرانوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ "باباصاحب" کے رابطے بیرونِ ملک
کہاں کہاں ہیں — یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کس کے کھونٹے سے بندھے ہیں
اور کس کے اشارے پر بندر کی طرح ناچتے ہوئے پاگل کتوں کی طرح بھونکنا شروع
کر دیتے ہیں۔

سب کچھ حکمرانوں کے علم میں تھا۔

انہوں نے درجنوں ایجنسیاں یونہی نہیں پال رکھی تھیں۔ ان کے پاس غلاموں
کی ایک فوجِ ظفر موج تھی جو انہیں پل پل کی خبر دیا کرتی تھیں سیاسی ہوا کے رُخ

کا تعین کیا کرتی تھی۔

لیکن ——

وہ "بھولے بادشاہ" تھے۔ "بابا صاحب" کی عظمت کے گن گاتے تھے
اندازہ تھا کہ اس صوبے میں "بابا صاحب" ایک طاقت ہے۔ ایک ایسی طاقت
بھی پلڑے میں اپنا وزن ڈال دے تو طاقت کا توازن ہی بگڑ جائے گا۔
صاحب" کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ ملکی سالمیت کو داؤ پر لگا کر
"بابا صاحب" کو خوش رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔

ان حالات میں اگر کہیں لسانی تنظیم میں کسی سطح پر کوئی لاوا پک
تھا تو اسے باہر نکلنے کی راہ میسر نہیں آتی تھی۔ اور وہ اندر ہی اندر کھو
پھر ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔

○

عارف میاں کے اندر موت جیسی گہری نیند سویا ضمیر اچانک
لے کر بیدار ہوا تو انہیں خود پر کنٹرول پانے میں بڑی دقت کا سامنا
تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے گھر والوں نے عارف میاں کو ا
کے عالم میں دیکھا تھا۔

"خیریت تو ہے بیٹا ——!" بوڑھی ماں سے نہ رہا گیا۔

"سب ٹھیک ہے اماں —— اماں تم ایک کام کرو —— لیکن ایک
غور سے سن لینا۔ مجھ سے کوئی سوال مت کرنا ابھی جاؤ اور بابر کی امی کو
سے گھر لے آؤ ——"

اس نے بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا! اس میں گھبرانے کی بات کیا ہے۔ لیے آتی ہوں ابھی

ہنڈیا دیکھ لوں۔"

"نہیں اماں —— تم ہنڈیا کی فکر چھوڑ دو —— میں دیکھ لے گی۔ تم فوراً انہیں
لے آؤ ——"

اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

"اے بیٹا! تم ہوش میں تو ہو۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ بابر کی امی کہیں بھاگے
چلی جا رہی ہے۔ کہاں سے آتی ہوں !" اس کی والدہ نے لاپرواہی
سے کہا۔

"اماں —— خدا کے لیے تم ابھی جاؤ ——" اس نے اس طرح عالم وحشت میں
اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا کہ بوڑھی عورت کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

"اچھا جاتی ہوں —— ابھی جاتی ہوں۔ تم مطمئن رہو۔ آرام سے لیٹ جاؤ میں
جا رہی ہوں۔"

بوڑھی عورت کی حیرانگی میں اب پریشانی نمایاں تھی۔ اس نے اپنا برقعہ اٹھایا
اور بابر کے گھر کی طرف چل دی۔

شاید بابر کی ماں کے لیے بھی یہ بڑی عجیب بات تھی کہ عارف میاں نے
اسے فوری بلا بھیجا ہے۔ ایسا زندگی میں پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ آج سے پہلے عارف
نے کبھی ایسے نہیں کہا تھا۔ اس کے گھر کے دروازے اس پر بند ہی کب ہوئے
تھے۔ وہ بچپن سے اُن کے گھر کے فرد کی طرح اُن کے درمیان آ جا رہا تھا۔

لیکن ——

کچھ دنوں سے بابر کے تیور بھی بدلے بدلے دکھائی دے رہے تھے۔ اس
بات کا علم تو بابر کی امی کو بھی تھا کہ ان کا بیٹا تنظیم کی سیاست میں بہت زیادہ
حصہ لے رہا ہے اور کچھ عرصے سے تو وہ راتوں کو بھی گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔

اس روز تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکیں جب بابر نے کسی بات پر جھنجھلا کر اُٹھ
امی کے سامنے "باباصاحب" کی شان میں اچھی خاصی گستاخی کر ڈالی تھی۔ یہ ان
کے لیے واقعی لرزا دینے والی بات تھی۔

ایسا شاید پہلی مرتبہ ہوا تھا ورنہ تو "باباصاحب" کی تعریفوں کے پل باندھے
رکھتا تھا۔ اس طرح اچانک اس کا بدل جانا کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ بابر کی
امی پڑھی لکھی خاتون تھیں اور وہ اندازہ کر سکتی تھیں کہ تنظیم کے "غداروں" کے
ساتھ تنظیم کے "وفادار" کیا سلوک کرتے ہیں۔ وہ مروجہ سیاست کی بھی جانکار
رہی تھیں۔

ان کے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں تھی کہ اپنے بیٹے کو بزور روک سکتیں
انہوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ ان کی اولاد نرینہ کا دھیان اپنی پڑھائی
کی طرف رہے کسی اور طرف نہ جائے۔ باپ نے انہوں نے بھائی کو بہت
سمجھایا۔

لیکن ——

"باباصاحب" نے جو زہر ان نوجوانوں کے ذہنوں میں گھول رکھا تھا اس
نے انہیں بدتمیز بنا دیا تھا وہ اپنے والدین کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے
اب جب سے بابر نے "باباصاحب" کے خلاف گھر میں بڑبڑانا شروع کیا تھا
تو اس کے گھر والے خوش ہونے کے بجائے خوفزدہ ہو گئے تھے۔

وہ جانتے تھے ایک مرتبہ اس دلدل میں پھنس جانے والے کے لیے
واپسی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے بیٹے کے اندر جو بغاوت جنم
لینے لگی ہے وہ اس خاندان کو کہیں کا نہ چھوڑے گی۔

بابر کی امی کو اس بات کا علم تھا کہ عارف میاں سے زیادہ ان کے

کا گہری دوست اور راز دار کوئی اور نہیں۔ آج جب اچانک عارف میاں کی
اماں نے انہیں اپنے بیٹے کا پیغام فوراً ملاقات کے لیے دیا تو ان کا ماتھا ٹھنکا

"خیریت" —— بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

"ارے بہن! بس کیا بتاؤں میں تو خود بڑی پریشان ہوں۔ آج جب سے
عارف میاں گھر لوٹے ہیں ایک پل کو قرار نہیں۔ مجھے کہا ہے کہ تمہیں فوراً بلا
لاؤں اور کچھ نہیں بتایا۔ بلکہ پابندی کر دیا ہے کہ نہ تو اس بات کا کسی اور
سے ذکر کروں نہ ہی اس سے کوئی سوال پوچھوں —— عارف کی والدہ نے کہا۔

"چلو میں چلتی ہوں —— ذرا بچیوں کو بتا دوں"

○

تھوڑی دیر بعد دونوں بوڑھی عورتیں عارف میاں کے گھر موجود تھیں۔

"اماں آپ ذرا باہر چلیں میں نے خالہ جی سے ضروری بات کرنی ہے۔"

عارف میاں کے منہ سے نکلنے والے کلمات نے ایک مرتبہ پھر دونوں
بوڑھیوں کو لرزا کر رکھ دیا۔

"خدا خیر کرے بیٹا! ایسی کیا بات ہے" —— اس کی ماں کی بے چینی
بڑھ رہی تھی۔

"دیکھو اماں خدا کے لیے میری بات مان لو اور کوئی سوال نہ کرو۔ وقت
آنے پر تمہیں سب پتہ چل جائے گا۔ وقت کم ہے آپ باہر جائیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی ماں کو آہستہ سے کمرے سے باہر دھکیل
کر دروازہ بند کر دیا۔

"بیٹھئے خالہ جان! میں آپ کو اس طرح زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں
لیکن مجبوری تھی۔ بابر کی زندگی کا مسئلہ تھا۔ مجھے امید ہے آپ حوصلے اور

جرأت سے کام لیں گی۔ پہلے یہ خط پڑھ لیجیے۔ اتنا کہہ کر اس نے بابر کی والدہ کو
بابر کا مختصر خط تھما دیا۔

پریشان اور بوکھلائی ہوئی بوڑھی عورت نے خط کپکپاتے ہاتھوں سے تھاما
اور پڑھنا شروع کیا جس میں لکھا تھا کہ فی الوقت وہ کچھ مدت کے لیے اپنے
والوں سے الگ ہو رہا ہے اور اپنے والدہ کو کہا تھا کہ وہ سوائے عارف میاں کے
اور کسی پہ اعتبار نہ کریں۔۔۔!!

خط پڑھنے کے بعد انہوں نے استفہامیہ نظروں سے عارف میاں کی طرف
دیکھا۔

"خالہ جی وقت بہت کم ہے میں مختصر بات کرتا ہوں۔" بابا صاحب کی طرف
سے بابر کو قتل کرنے کے احکامات جاری ہو چکے ہیں اور بیٹے بھائی کو
دی گئی ہے۔ اس کی جان کی سلامتی کے لیے ان کا فوراً پردے سے غائب
ہو جانا ضروری تھا۔ وہ دوسرے صوبے میں کسی محفوظ مقام پہ چلا گیا ہے
دو دن تک اس کے ٹھکانے کی خبر ہو گی جہاں آپ کی اس سے بات کرا دی
گا۔ کارساز تو خدا کی ذات ہے اور ہماری زندگی اور موت کا مالک۔۔۔ بھی
میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ بابر کی جان بچانے کے لیے میں اپنی جان کی
بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ ارم اور حسنہ میری بہنیں ہیں
کبھی بابر کی کمی کا احساس نہیں ہو گا۔ اگر آپ نے رونا دھونا شروع کر دیا
دیواروں کو بھی اس راز کا علم ہو گیا کہ بابر فرار ہو چکا ہے اور اس میں میرا
شامل ہے تو وہ درندے جن کے چنگل میں ہم پھنس چکے ہیں میرے اور آپ
گھرانے کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پہ مجبور کر دیں گے۔ فی الوقت یہ راز
آپ کے اور خدا کے درمیان رہے گا۔ بابر کی بہنوں کو بھی صرف اتنا بتا دیجیے

اگر انہیں اپنے بھائی کی زندگی عزیز ہے تو اپنی زبان بند رکھیں اور اس کی
جستجو نہ کریں۔"

"مجھے کیا کرنا ہو گا بیٹے"۔۔۔ بابر کی ماں نے اچانک ہی کہا تھا۔ اس کے
لہجے میں چھپے اعتماد نے عارف میاں کا حوصلہ بہت بڑھا دیا۔ انہیں یقین ہو گیا
کہ خالہ ان سے ہر ممکن تعاون کریں گی اور یہ خطرہ ٹل جائے گا۔

"آپ نے اسی وقت تھانے میں بابر کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانی
ہے۔ بیٹیوں کی فکر نہ کیجیے بس یہ کوشش کیجیے کہ رپورٹ درج کروانے کا وقت
پیچھے جا سکیں اتنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئی
ہیں نا۔ اس وقت پانچ بج رہے ہیں آپ جب پولیس سٹیشن جائیں تو رپورٹ
درج کروانے کا وقت آج صبح یا دوپہر کا لکھوایئے اور یہ کہیے گا کہ اطلاع دیے
بغیر بابر گزشتہ ۲۴ گھنٹے سے غائب ہے۔ چونکہ وہ تنظیم کا سرکردہ ممبر ہے اسے
تنظیم کی طرف سے جان کا خطرہ تھا لیکن ممکن ہے کہ کسی نے اسے اغوا
کر لیا ہو۔ اس بات کا خیال رہے کہ اس ڈرامے کو کسی بھی مرحلے پہ غیر حقیقی
نظر نہیں آنا چاہیے۔ مجھے علم ہے کہ وہ کل رات گھر پہ نہیں تھا اور اسے پرسوں
کسی نے نہیں دیکھا ہو گا کیونکہ آج کل وہ تنظیم کے لوگوں سے کچھ دور دور
رہنے لگا تھا۔"

عارف میاں نے انہیں سارا پلان سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! ایسا ہی ہو گا۔ مجھے تمہاری اور بابر کی دوستی پہ فخر ہے
بابر نے زندگی میں شاید ہی ایک اچھا کام کیا تھا کہ تمہارے ساتھ دوستی
کی۔ ارم اور حسنہ کو میں انشاء اللہ سنبھال لوں گی۔ بابر میری واحد اولاد نرینہ
ہے اس کے باپ کا سایہ ہم پہ نہیں ہے۔ اب اچھا یا برا۔ لے دے کر اگر

ہمارے لیے اس بے رحم دنیا میں کوئی آسرا ہے تو اسی بیٹے کا ___" ان کی آواز بھرا
گئی تھی۔ ضبط کے مضبوط بندھن توڑ کر آنسو ان کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

لیکن ___

بوڑھی اور معزز خاتون نے عینک اتار کر آنکھیں صاف کیں اور مضبوطی
سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"رپورٹ درج کرانے کے بعد مقامی آفس میں واویلا کرتی رہیے گا اور پوری
طرف سے مسلسل اس الزام کی تکرار ہو کہ اُسے مخالف تنظیم نے اغوا کروایا
ان وحشیوں کو آپ پر شک نہ ہو سکے۔ اس بات کا خیال رہے کہ "بابا" بہت
بڑا مکار شخص ہے اور آپ کی کڑی نگرانی "۹۵" کے انٹیلی جنس یونٹ سے
کروائے گا ___ اس لیے بہت محتاط رہیے گا ___"

عارف میاں نے انہیں نصیحت کی۔

"بیٹا ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گی کہ آنچ نہ
نہ ہونے دوں۔ تم بابر کی چیک بک لے جاؤ ___"

"خالہ جی اس دروازے سے باہر جائیے اور کوشش کیجیے کہ کسی کو ہماری ملاقات
کا علم نہ ہو کہ تھانے میں رپورٹ لکھوانے سے پہلے آپ نے مجھ سے ملاقات کی۔
اپنی امی کو میں سمجھا لوں گا ___ خدا حافظ ___"

"خدا حافظ بیٹا! اللہ تمہیں حفظ و امان میں رکھے۔"

○

خالہ جی کے باہر جاتے ہی اس نے اپنی اماں کو دوبارہ کمرے میں بلایا۔
ابھی تک بابر کی ماں کے گھر آنے کا علم سوائے ان دونوں کے اور کسی کو
نہیں ہوا تھا۔

"اماں بی! مختصر بات یہ ہے کہ بابر کی زندگی کو خطرہ ہے ___ اگر آپ اُسے کچھ اپنا
سمجھتی ہیں تو اس کی زندگی بچانے کے لیے آپ کو میری دو باتوں پر سختی سے عمل کرنا
ہے۔ پہلی بات تو یہی کہ مجھ سے کوئی سوال نہ کریں دوسری بات کہ بابر کی والدہ کے
یہاں آنے کا کسی سے تذکرہ نہیں کیجیے گا ___ آپ یوں سمجھیے کہ وقت دو گھنٹے
پیچھے چلا گیا ہے اور میں ابھی آپ سے مل رہا ہوں۔ خدا کے لیے اس بات کا ذکر
پڑوس یا گھر کے کسی بھی فرد کے سامنے ہرگز نہ کیجیے۔"

عارف میاں کے چہرے کا تناؤ گفتگو کی سنجیدگی اور قدرے گھبراہٹ نے ان
کی اماں پر بھی گھبراہٹ طاری کر دی تھی لیکن انہوں نے صورتِ حال کو کسی حد
تک سمجھتے ہوئے فی الوقت خاموش رہنا اور اپنے بیٹے کی ہاں میں ہاں ملانا ہی ضروری
سمجھا تھا۔

"بیٹا! میرے لیے بابر دوسرا بیٹا ہے تم جانتے ہو کہ میں نے اُسے ہمیشہ ماں کی
نظروں سے دیکھا ہے۔ مطمئن رہنا اس کی زندگی مجھے تمہاری زندگی کی طرح عزیز
ہے۔ میں وہی کروں گی جو تم کہو گے۔ تمہارے ابا سے بھی اس بات کا ذکر نہیں
کروں گی ___" اماں بی نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

عارف میاں کی والدہ نے فی الوقت بیٹے کی ہاں میں ہاں ملا دی تھی، لیکن
ایک دھڑکا ان کے دل کو مستقل لگ گیا تھا۔

بابر کی والدہ نے عارف میاں کی نصیحت پلے باندھی۔ گھر آ کر انہوں نے
خاصے پیسے لیے اور تھانے کا رخ کیا۔

لسانی تنظیم کے ایک سرکردہ رکن کی والدہ کی تھانے میں آمد کوئی معمولی
بات نہیں تھی۔ کسی کی مجال تھی کہ ان کے حکم سے انکار کرتا۔ موقع پر موجود
اہلکاروں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور ڈرتے ڈرتے بابر کی والدہ سے معمولی

رشوت وصول کرکے دوپہر کے اوقات میں اُن کی رپورٹ درج کرنی

تھانے میں زیادہ ذمہ دار لوگ نہیں تھے اور عملے کے زیادہ لوگ

مصروف تھے۔ یہ بات رپورٹ لکھنے والے تک ہی رہی کہ ایف آئی آر

گھنٹوں کا ہیر پھیر کیا گیا ہے۔

یہاں سے بوڑھی عورت نے مقامی تنظیم کے دفتر کا رُخ کیا

دوسرا جھوٹ یہ بولا کہ وہ صبح سے دو تین مرتبہ دفتر آئی تھی لیکن

لگا دیکھ کر واپس لوٹ گئیں۔ واقعی دفتر صبح سے بند تھا اور کچھ دیر

کھلا تھا۔

انہوں نے مقامی ذمہ داروں کو بتایا کہ بابر دو دن سے غائب ہے

ہو کر انہوں نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی ہے۔ انہوں نے روتے

تنظیم کے مقامی ذمہ داروں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ضرور اُن کے

مخالف تنظیم والوں نے اغوا کر لیا ہے۔ کیونکہ ان کے بیٹے نے کئی دفعہ ان

کا شک ظاہر کیا تھا۔

"خالہ بی! آپ بے فکر رہیے گھر تشریف لے جائیے ہم انشاء اللہ پورا

کریں گے میں سیکٹر آفس سے رابطہ کر کے انہیں صورت حال کی خبر دیتا

مقامی یونٹ انچارج نے انہیں تسلی دی اور تنظیم کے ساتھی انہیں گھر

چھوڑنے آئے۔ پھر انہیں تسلی و تشفی دے کر واپس لوٹ گئے۔

بابر کی بہنوں کو جب اس سانحہ کی خبر ہوئی تو ان کے گھر میں کہرام

محلے کے لوگ پرسہ دینے کے لیے جمع ہونے لگے۔

سفر آخر سفر ہے

عارفہ کو اچانک اپنے ہاں دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔!!

"آپ ادھر یہاں ــــ؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

شیر گل نے گھر میں داخل ہو کر معمول کے مطابق اپنی موٹر سائیکل کھڑی کی اور جیسے ہی گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اس کی نظر صحن میں بیٹھی عارفہ پر پڑی جو اس کی والدہ کے ساتھ خاموش بیٹھی تھی۔

"ہاں میں ــــ کیا میں یہاں نہیں آ سکتی۔ کیا ہوا اگر میری سہیلی اس دنیا نہیں رہی۔ میں تو ابھی زندہ ہوں" ــــ اُس کی آواز میں چھپے کرب نے شیر گل کو بھی اداس کر دیا تھا۔

وہ خاموش رہا ــــ!!

اس وقت خاموشی سے بہتر کوئی زبان نہیں تھی جو اس کے دلی جذبات کی عکاسی کر سکتی۔

"تم بیٹی کے پاس بیٹھو۔ میں چائے لاتی ہوں" ــــ نجمہ کی بوڑھی ماں جس کی آنکھیں اپنی مرحوم بیٹی کے لیے خون روتے روتے اب دھندلانے لگی تھیں ان کی طرف دیکھے بغیر کچن میں چلی گئی۔

"خدا کو شاید یہی منظور تھا۔ کاش وہ اس روز کالج ہی نہ گئی ہوتی لیکن نہیں

کوئی تو بہانہ آخر بنتا تھا"——

شیر دل نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھالتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی۔

"میں بہت عجیب سا محسوس کر رہی ہوں آپ کو مبارکباد دیتے ہوئے۔ سنا ہے کسی نے اس موذی کتے کی موت مار ڈالا ہے—— یقیناً نجمہ کی روح کو بہت خوشی ہوئی ہوگی"——!!

عارفہ نے شیر گل کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ظالموں کی رسی دراز کرنا اللہ تعالیٰ کی عادت ہے لیکن جب وہ گرفت پر آئیں تو پھر بڑے بڑے نمرود اور فرعون بھی نہیں بچ پاتے اس بے چارے کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی"——

شیر گل نے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"شیر گل! معلوم نہیں آپ میری بات کو کس انداز میں لیں گے، لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس درندے کی موت سے میرے دل پہ پڑی منوں وزنی چٹان ہٹ گئی ہے۔ میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔ اتنی کمزور کہ اپنے والدین کی عزت کے خوف سے میں نے اپنی سہیلی پر حملہ کرنے والے وحشیوں کی نشاندہی بھی نہ کی۔ لیکن خدا شاہد ہے میں نے ایسا کسی خوف سے نہیں محض اپنے والدین کی بے حرمتی کے ڈر سے کیا۔ مجھے مرنے سے خوف نہیں آتا شیر گل۔ میں ساری زندگی اسی پچھتاوے کا شکار رہوں گی کہ اس وحشی کی موت میں میرا ہاتھ کیوں نہیں تھا—— کاش میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے گلا دبا کر موت کی گہری نیند سلایا ہوتا—— کاش ایسا ہوتا"——

انٹیلی جنس کی نوکری کرتے ہوئے شیر گل کو بھی چار پانچ سال ہونے کو آئے تھے اور وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ لڑکی اداکاری نہیں کر رہی۔ اس کے

دل کی آواز ہے جو اس کے ہونٹوں کے راستے باہر آ رہی ہے۔

یہ جاننے کے باوجود کہ شیر گل کے گھر آنے کے جرم کی سزا کیا ہو سکتی ہے؟ اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا۔

واقعی وہ بہادر لڑکی تھی۔

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں عارفہ۔ میں محسوس کر سکتا ہوں تم کس ذہنی کشمکش کا شکار ہو کیونکہ اس بھیانک تجربے سے میں بھی گزرا ہوں لیکن اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ اچھا ہوا تم نے ذاکر کا نام پولیس کے سامنے نہیں لیا۔ ورنہ خدا جانے "بابا صاحب" کے غنڈے تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے لیکن تم نے دیکھا وہ مارا گیا—— وہ کتے کی موت مر گیا۔ ایک نجمہ ہی کیا نجانے ایسی کتنی معصوم اور بے گناہ لڑکیاں جنہیں اس موذی نے روحانی اور جسمانی موت سے دوچار کیا ہے آج خوش ہوں گی۔!

انسان بے بس ضرور ہے لیکن ظلم کے خلاف اگر کمزور انسان بھی ڈٹ جائے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد فرماتے ہیں"

شیر گل نے کہا——!!

اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ عارفہ صورتِ حال کو سمجھ گئی ہے۔ یہ عارفہ ہی تھی جس نے اس قاتل کی نشاندہی کی تھی اور وہ دودھ پیتی بچی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس شہر کی پولیس کم از کم ذاکر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یقیناً اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ کارنامہ کس نے انجام دیا ہے۔

"میں اس کی جان کی سلامتی کے لیے خدا کے حضور جانے کتنی دعائیں مانگ چکی ہوں شیر گل۔ جس کسی نے اس موذی کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ اس نے واقعی اس شہر کی سہمی ہوئی اور خوفزدہ لڑکیوں کو نئی زندگی سے دوچار کیا

ہے ـــــ شیر دل شاید آپ اندازہ نہ کر سکیں کہ اس شہر کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں
میں زیرِ تعلیم نجانے کتنی لڑکیاں ان غنڈوں کی بہیمیت کا نشانہ بننے کے بعد اس
خوف سے حرفِ شکایت لب پہ نہیں لا سکتیں کہ ان کے والدین اور بہن بھائیوں
کو زندہ درگور کر دیا جائے گا ـــــ آپ کو علم ہے کہ ذاکر اور اس کے درندے ساتھی
جو بلا خوف و خطر کسی بھی پاکیزہ لڑکی کی عزت کو مٹی میں ملا دیتے تھے اس کی زبان
بند رکھنے کے لیے اس کی پاکدامنی کا خون کرنے کے بعد اُسے یہ احساس دلاتے
تھے کہ اگر اس نے اپنی زبان کھولی تو اس کی بہنوں اور بعض حالتوں میں ماں
کا بھی یہی حشر ہو گا . اور یہ بے چاری لڑکیاں خوفزدہ بھیڑ کے بچوں کی طرح
ان وحشیوں کے جبر سہتی رہتی تھیں . شیر دل میرے کالج کی تین لڑکیاں گزشتہ
ایک سال کے دوران اپنی بے بسی اور بے کسی پہ بطورِ احتجاج خودکشی کر چکی
ہیں . ان ہنستی مسکراتی زندگیوں کو موت کے اندھے غار میں دھکیلنے والا یہی درندہ
درندہ ذاکر اور اس کے ساتھی تھے ...!"

○

اس مرحلے پہ اس کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموش ہو گئی .

شیر دل کی ماں چائے بنا کر لے آئی تھی اور ان کے سامنے دھری میز پہ رکھ کر پھر واپس لوٹ گئی تھی شاید ابھی تک اس کے لیے اپنے جذبات پہ قابو پانا ناممکن تھا ـــــ !

" عارفہ ! آپ کو اس بات کا احساس تو ہو گا کہ اس گھر میں آپ کی آمد سے ان لوگوں ......"

" جہنم میں گئے وہ لوگ ـ میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی مصلحتوں پہ ـ میں نے اپنے
گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ میں زندگی میں ان کے لیے پہلا اور آخری ناجائز حکم

بلانا رہی ہوں . یہ زندگی میری ہے - خدا کی عطا کردہ اس زندگی کو اپنی جان کو
اپنے آپ کو میں نے اس شہر میں جنم لے کر تنظیم کے وحشیوں کے پاس گروی
نہیں رکھ دیا . وہ کون ہوتے ہیں مجھے اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر
مجبور کرنے والے . شیر دل ! میں یہاں حوصلہ پانے آئی ہوں . مجھے اُمید کی کرن
دکھائی دی ہے - میں اندھیروں میں بھٹکنے کے بجائے روشنی میں آ کر جینا چاہتی
ہوں . خدا کے لیے مجھے بے حوصلہ نہ کرنا . میری اُمید کو اس ابتدائی مرحلے پہ
موت کی نیند نہ سلا دینا - یہ بغاوت جو میرے اندر جاگی ہے میرے جیسی کئی
مجبور اور مظلوم لڑکیوں کے لیے مشعلِ راہ بن جائے گی ـــــ شیر دل مجھے اس
ابتدائی مرحلے پہ آپ کا ساتھ چاہیئے ـــــ" اُس نے شیر دل کی بات کو غصے سے
سنتے ہوئے اچانک ہی اپنی بات کے خاتمے پہ اس کا ہاتھ تھام لیا تھا .

ایک لمحے کے لیے تو شیر دل گڑبڑا کر رہ گیا ـــــ !!

عارفہ کی اس اچانک اور قطعی لاشعوری حرکت نے اُسے بوکھلا کر رکھ دیا .
خود عارفہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیا ہو گیا ہے . اس نے حیران پریشان
شیر دل کا بازو چند لمحے تھام کر آہستگی سے چھوڑا اور شرمندہ سی ہو کر نظریں
جھکا لیں .

خود شیر دل ایسی ہی کیفیت کا شکار تھا ـــــ !
چائے دونوں کے ہاتھوں میں پکڑی پیالیوں میں ٹھنڈی ہونے لگی تھی .
دونوں نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں .

○

پہلے شیر دل نے حوصلہ کیا اور اپنی نظریں اُٹھا کر اس پہ گاڑ دیں .

"آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اور لے لیجئے" ــ یہ کہتے ہوئے اُ
نے کیتلی میں موجود چائے اس کے کپ میں انڈیل دی تھی۔

سحر زدہ سی عارفہ نے کسی معمول کی طرح اپنا پیالی والا ہاتھ آگے کر دیا۔
"عارفہ! میں اس لمحے خود کو بہت کمزور محسوس کر رہا ہوں مجھے کچھ نہ
آ رہی کہ تمہاری بات کا کیا جواب دوں۔ مجھے علم نہیں کہ تمہارا یہ فیصلہ درست
یا واقعی تم نے سوچ سمجھ کر بغاوت کی یہ راہ اپنائی ہے۔ اس کے باوجود
نہیں ایک بات ضرور رکھوں گا کہ انسانوں کی جس قبیل سے میرا تعلق ہے
بزدلی کو بے غیرتی کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے بھائی
کرنے نہیں جا رہا۔ تم سمجھدار ہو اور جان گئی کہ ذاکرہ کو اس بھیانک انجام
کس نے پہنچایا ہے۔ میں ایک پڑھا لکھا اور سرکاری ملازم ہوں۔ ڈسپلن
زندگی میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ میں نے ہمیشہ ایک تنظیم اور قاعدے
زندگی بسر کی ہے۔ اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اُسے مرنا ہے۔ آج نہیں
کل، لیکن بے غیرتی کی زندگی سے عزت کی موت بدرجہا بہتر ہے۔ یہ سبق
پیدا ہوتے ہی سکھا دیا جاتا ہے۔ نجمہ مجھے کتنی عزیز تھی تمہیں بتانے کی
نہیں۔ اگر وہ ٹریفک کے کسی حادثے میں ماری جاتی تو ہم اُسے خدا
جان کر قبول کر لیتے لیکن کوئی بھی وحشی درندہ محض اس زعم میں کہ
کو جان سے مار ڈالے کہ قانون نافذ کرنے والے اس کے سامنے
ہیں اور اُسے قتلِ عام کا لائسنس محض اس لیے مل گیا ہے کہ وہ حکمران
کمزوری بن چکا ہے۔
قانون کی اطاعت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر حکومت کسی کو کھلی
غنڈہ گردی کی اجازت دے دے تو ہم اس کی وحشت اور بہیمیت پر

تماشائی بنے رہیں۔ دنیا کی عدالتوں نے اس فانی زندگی کے ساتھ دم توڑ دینا ہے
لیکن خدا کی عدالت ایک دائمی حقیقت ہے جہاں ہم سب نے اپنے اعمال کی جوابدہی
کرنی ہے۔ ایک ایسا شخص جس کے ہاتھ پیر سلامت ہوں اور اس کی بہن کو
محض اس لیے درندگی کی بھینٹ چڑھا دیا جائے کہ اس نے وحشیوں کی اطاعت
سے انکار کر دیا، اپنی عزت کو اپنی جان پر مقدم جانا ـــ شیدہ کے اس عمل
نے اُسے تو خدا کے دربار میں سرخرو کر دیا لیکن اس کا بھائی جسے کل خدا کی
عدالت میں پیش ہونا ہے وہاں کیا منہ لے کر جائے گا۔ جہاں انسانی قانون
بے بس ہو جائے وہاں مکافاتِ عمل ہوتا ہے۔ جو ہو کر رہا۔ مجھے خوشی ہے
کہ تم نے ایک روایت قائم کی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ
اب ہر کوئی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے گا لیکن یہ ضرور ہے
کہ قانون نافذ کرنے والے ضرور سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ مصلحتوں کا شکار
ہو کر وہ ظالموں کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بنے رہیں اور اپنے فرائض ایمانداری
سے انجام دیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ بغاوت کی وہ راہ جو تم نے اپنائی
ہے دراصل سلامتی کا راستہ ہے۔ باغی تو تم اس سے پہلے تھیں۔ خدا کے
احکامات کی باغی ـــ تم نے دنیاوی مصلحتوں کو مقدم جانا اور کسی بھی خوف کا شکار
ہو کر خدا کے احکامات کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے حقائق جن کا تمہیں
علم تھا کی پردہ پوشی کی اور نہ صرف یہ بلکہ بے گناہوں کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا۔"

○

ایک لمحے کے لیے رُک کر اس نے عارفہ کی آنکھوں میں جھانکا جو تابعدار
مریدنی کی طرح احترام کے بے پناہ جذبات کے ساتھ اس کے چہرے پر نظریں
جمائے اس کی بات سُن رہی تھی۔

"یہ تو سلامتی کی راہ ہے ___ بدبخت انسانوں کا ایک ایسا گروہ جس نے ناجائز ذرائع، دھونس، دھاندلی، مروجہ گھٹیا اور ذلیل قسم کی سیاست کے بل بوتے پر اتنی طاقت حاصل کر لی ہے کہ اب وہ ریاست کی سالمیت کے لیے چیلنج بن رہا ہے اور خدا کے نام پر لاکھوں جانوں کا نذرانہ دے کر حاصل کردہ اس ملک کو توڑنے پر تُلا بیٹھا ہے۔ ایسی انسانیت کش لسانی تنظیم کے خلاف اپنی حد تک علمِ بغاوت بلند کرنا جہاد ہے۔ اسی میں ہم سب کی سلامتی ہے کاش اس شہر کے مردوں کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو جائے۔ کاش کمزور اور ان کے زرد حکمرانوں کو بھی علم ہو جائے کہ مصلحت اور منافقت جہنم کا راستہ ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم نے جو راستہ اپنایا ہے اس پر ہر قدم پر تم مجھے اپنا ساتھی بشانہ موجود پاؤ گی۔ سچائی کے اس سفر میں آنے والی موت شہادت ہے اور شہادت کی موت ہی کسی مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے۔ پاکستان کے دشمن ملک کے دشمن ہیں ان کے خلاف تم خود کو کبھی اکیلے محسوس نہیں کرو گی!"

اپنی بات کے خاتمے پر شیر گل نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

عارفہ محسوس کر رہی تھی کہ قدرت نے اسے صحیح مقام پر پہنچا دیا ہے اور زندگی کے گھور اندھیروں میں اس نے جو شمع روشن کی تھی اس کی لو کچھ پل کی کے لیے سہی اندھیروں کی موت ضرور بنے گی۔

"شیر گل میں یہاں آئی تو ایک کمزور لڑکی تھی لیکن تم نے مجھے جس جرأت سے نوازا ہے وہ میرا سرمایہ افتخار ہے۔ میں تمہیں ان لوگوں کی ہر ایسی سازش کا سراغ لگا کر دوں گی جس سے ملک و ملت کو کوئی خطرہ درپیش ہو جس کے بعد تم اس قابل ہو سکو کہ کوئی جرم کرنے سے پہلے ہی ان موذیوں کی گردن دبوچ لو۔"

"کاش ایسا ممکن ہو" ___ شیر گل نے دل ہی دل میں کہا۔

"مجھے اب چلنا ہو گا" ___ عارفہ نے وقت کا احساس کیا۔

"آؤ میں تمہیں سٹاپ تک چھوڑ آؤں۔"

شیر گل بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی والدہ نے دونوں کی باتیں تو نہیں سنی تھی لیکن سب کچھ اپنے وجدان سے جان لیا تھا۔

"بیٹی کبھی کبھی آ جایا کرو۔ تجھے دیکھ کر مجھے تجھ....." بوڑھی لیکن حوصلہ مند عورت نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور منہ موڑ کر واپس مڑ گئی شاید وہ اپنے آنسو اپنے بیٹے سے بھی چھپانا چاہتی تھی۔

دونوں باہر آ گئے ___!

دوپہر ڈھل چکی تھی اور شہر نگاراں پر شام اترنے لگی تھی۔ سمندری ہواؤں نے دوپہر کے حبس زدہ ماحول کو قدرے تازگی بخش دی تھی۔ دھوپ کی جان توڑ تپش دم توڑ چکی تھی۔

○

دونوں قدم بہ قدم اپنی اپنی سوچوں میں گم ایک دوسرے کے بہت قریب ہو کر چل رہے تھے۔ شیر دل نے آج پہلی مرتبہ پوری واقفیت کے ساتھ عارفہ کی قربت کا احساس کیا تھا۔ شام کے آغاز پر جو تیز ہوائیں اس ساحلی شہر میں چلا کرتی تھیں انہوں نے عارفہ کے گھنیرے بالوں سے اٹھکیلیاں شروع کر دی تھیں۔ اس کے جسم کی سنولاہٹ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں کا فسوں سمندر کی طرح گہرا اور پُر اسرار ہونے لگا تھا۔

ایسے ہی وقت میں اپنے دوپٹے اور بالوں کو سنبھالنا عارفہ کے لیے کارِ دارد تھا۔ اس نے دوپٹے کو مضبوطی سے گلے اور سینے پر لپیٹ لیا تھا اور بار بار تیز ہوا کے ساتھ بکھرنے والی بالوں کی لٹ کو کبھی گردن ہلا کر اور کبھی ہاتھ سے پرے

لٹادیتی تھی۔

سارناتھ کے قدیم مندروں میں رہنے والی دیوداسیوں کی طرح اپنی
گہری اور پُر اسرار آنکھوں کے ساتھ وہ زمین پر اس طرح جا جا کر قدر
جیسے اُسے ڈر ہو کر ہوا اُڑا کر کہیں دُور نہ لے جائے۔ شیر گل کو اس
کر اپنے گاؤں والے گھر میں لگے وہ جامن یاد آرہے تھے جو ساون کی
کے ساتھ بھیگ کر زمین پر آگرتے اور زمین پہ بچھی گھاس انھیں
اپنے سینے پر محفوظ و مامون بٹھالیتی جیسے نوزائیدہ بچوں کو ان کی مائیں
سینوں پہ لٹا کر لوریاں دیا کرتی ہیں۔

پتھریلے اور دشوار گزار پہاڑوں کے درمیان والی بستی میں جنم لے
شیر گل جس کے کانوں نے بچپن ہی میں گولیوں کی آوازوں سے آشنا
کر لی تھی اور جو بظاہر اپنے جسم میں فولاد کا دل لیے گھومتا تھا آج آگ کا
دھرے موم کی طرح پگھل رہا تھا۔ اس کے جسم میں آج پہلی مرتبہ خون کی
وانبساط کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

بس سٹاپ نزدیک آرہا تھا اور شیر دل سفر کبھی ختم نہ ہونے کی دعا
کر رہا تھا۔

لیکن —

سفر آخر سفر ہے۔ عارفہ کی منزل آگئی تھی۔

دونوں خاموش پہلے سے وہاں موجود لوگوں کے ساتھ کھڑے ہو
کے دل زور سے دھڑک رہے تھے۔ اس دھڑکن کی گونج ان کے جسموں
ہی اندر بہت گہری اُترتی چلی جا رہی تھی۔

"ویگن آگئی۔ مجھے اب جانا ہوگا" — عارفہ نے اُسے حقائق کی دنیا

تے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا منتظر رہوں گا" —

قریب آتی ویگن کے انجن کے شور میں اس نے کہا۔

"میں ضرور آؤں گی — جلدی آؤں گی۔ خدا حافظ!"

عارفہ نے کہا اور ویگن کی طرف چل دی۔

"خدا حافظ" — شیر گل نے کہا۔

وہ سٹاپ پر کھڑا ویگن کو اس وقت تک جاتے دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں
ے اوجھل نہیں ہو گئی۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر واپس لوٹ آیا۔

احسان شناس

کالیا شام کو جب عارف میاں سے ملنے آیا تو بابر کے غائب ہونے کی خبر
چونکا دیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا ــــ؟" کالیا نے حیرانگی سے پوچھا۔

"میرا مطلب کیا ہے؟ یار میں نے کوئی غیر ملکی زبان نہیں بولی۔ وہ گزشتہ
دن سے غائب ہے اور سنا ہے کہ اس کی والدہ نے تھانے میں اس کے
رپورٹ بھی لکھوا دی ہے" ــــ عارف میاں نے وضاحت کی۔

"بھاگ گیا سالا" ــــ کالیا نے اُسے گالی بکتے ہوئے کہا۔

"یا بھگا دیا گیا" ــــ عارف میاں نے معنی خیز نظروں سے اس کی
ہوئے کہا۔

اس نے کالیا کو کچھ سوچنے کا موقع دیئے بغیر اسے اُلجھن میں ڈال
اس سے پہلے کہ وہ لوگ اس کے متعلق کچھ سوچتے عارف میاں نے
ان کے کورٹ میں پھینک دی۔

"کیا بات کر رہے ہو تم ــــ ہوش میں تو ہو" ــــ کالیا چکرا کر بولا
"کالیا! ہم میں کوئی دشمن کا آدمی بیٹھا ہے۔ جو بھی فیصلہ ہوتا
اطلاع باہر آ جاتی ہے۔ مجھے پہلے سے شک تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا

اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ ہم میں غدار بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ ضرور کسی نے بابر کو بتا دیا ہوگا کہ اس کے قتل کا حکم جاری ہو چکا ہے اور وہ بھاگ گیا ــــ یہ اغوا کی رپورٹ تو مجھے کوئی ڈرامہ ہی نظر آ رہا ہے ــــ اس کے پس پردہ کوئی اور کھیل کھیلا گیا ہے ــــ خیر! جائے گا کہاں ہیں تو اُسے زمین کی ساتویں تہہ سے نکال کر بڑے بھائی کے سامنے پیش کر دوں گا" ــــ!

عارف میاں بڑی شاندار اداکاری کر رہے تھے۔!!

"مجھے بھی معاملہ گڑبڑ ہی نظر آتا ہے۔ بڑے بھائی کو اطلاع ہو گئی ہے یا نہیں" ــــ؟ کالیا نے پوچھا۔

"میں نے تین چار فون کیے ہیں۔ مل نہیں رہے۔ میرے خیال سے اُن کے ہاں چلتے ہیں۔ مل کر بات کریں گے" ــــ عارف میاں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے" ــــ کالیا گھبرایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے یہ خوف دامن گیر ہونے لگا تھا کہیں بابر کے فرار میں اس کا ہاتھ شامل نہ کر دیا جائے کیونکہ کالیا کو بڑے بھائی نے عارف میاں سے دو روز پہلے اعتماد میں لے کر یہ حکم سُنایا تھا اور اس بات کے امکانات زیادہ تھے کہ اس پر شک کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ عارف میاں کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی بابر غائب ہو چکا تھا۔

دونوں تھوڑی دیر بعد عارف میاں کی گاڑی پر بڑے بھائی کی طرف جا رہے تھے۔ بڑے بھائی کسی کام سے گھر سے باہر تھے دونوں مہمان خانے میں اُن کے منتظر تھے۔ رات گئے جب بڑے بھائی کی واپسی ہوئی تو ان کی لٹکی ہوئی شکلیں دیکھ کر اُن کا ماتھا ٹھنکا۔ بڑے بھائی دوسرے شہر گیا ہوا تھا اُسے ابھی تک بعد میں پیش آنے والے واقعات کا علم نہیں ہُوا تھا۔

بڑے بھائی نے ملاقات کے لیے بیٹھے باقی لوگوں سے معذرت کر کے انہیں

اگلے روز آنے کا کہہ دیا اور خود ان لوگوں کے ساتھ اہم میٹنگ کا بہانہ کر کے دوسرے
کمرے میں چلے گئے۔

"بنے بھائی بھاگ گیا سالا"۔۔۔! اس مرتبہ کالیا نے پہل کی۔

"نہیں بنے بھائی بھگا دیا گیا"۔۔۔ عارف میاں نے حملہ کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا"۔۔۔ بنے بھائی کا پارہ اچانک چڑھ گیا۔

"اس کی ماں نے پولیس میں رپورٹ درج کروائی ہے کہ بابر دو دن سے غائب
ہے"۔۔۔ کالیا نے وضاحت کی۔

"کہیں جھوٹ تو نہیں کہہ رہی وہ"۔۔۔ بنے بھائی نے غصے سے کہا۔

"نہیں بنے بھائی میں نے اچھی طرح انکوائری کر لی ہے۔ دو دن سے اُسے
کسی نے نہیں دیکھا۔ مقامی یونٹ میں تو اس کا آنا جانا پہلے بھی کم تھا۔ اب تو وہ اِدھر
کا رُخ ہی نہیں کرتا تھا"۔۔۔ عارف میاں نے وضاحت کی۔

"یہ بھی تو ممکن ہے مخالفوں نے اُسے اغوا کر لیا ہو۔۔۔ آخر اس کے رشتہ دار
تو بہت تھے"۔۔۔ کالیا نے کہنا چاہا۔

"کالیا یار تم آخر یہ ثابت کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو کہ وہ خود غائب نہیں
ہوا۔ جبکہ میرا استدلال یہ ہے کہ وہ خود غائب ہوا ہے۔۔۔ اور عین ممکن ہے
کہ اُسے دو دن پہلے ہی کسی نے بھاگ جانے کا مشورہ دے دیا ہو۔ آخر آستین
کے سانپ کہاں نہیں پائے جاتے۔ یہ جو سرکاری ایجنسیوں کے لوگ شکاری کتوں
کی طرح ہماری بو سونگھتے پھرتے ہیں تو کیا وہ جھک مار رہے ہیں۔۔۔ کوئی نہ کوئی
انہیں اپنے کام کا آدمی ملا ہو گا"!

عارف میاں نے بڑی چالاکی اور چکر بازی سے کالیا کو ایسی دلدل میں
دھکا دے دیا تھا کہ اب اس کے بچنے کی امید ہی کم نظر آ رہی تھی۔ اس نے

بڑی مکاری سے بنے بھائی کے ذہن میں یہ بات ڈال دی تھی کہ بابر کو دو روز
پہلے اپنے متعلق تنظیم کے فیصلے کا علم ہو گیا ہو گا اور اس کا اشارہ اس سلسلے میں
نام لیے بغیر کالیا کی طرف تھا۔

اب صورت حال یہ بن گئی تھی کہ کالیا کو عارف میاں اس طرح ہیر پھیر کر کے
بات بناتے تھے کہ وہ بے چارہ مسلسل صفائیاں پیش کر رہا تھا جس سے بنے بھائی کے
ذہن نے یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ اگر یہ بے قصور ہے تو عارف میاں کی طرح جرأت
سے بات کیوں نہیں کر رہا اور اس طرح گھبرایا گھبرایا سا کیوں نظر آ رہا ہے؟

بنے بھائی کھانے کا کہہ کر اگلی کوئی بات سنے بغیر دوسرے کمرے میں چلے
گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ فون پر "۹۵" میں بات کر رہے تھے۔ جہاں سے مشورے
کے بعد انہوں نے کوئی انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

○

کالیا تنظیم کا بڑا پرانا جاں نثار رہا تھا۔ اب تک بنے بھائی کے حکم پر وہ درجنوں
بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ اس نے عارف میاں کی طرح بھارتی
ایجنسیوں کے ٹریننگ کیمپ میں خصوصی تربیت حاصل کی تھی۔ اب تک ملک کے
کئی انتہائی اہم اور خفیہ راز کالیا کے ذریعے "را" کو پہنچ چکے تھے۔

اب تک درجنوں باغیوں کی ماؤں بہنوں کی وہ کالیا کے ذریعے بے حرمتی
کروا چکے تھے۔ اتنے اہم شخص کے متعلق بنے بھائی اکیلے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔
انہیں بہرحال مشاورت درکار تھی۔

شاید دوسری طرف بھی قسمت عارف میاں کی یاوری کر رہی تھی کیونکہ جس
اہم اہلکار سے بنے بھائی نے بات کی تھی۔ وہ قتل غارت گری سیل کا انچارج
تھا اور اس نے بنے بھائی سے کہا تھا کہ جو شخص پہلے ہی کے لیے ان کی خاطر سب

کچھ کر سکتا ہے۔ وہ پیچھے رہ کے لیے دوسروں کے لیے بھی بہت کچھ کر سکتا۔
عین ممکن ہے وہ کسی سرکاری ایجنسی سے مل گیا ہو اور اسے انہیں اس بات کی اطلاع
دی ہو۔ بابر بھی تو کسی سرکاری ایجنسی کے لیے کام کر رہا تھا اُن لوگوں نے
کی اطلاع پر اُسے فوراً غائب ہو جانے کا مشورہ دیا ہوگا۔

بڑے بھائی کے دماغ میں یہ بات ایسی بیٹھی کہ پھر وہ اسی پر قائم رہے۔ انہوں
نے سوچا یوں بھی کالیا ان کے اتنے گناہوں میں شریک ہو چکا ہے کہ اگر وہ کسی
ایجنسی کے ہتھے چڑھ گیا تو اُنہیں جہنم رسید کروا دے گا۔

اس مرتبہ جب بڑے بھائی کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ دو
باڈی گارڈ بھی موجود تھے۔

"باندھ دو سالے کو اور لے جاؤ "و ۵" میں" انہوں نے اندر داخل ہوتے
ہی کالیا کی طرف اشارہ کر کے انہیں حکم دیا۔

دونوں کے کالیا کی طرف بڑھنے سے پہلے عارف میاں کا ہاتھ چل گیا۔ انہوں
نے اچانک اُٹھ کر کھڑے ہونے والے کالیا کے گھٹنے پر ایسا ہاتھ مارا کہ وہ منہ کے
بل نیچے آن گرا۔

"سالا! بھاگنا چاہتا ہے۔ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ کمینہ پاجی۔ میں
تیری کھال کھینچ کر جسم سے الگ کر دوں گا"—

عارف میاں اپنی اداکاری کے مکمل جوہر دکھا رہے تھے اور دونوں باڈی
گارڈ کالیا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر وہاں پھینک گئے۔!!

"ایمبولینس کے لیے فون کر دیا ہے— اپنے مریض کو ہسپتال لے جا کر اس
کا خوب علاج کرو۔ اس سے سچ اگلائے بغیر اسے مرنے نہ دینا۔"

بڑے بھائی نے عارف میاں سے کہا جو انکساری اور جاں نثاری کی تصویر بنے

کے ہر حکم پر اس طرح سر ہلا رہے تھے جیسے اُن کے ایک اشارے پر اپنا دل اپنے
ہاتھوں نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں گے۔

"تم نے اچھا نہیں کیا عارف میاں۔ میں کتنا بُرا سہی تمہارے خلاف میں نے
کبھی زبان نہیں کھولی۔ جو شخص میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر تمہارے حوالے کر رہا ہے۔
اس نے مجھے بھی حکم دیا تھا کہ معمولی شک گزرنے پر تمہیں گولی مار دوں۔ میں چاہتا
تو یہاں آنے سے پہلے تمہارا کام تمام کر کے کہہ دیتا کہ تم نے بابر کو فرار کروایا ہے
اور کوئی مجھ سے نہ پوچھتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا— جبکہ تم نے کم از کم اس
ورنہ مجھے غلط پھنسوایا ہے حالانکہ تم سے زیادہ بہتر اس بات کو کوئی نہیں جانتا
کہ میں نے بابر کو فرار نہیں کروایا۔

عارف میاں مجھے اب بھی تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ اوّل تو یہ لوگ مجھے
اب زندہ نہیں چھوڑیں گے کیونکہ میں ان کے بے شمار گناہوں کا عینی شاہد ہوں۔
ایک بات میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اگر میں زندہ بچ گیا تو اپنے
گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے بڑے بھائی کو کتے کی موت ضرور ماروں گا۔
یہ میرا خدا تعالیٰ سے عہد ہے اگر اس نے اپنی رحمت کی اور میرے گناہ معاف
کر دیے تو وہ مجھے ضرور گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی مہلت دے گا۔"

○

بابر والے واقعے کے بعد سے عارف میاں کو یوں محسوس ہونے لگا تھا
جیسے کسی نے اُن کا دل نکال کر وہاں کوئی اور دل رکھ دیا ہے۔ ان کے خیالات
پھر بدلنے لگے تھے کم از کم تنظیم کے معاملے میں انہیں کوئی غلط فہمی باقی نہیں
رہی تھی۔

اس وقت بھی عجیب حادثہ گزرا—!

انہیں یوں لگا جیسے کالیا سچ کہہ رہا ہے۔ جیسے واقعی اس کے خیالات بدل گئے ہیں اور عارف میاں جیسے بے شمار نوجوانوں کو بلیک میلنگ کے ذریعے وطن سے غداری پر مجبور کرنے والے بنّے بھائی کو جیسے واقعی کالیا قتل کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے۔

"کالیا مجھے اس بات کا تو علم نہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو یا سچ ۔۔۔ لیکن اگر واقعی تمہارے اندر کوئی انقلاب آ گیا ہے تو میں بھی اتنا گرا ہوا انسان نہیں کہ تمہیں اس طرح مر جانے دوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم ایک دفعہ ضرور ان کے چنگل سے نکلو گے، اور ہاں بنّے بھائی کا بہت سا قرض میں نے بھی لوٹانا ہے۔ لیکن تم کچھ کیے بغیر مر بھی گئے تو مطمئن رہنا کہ میں تمہارے حصے کا کام کر دوں گا۔"

باتیں کرتے کرتے وہ کالیا کے ہاتھوں کی رسیوں کی گانٹھیں کھول کر انہیں اتنی ڈھیلی کر چکا تھا کہ اب وہ آسانی سے اپنے پاؤں کی رسیاں کھول سکتا تھا۔

"ایمبولینس آ گئی ۔۔۔" بنّے بھائی نے اچانک اندر آ کر انہیں مطلع کیا۔ بنّے بھائی کے چہرے پر برستی لعنت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے بنّے بھائی مریض کو بھیج دیتے ہیں ۔۔۔ میں بھی پہنچتا ہوں اور کرتا ہوں اس کا آپریشن۔"

عارف میاں کی بات ختم ہونے پر بنّے بھائی کے حلق سے بلند ہونے والے خونخوار قہقہے سے کمرے کے در و دیوار ہل کر رہ گئے تھے۔

"آؤ میاں چلتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے عارف میاں نے زمین پر گرے کالیا کو اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

کالیا نے اٹھتے ہی بنّے بھائی کو گالیاں دینی شروع کر دی تھیں۔

عارف میاں نے غصے سے پھنکارتے ہوئے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔

"بہت زبان چلتی ہے سالے کی۔ اے میراں منہ کیا دیکھ رہے ہو جا کر ٹیپ لاؤ ۔۔۔ ابھی اس کی زبان بند کرتا ہوں۔" ۔۔۔ اس نے مسلح باڈی گارڈ کی طرف دیکھ کر کہا۔

بنّے بھائی گالیاں سن کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا ۔۔۔ باڈی گارڈ ٹیپ لینے چلا گیا۔

"میاں بھاگنے کی کوشش نہ کرنا مسلح باڈی گارڈ موجود ہیں۔ ایمبولینس میں صرف دو نرسیں ہوں گی۔ وہاں موقع مل جائے گا۔" ۔۔۔ اس نے کالیا کے کان میں سرگوشی کی۔

باڈی گارڈ ٹیپ کا رول لے آیا تھا۔

"اب بولتے رہنا بیٹا ۔۔۔" کہتے ہوئے اس نے مغلظات بکتے کالیا کے منہ کو ٹیپ سے بند کر دیا۔

اسے قریباً گھسیٹتا ہوا وہ برآمدے تک لایا تھا جس کے ساتھ ہی تنظیم کے میڈیکل یونٹ کی ایمبولینس کے باہر دو مستعد نرسیں اپنے "مریض" کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔

دونوں نوجوان تھیں۔

لیکن ۔۔۔

ان کے چہروں سے درندگی اور آنکھوں میں وحشت برس رہی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے انہوں نے کوئی نشہ کر رکھا ہو۔ کالیا کی شکل پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھوں میں پہلے سے موجود وحشت دوچند ہو گئی۔

"لو بھئی ذرا خیال سے لے جانا ۔۔۔ مریض کی حالت بڑی نازک ہے۔"

عارف میاں نے آنکھ دبا کر انہیں کہا۔

"بے فکر رہیئے ڈاکٹر صاحب ہم خدمت میں کوئی کمی نہیں آنے دیں گے۔"

ایک نرس نے بڑا فحش اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"چل بیٹا ایمبولینس کے اندر آرام کر لے"۔ عارف میاں نے اسے ایمبولینس کے پچھلے کھلے دروازے کے نزدیک پہنچا کر کہا۔

کالیا نے جان بوجھ کر معمولی سی ہچکچاہٹ دکھائی تھی جب اچانک ایک نرس نے اس کی پسلی میں اور دوسری نے دوسری پسلی میں زوردار ہاتھ مارا۔ کالیا کے جسم کو ہم وولٹ کا کرنٹ لگا اور وہ تڑپ کر قریباً اُچھل کر اندر جا گرا۔

دونوں نے دادطلب نظروں سے عارف میاں کی طرف دیکھا جنھوں نے تنظیم کے اصول کے مطابق دونوں کے ساتھ باری باری معانقہ کر کے انہیں بھرپور داد دی۔

بڑے بھائی اس منظر سے کچھ زیادہ ہی محظوظ ہو رہے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے عارف میاں کو اندر آنے کا اشارہ کر کے واپس مُڑ گئے۔

دونوں نرسوں نے عارف میاں کو بڑے فحش اشارے کرتے ہوئے جلد "واپس" پہنچنے کی تلقین کی اور ایمبولینس کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

○

"بڑے بھائی خدا کا شکر ہے کہ اس غدار کا بروقت علم ہو گیا اور ہاں آپ بابر کی طرف سے بے فکر ہو جائیے۔ اس کے گھر والوں کو مجھ پہ بہت اعتبار ہے۔ بابر کو بھی مجھ پر شک نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے گھر والوں کے قریب رہ کر ان پہ کڑی نظر رکھوں گا۔ آخر اس کا رابطہ ان لوگوں سے تو ضرور ہو گا۔ کوئی نہ کوئی طریقہ تو اس نے پیغام رسانی کا رکھا ہی ہو گا ــــ بڑے بھائی بچ کر نہیں جا سکتا وہ۔ اب سالے کو جہنم رسید کر کے ہی واپس لوٹوں گا ــــ آپ دیکھتے رہیے گا میں کرتا کیا ہوں"۔

اس کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔

"ہاں! ہاں کیوں نہیں۔ ہمیں تم پہ فخر ہے عارف میاں اور ہم نے تمہارے بہت جلدی بہت کچھ کر دیا ہے۔ کالیا کے بعد "باباصاحب" کے حلقہ خاص میں اب تمہاری جگہ بن گئی ــــ تم اس سالے بابر کو ڈھونڈو کسی بھی طرح ــــ اور ہاں اس کے گھر والوں کو اس بات کی بھنک نہیں پڑنی چاہیے۔

بڑے بھائی اب اور کچھ نہ کیجیے گا۔ میرا خون بہت کھول رہا ہے کہیں میں اس کا بدلہ اس کے گھر والوں سے ہی نہ لے لوں۔"

"ارے گھبراؤ نہیں۔ اس کا موقع بھی تمہیں ضرور دیں گے۔ اب وہ دونوں جو بچ گئی ہیں تمہاری ہماری ملکیت ہی تو ہیں"۔

بڑے بھائی نے اپنی خباثت کا مظاہرہ ایک اور خونیں قہقہے سے کیا۔

اس دوران اچانک ہی سامنے والے کمرے کا پردہ ہٹا اور تنظیم کی خواتین ونگ کی ایک فاحشہ ٹرالی گھسیٹتی اندر آئی۔

"آؤ ــــ مہارانی۔ آؤ بھئی بہت دیر لگا دی تم نے ــــ اکیلے آئی ہو کیا ــــ"

بڑے بھائی نے اُسے آتے دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بڑے بھائی ــــ مجھے معلوم پڑ گیا تھا کہ عارف میاں کی مہمان داری بھی کرنی ہے ــــ آج بڑی خاص میزبان آ رہی ہیں آپ کے تو بھاگ جاگ جائیں گے"۔

اتنا کہہ کر اس نے دونوں کے لیے شراب سے بھری ٹرالی سے پیگ تیار کرنے شروع کر دیے۔

"ارری کچھ بتاؤ گی بھی کون ہے وہ ــــ؟" بڑے بھائی کو پیے بغیر ہی نشہ ہونے لگا تھا۔

"بڑے بھائی تمہارا مہمان بڑا خاص آدمی لگتا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ تھوڑا سسپنس اور ہے جب تم میزبان کو دیکھو گے تو یقین کر و گے۔ میری

بات تمہیں مذاق لگے گی ۔۔۔‘‘

اُس کی بات ختم ہوتے ہی سامنے کا پردہ ہٹا اور جو شکل برآمد ہوئی اُس پر نظر پڑتے ہی دونوں اس طرح اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہوئے تھے جیسے صوفے میں لگے سپرنگوں نے انہیں فضا میں اُچھال دیا ہو۔

’’آپ‘‘ دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا ۔‘‘

’’ہاں میں! بھئی کیا میرا داخلہ یہاں بند ہے ۔۔۔‘‘ آنے والی نیم برہنہ عورت نے کہا۔

یہ رخسانہ تھی ۔۔۔!!

’’بابا صاحب‘‘ کی سیکرٹری ۔!

عارف میاں نے ابھی تک رخسانہ سے اپنی پہلی ملاقات نہیں بھلائی تھی۔ عمر تو اس کی چالیس کے نزدیک رہی ہو گی لیکن وہ حلف اُٹھا کر کہہ سکتا تھا کہ رخسانہ کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں۔

’’بڑی شہرت سن رکھی تھی آپ کی۔ آپ نے تو دوبارہ ملاقات کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ ہم نے کہا خود ہی چلے آئیں۔ آج جب صغریٰ نے بتایا کہ بھیا کے ہاں آپ بھی ٹھہرے ہوئے ہیں تو میں نے کہا مجھے بھی لے چلو۔ رات کاٹ لیں گے ۔۔۔ دن میں تو کام اتنا ہوتا ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی‘‘

اُس نے اپنے بدن کو ایک خاص ادا سے جھٹک کر اُن کے سامنے والی کُرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

دونوں دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تھے ۔۔۔!!

رخسانہ عارف میاں کے بالکل سامنے اس انداز سے بیٹھی تھی کہ انہیں [illegible] کیے دے رہی تھی۔ عارف میاں پلکیں جھپکے بغیر اس کے جسم پر نظریں گاڑے [illegible]

تھے۔ اس درمیان صغریٰ نے تین پیگ تیار کر کے تینوں کے ہاتھوں میں تھما دیے تھے۔ اب وہ چوتھا پیگ اپنے لیے تیار کر رہی تھی جسے ہاتھ میں پکڑے وہ بھائی کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔

اس درمیان رخسانہ نے باری باری سب سے جام ٹکرایا اور عارف میاں کے نام کا نعرہ بلند کر کے ایک گھونٹ حلق میں انڈیل کر اُن کے ساتھ چپک گئی۔

عارف میاں دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہوئے جاتے تھے ۔۔۔!!

رخسانہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی ۔

’’بابا صاحب‘‘ کی سیکرٹری تھی ۔۔۔!!

تنظیم کے بڑے بڑے لوگ اس کی چند منٹ کی رفاقت کے لیے ترستے تھے۔ بابا صاحب نے آج تک اس کی کوئی بات نہیں موڑی تھی۔ جانے کتنوں کو اس نے پستیوں سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا اور جانے کتنے وہ تھے جنہیں اس کی معمولی سی شکایت پر بابا صاحب نے آسمان کی بلندیوں سے نامراد زمین پر پٹخا تھا پھر ان کو زندگی بھر اپنے قدموں پر کھڑے ہونا نصیب نہیں ہوا۔

خدا جانے اُسے عارف میاں کی کون سی ادا بھا گئی تھی کہ یوں بھاگی چلی آ گئی تھی۔

’’پیارا آپ نے دہلی میں کیا شادی رچائی کہ ہمیں بھلا ہی دیا ۔۔۔ عارف میاں ہم بڑے کام آنے والے لوگ ہیں ۔۔۔ کبھی آزما دیکھنا ۔۔۔‘‘ وہ عارف میاں پر جھکی جا رہی تھی۔

’’میری کیا مجال رخسانہ صاحبہ! مجھے تو ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔

کہ واقعی آپ مجھ پر اتنی مہربانی فرما رہی ہیں" ـــــ عارف میاں گھگھیائے۔

"ارے صاحب! دل آنے کی بات ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے دروازے پر بھی تانتا بندھا رہتا ہے۔ اُمیدواروں کا لیکن اس کا کیا کیجئے کہ دل کو آپ بھا گئے ـــــ آپ کبھی الگ سے ملئے ناں ـــــ کچھ مستقبل کا پروگرام" اس نے عارف میاں پر اپنا بوجھ لادتے ہوئے کہا۔

"زہے نصیب! زہے نصیب! جب آپ فرمائیں" ـــــ عارف میاں بچھے ہوئے جا رہے تھے۔

"آپ میرا پرائیویٹ نمبر رکھ لیں ـــــ اور ہاں اس بات کا خیال رہے کہ نمبر پرائیویٹ ہے صرف آپ کے لیے ـــــ"

اس نے عارف میاں کو صوفے کے ساتھ دھری چھوٹی سی میز پر رکھے قلم سے اپنا نمبر لکھ دیا جسے عارف میاں نے اُسی لمحے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

"میں خود کو کتنا خوش قسمت سمجھ رہا ہوں اس کا اندازہ شاید آپ کو نہ ہو"

عارف میاں نے اپنی باہیں رخسانہ کے گلے میں حائل کیں۔

"صاحب! کھانا تیار ہے ـــــ" بیرے نے اچانک مداخلت کی۔

"آیئے کچھ کھا لیجئے۔ پھر ساری رات باتیں ہی کرنی ہیں" ـــــ بنے بھائی نے رخسانہ کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

عارف میاں نے اسی لمحے رخسانہ کے چہرے پر بڑے واضح ناگواری کے احساسات دیکھ لیے تھے۔ اس نے بنے بھائی کے لیے اپنے جذبات چھپانے کی بالکل کوشش نہیں کی تھی۔

"جانے یہ بڈھا خود کو سمجھتا کیا ہے کم بخت" ـــــ اُٹھتے اُٹھتے اس نے عارف میاں کے کان میں سرگوشی کی ـــــ "معلوم ہوتا ہے اسے سبق سکھانا ہی پڑے گا۔"

رخسانہ کے دماغ کو شراب چڑھنے لگی تھی۔

"جانے دیجئے ـــــ تھوک دیجئے غصے کو" ـــــ عارف میاں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ کہتے ہیں تو جانے دیا" ـــــ رخسانہ نے مسکراتے ہوئے عجیب ادا کر کے عارف میاں کے جسم میں سنسنی دوڑا دی۔

کھانے کی میز پر بیٹھے عارف میاں سوچ رہے تھے کہ یہ لوگ اندر سے کتنے ٹوٹے ہیں۔ ایک ہی گناہ میں برابر کے شریک ہیں اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ صرف دکھاوے کے لیے کبھی کبھی ہنس کر بات کر لیتے ہیں۔ دراصل ان کو مشترکہ مفادات نے ایک مرکز پر اکٹھے کر دیا تھا۔

عارف میاں نے سوچا اگر کبھی ان کے مفادات بدل گئے تو یہ ایک دوسرے کو کھا لیں گے۔ شاید وہی مکافاتِ عمل ہوگا۔

○

چاروں کھانے میں مصروف تھے جب کمرے کے کونے میں رکھے سرخ رنگ کے فون کی گھنٹی بجی۔ یہ شاید بنے بھائی کا خصوصی فون تھا جس کو وہ خود سُنا کرتا تھا۔

شراب کے نشے میں دھت بنے بھائی نے فون اُٹھایا تو وہ پہلے کی طرح مستعد تھا۔ دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا اُس نے تو بنے بھائی کا نشہ ہرن کر دیا اور فون اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

بمشکل خود کو بنے بھائی نے سنبھالتے ہوئے صوفے پر ڈھیر کیا تھا۔

عارف میاں جان تو گئے تھے کہ کیا خبر انہیں سنائی گئی ہے جس نے بنے بھائی کے غبارے سے ہوا نکال دی ہے پھر بھی اُس نے بے چینی کا مظاہرہ ضروری سمجھا۔

"خیریت ہے بنے بھائی ـــــ کیا بات ہے۔ کیا بات ہے آپ....؟"

"کالیا سالا کتے کا بچہ بھاگ گیا ۔۔۔ ایمبولینس میں اس نے اپنی رسیاں کھول کر ایک نرس کو جان سے مار ڈالا اور دوسری قریب المرگ ہے ۔۔۔" بتے بھائی کے منہ سے غصے سے سوائے گالیوں اور مغلظات کے اور کوئی ڈھنگ کی بات نہیں نکل رہی تھی۔

"لیکن یہ ہوا کیسے ۔ اسے تو ہم نے یہاں سے باندھ کر بھیجا تھا"۔۔۔ عارف میاں نے تشویش ظاہر کی۔

"سمجھ نہیں آتی سالا جادوگر تھا ۔ اتنی مضبوطی سے اُسے پہرے داروں نے باندھا تھا اور وہ ....."

"بتے بھائی" ۔۔۔ اچانک عارف میاں کو ایک اور خیال آگیا۔

"کیا ۔۔۔" بتے بھائی نے اس طرح عارف میاں کی طرف دیکھا تھا جیسے وہ کہیں سے جادو کر کے کالیا کو دوبارہ باندھ کر لے آئے گا۔

"آپ کے پہرے دار ..... میرا مطلب ہے"

عارف میاں نے چبا چبا کر یہ الفاظ ادا کیے تھے اور بات کو ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"نہیں ۔۔۔ یہ اُدھر کے لوگ ہیں ۔ یہ غداری نہیں کر سکتے ۔۔۔" بتے بھائی نے فتویٰ سنا دیا۔

"بتے بھائی کیا بدمزگی پھیلا دی ہے تم نے ۔۔۔ ارے لعنت بھیجو۔ بھاگ گیا ۔۔۔ بھاگ کر کون سی ماں کے پاس جائے گا" باباصاحب کے عقیدت مند اُسے جہاں دیکھیں گے گھیر کر مار ڈالیں گے ۔۔۔ ہمارے تو رنگ میں بھنگ نہ ڈالو"۔۔۔

رخسانہ جو خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھی اپنے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میں دھرا کھانا مکمل کر رہی تھی اُسے غصہ آنے لگا تھا۔

"ہاں بتے بھائی آپ تو یوں گھبرا گئے جیسے یہ کوئی انہونی بات ہوگئی۔ ابے ابھی چند روز پہلے ہی وہ سالا انٹیلی جنس والا افسر بھی تو "و ڈ" سے بھاگ گیا تھا کیا کر لیا اس نے ۔ ہیں ہیں ....." دوسری فاحشہ کو خاصی چڑھ گئی تھی۔ اس نے ببر گل کے فرار کی طرف اشارہ کیا۔

"ایسا ماضی میں نہیں ہوا کہ ایک مرتبہ ہماری گرفت میں آنے والا کوئی ہماری مرضی کے بغیر زندہ نکل گیا ہو ۔۔۔ یہی تو پریشان کن بات ہے" ۔۔۔ بتے بھائی نے تشویش ظاہر کی۔

"بتے بھائی اگر اب تم نے اس موضوع پہ بات کی تو میں عارف میاں کے ساتھ یہاں سے چلی جاؤں گی ۔ سمجھے آپ ۔۔۔!!"

رخسانہ نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

"ارے صاحب! آپ کیوں ناراض ہو رہی ہیں ۔۔۔ زبان کاٹ کر آپ کے قدموں میں رکھ دوں گا اگر دوبارہ میرے منہ سے یہ بات نکلی ۔ میری کیا مجال ہے کہ میں آپ کے سامنے ان کی مرضی کے خلاف بات کر سکوں ۔ میں معافی چاہتا ہوں میں نے آپ کو پریشان کیا"

بتے بھائی نے کھانے کی میز کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

چاروں دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گئے ۔ بتے بھائی یوں تو یہاں ہونے والی فحش اور بے ہودہ گفتگو میں حصے لے رہے تھے ۔ لیکن ان کا ذہن ابھی تک کالیا میں الجھا ہوا تھا ۔ بتے بھائی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کالیا نے آخر اتنی مضبوط گانٹھیں کیسے کھولی ہیں ۔ اس کے ساتھ گھر میں ہمیشہ "را" کے دو خاص آدمی اس

کے پہرے داروں کی صورت میں رہا کرتے تھے اور ان دونوں سے غلطی
بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"پھر آخر کس نے اس کی مدد کی؟"

یہ تھا وہ سوال جو بنّے بھائی کو پریشان کیے دے رہا تھا۔

کہیں وہ آستین کا سانپ ان کے سامنے تو نہیں بیٹھا ہے بنّے بھائی
فوراً عارف میاں کی طرف گیا تھا۔

لیکن ——

اس وقت جس طرح "بابا صاحب" کی سیکرٹری رخسانہ اس کی جوابدہ
رہی تھی اس کے بعد تو بنّے بھائی کے لیے عارف میاں پر شک کرنا گناہ کے
مترادف تھا۔ پھر بھی اس نے اس امکان کو ذہن میں رکھا تھا۔

یہ بھی تو ممکن تھا کالیا نے کسی نرس کو ہی بہلا پھسلا کر معاملہ برابر کیا
لیکن اس کے تو منہ پر ٹیپ لگی تھی۔ وہ تو آواز نہیں نکال سکتا تھا
بات کے امکانات تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بنّے بھائی کو یاد آ گیا تھوڑی دیر کے لیے وہ غصے سے باہر آئے تھے
کالیا نے انہیں گالیاں دی تھیں اور عارف میاں نے پہرے دار کو ٹیپ لانے
بہانے باہر بھیجا تھا۔

کہیں پیرا اس سے ملا ہوا تو نہیں تھا؟ لیکن ایسا تھا تو اس نے
پھنسایا ہی کیوں؟

اس طرح کے سوالات نے بنّے بھائی کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ جتنا وہ
گتھی کو سلجھاتے وہ مزید الجھتی چلی جاتی۔

بنّے بھائی کے لیے اس وقت سوائے خاموشی سے کھانا کھاتے رہنے کے

اور کوئی چارہ باقی نہیں بچا تھا۔ بہرحال انہوں نے عارف میاں کو چیک کرنے کا
فیصلہ کر لیا تھا۔

سوائے بنّے بھائی کے سب نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا تھا اور اس وقت وہ
لوگ دوبارہ اس ڈرائنگ روم میں موجود تھے جہاں سے مے نوشی کرنے کے بعد
وہ اندر گئے تھے۔

ان کی ہوس بڑھنے لگی تھی۔

○

شاید وہ شیطانی کھیل کھیلنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے
جب اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اس کے ساتھ ہی بنّے بھائی
کا ایک پہرے دار اندر آ گرا۔ اسے کسی نے دھکا دے کر اندر پھینکا تھا۔

چاروں کو صوفوں میں لگے سپرنگوں نے اوپر اچھال دیا تھا اور وہ یوں کھڑے
ہو گئے تھے جیسے اچانک زلزلہ آ گیا ہو۔

واقعی یہ زلزلہ تھا —— !

ان کی توقع سے بھی بڑا طوفان ——

پہرے دار کے عقب سے ہاتھ میں کلاشنکوف پکڑے کالیا برآمد ہوا۔

"جس ملک سے اس کا تعلق ہے میں نے بھی اس کے باپوں سے تربیت حاصل
کی ہے۔ شاید آج کے دن کے لیے ہی میں "را" کے ٹریننگ کیمپ میں گیا تھا۔"

رخسانہ نے خوف سے کپکپاتی ٹانگوں والے بنّے بھائی سے کہا۔

"کالیا! کوئی بیوقوفی نہ کرنا —— میں تمہیں اس بات کی ضمانت دیتی ہوں کہ
بابا صاحب تمہیں معاف کر دیں گے اور تمہارے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ
کر دیا جائے گا۔" رخسانہ نے جس کے حواس ابھی تک قائم تھے کہا۔

"خبردار اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔ تمہارے "بابا صاحب" کی ..... اس نے ماں بہن
کو موٹی سی گالی دیتے ہوئے رخسانہ کو ڈانٹا ـــــ " میں ان مرزلوں کو ایک ایک
ختم کر دوں گا اور تم یہاں سے زندہ جاؤ گی تو ہی اپنے بابا صاحب کو کچھ بتا سکو گی
اب تو صبح اس کتے کے پتے کو علم ہو گا کہ اس فرعون کے گھر میں کوئی موسیٰ آ گیا ہے
جو اس کی سلطنت کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ حرام خور! مجھے تو کچھ
آئی ہے کہ تم نے میرے ساتھ کیا ظلم کیا۔ تم نے میرے ضمیر کا سودا اس دشمن سے
ہے جو نسل در نسل میرے خون کا پیاسا رہا ہے ـــــ تم غدار ہو ـــــ غدار ہو
نے اس قوم کے خون کی قیمت وصول کی ہے۔ جس نے اس ملک کی بنیادیں
خون سے استوار کی تھیں۔ تم دوبارہ ہمیں غلام بنانا چاہتے ہو۔ تم نے
نجانے کتنے نوجوانوں کو گمراہ کر کے ملک دشمنی کے راستے پر ڈال دیا
وحشی درندے جینے کا حق نہیں رکھتے۔"

وہ جنونیوں کی طرح چلانے لگا۔

اچانک ہی اس کے ہاتھ میں پکڑی گن نے شعلہ اگلا اور زمین پر گر
"را" کے ایجنٹ کا بھیجہ قالین پر بکھر گیا۔ اس نے اپنی دانست میں بڑی
کا مظاہرہ کرتے ہوئے کالیا کی ٹانگ کھینچ کر اسے گرانا چاہا تھا۔

چاروں سہم کر رہ گئے ـــــ!

"کالیا ـــ تم پاگل ہو گئے ہو ـــــ" بڑے بھائی نے حوصلہ کیا۔

"ہاں اور اب تم اس پاگل پن کا نشانہ بننے والے ہو"

کالیا نے جنونیوں کی طرح قہقہہ لگایا اور تین گولیاں اس کے سینے
اتار دیں۔ بڑے بھائی کا مردہ جسم قالین پر چند لمحے کے لیے تڑپ کر ٹھنڈا ہو
اس صورتِ حال نے ان پر خوف طاری کر دیا تھا۔ خوفزدہ فاختہ

ہوئے اچانک ہی چیخ نکلی اور وہ دیوانہ وار دروازے کی طرف بھاگی لیکن
ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ کالیا کی گن کے شعلے اسے بھی چاٹ گئے۔
موت کے خوف نے رخسانہ کے چہرے کا رنگ زرد کر دیا تھا لیکن عارف
میاں کو امید تھی کہ کالیا انہیں کچھ نہیں کہے گا کیونکہ اس نے بھی کالیا پر احسان
کیا تھا۔

کالیا نے اچانک ہی اس طرح اداکاری کی تھی جیسے اس کا پاؤں اچانک
بڑے بھائی کی لاش سے ٹکرایا ہے۔

یہ عارف میاں کے لیے بھاگ جانے کا سگنل تھا۔

عارف میاں نے موت کے خوف سے نیم مردہ رخسانہ کے بازو کو جھٹکا دے
کر اسے اپنی طرف کھینچا اور کمرے کے دوسرے دروازے سے بھاگتا چلا گیا۔
رخسانہ اس کے ساتھ کھنچی چلی آ رہی تھی۔

کالیا نے ڈرامے میں شاید حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ان کے تعاقب
میں چار گولیاں چلا دی تھیں۔

عارف میاں جیسے تیسے اسے بھگاتے ہوئے اپنی کار تک لے آئے تھے۔ کار
کے دروازے سے اس نے رخسانہ کو پچھلی سیٹ پر پھینکا اور بجلی کی سی پھرتی
سے کار اسٹارٹ کر دی۔

گاڑی روک کر اس نے بڑے بھائی کے بنگلے کا مین گیٹ کھولا تھا۔ جب وہ
دوبارہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا تو کالیا نے ان کے عقب میں پھر ایک فائر کر دیا
تھا۔ گولی شاید گاڑی کی ڈگی میں لگی تھی کیونکہ رخسانہ اس طرح زور سے چیخی تھی
جیسے گولی اسے لگی ہو۔

عارف میاں نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا اور گاڑی اڑتی چلی گئی۔ رات

کا اندھیرا خوف کے زہریلے سانپ کی طرح سڑک پر سرسرا رہا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں ناں" ۔۔۔ اس نے گردن موڑ کر رخسانہ سے پوچھا۔

"ہاں ۔۔۔ گولی ڈگی ہیں نگی ہے" ۔۔۔ رخسانہ ابھی تک اتنی خوفزدہ تھی کہ
کے منہ سے ڈھنگ سے کوئی بات نہیں نکل پا رہی تھی۔

عارف میاں نے بنے بھائی کی موت پہ دل ہی دل میں اب تک بجلے
مرتبہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا۔

"میرے گھر کی طرف چلو" ۔۔۔ رخسانہ نے اسے ہدایت دی اور اس نے
کو دوسری سڑک پہ گھما دیا۔

باغی گروپ

بابا صاحب کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے سامنے بیٹھے دونوں گدھوں کی
ہنیاں نوچ کر کھا جائے۔ اُسے بنے بھائی کی خبر اس حادثے سے بمشکل چند
ٹ بعد ہی مل گئی تھی جب تحریک کے ایک ذمے دار نے کسی اہم کام سے
ے بھائی کے ہاں فون کیا اور اسے متعدد مرتبہ فون کرنے پر بھی کوئی جواب
وصول نہ ہوا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

اپنے شکوک کی تصدیق کے لیے جب وہ ذمہ دار تحریک کے غنڈوں کی ایک
لے کر رات دیر گئے بنے بھائی کی رہائش گاہ پہ پہنچا تو تین لاشیں منہ
کھولے ان کی منتظر تھیں۔

بنے بھائی کو بھی کوئی قتل کر سکتا ہے ؟

اس سوال کا جواب یہاں موجود غنڈوں میں سے کسی کو نہ مل سکا۔ انہیں
حقیقتِ حال کا علم نہیں تھا۔ حسب روایت اُن کے گندے دماغوں نے
اس قتل کی ذمہ داری بھی "ایجنسیوں" پہ ڈال دی۔

اس ذمہ دار نے بابا صاحب کو تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر آدھی رات
فون کر کے یہ اہم خبر سنا دی۔ حالانکہ ان لوگوں کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ
بابا صاحب کو کبھی رات گیارہ بجے کے بعد سے صبح تک ڈسٹرب نہ کریں۔

کم از کم کوئی افسوسناک خبر اُسے نہ سنائی جائے۔

لیکن ــــــ

معاملات کی سنگینی نے اس ذمہ دار کو مجبور کر دیا تھا۔

بابا صاحب نے خبر سنتے فون پر ہی متعلقات بکنی شروع کر دی تھیں

کا بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا تھا کہ دماغ کی رگیں پھٹنے کو آ رہی تھیں۔ ذاکر کا

بھائی کا قتل اور وہ بھی کالیا کے ہاتھوں ــــــ؟

بابا صاحب کا دل اس بات کو ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہو رہا تھا

واقعات اُن تک پہنچے ہیں وہ صحیح بھی ہو سکتے ہیں۔

ابھی تک اُن کو جو اطلاعات پہنچائی گئی تھیں اس کا ذریعہ ایمبولینس

ڈرائیور اور کالیا کے ہاتھوں بچ جانے والی دوسری نرس تھی جس کی حالت

خطرے سے باہر تھی۔ اس کے ذریعے لسانی تحریک کے ذمہ داروں کو علم ہوا

کالیا اُنہیں مار کر بھاگ گیا تھا اور انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ نئے محلے

ہاں ہونے والے قتل کالیا ہی نے کیے ہیں۔

"رخسانہ کو بلاؤ ــــــ لیکن خیال رکھنا اُسے نیند سے بیدار نہ کرنا پڑے"

بابا صاحب نے اچانک ہی حکم دیا۔

دوسرے ہی لمحے اُن کا ایک غلام فون پر رخسانہ سے رابطہ قائم کر رہا تھا

اس نرس نے بابا صاحب کو اطلاع دی تھی کہ اُس نے رخسانہ اور صغریٰ کو

بھائی کے ہاں عارف میاں کے ساتھ دیکھا تھا۔

صغریٰ کی لاش وہاں موجود تھی جس کا مطلب تھا کہ رخسانہ اور عارف

زندہ ہیں۔

عین ممکن ہے انہیں اغوا کر لیا گیا ہو؟

یہ خیال ذہن میں آتے ہی بابا صاحب نے اپنی چیف سیکرٹری رخسانہ سے

رابطے کا حکم دیا تھا۔

صرف رخسانہ ہی ایسی تھی جس کے متعلق بابا صاحب کے نزدیکی ساتھی برملا یہ

کہہ سکتے تھے کہ وہ بابا صاحب کی کمزوری ہے۔

اُن کے آستانے پر پہنچنے والے عمالِ حکومت کے دلوں کی دھڑکنیں بابا صاحب

کے موڈ کے اتار چڑھاؤ کی محتاج رہا کرتی تھیں ــــــ اگر دورانِ گفتگو بابا صاحب کو

کسی بات پر غصہ آ جاتا تو مخاطب کی اپنی دھڑکنیں بے قابو ہوتی محسوس ہوا کرتی تھیں۔

بابا صاحب کے لیے کسی بھی بڑے یا چھوٹے حکمران کو ڈانٹ پلا دینا معمولی

بات تھی۔ لسانی تحریک کے بڑے بڑے لیڈروں کو وہ گالیاں دے کر مخاطب

کیا کرتے تھے۔

لیکن ــــــ

اس رخسانہ میں نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بابا

صاحب کے چہرے کی سختی نرمی میں بدلنے لگتی تھی۔

اُن کی اس کمزوری سے اس شہر کے اربابِ لبست و کشاد آگاہ تھے اور

بھرپور فائدہ اُٹھاتے تھے۔

ان لوگوں نے بابا صاحب تک پہنچنے کے لیے رخسانہ کو ڈھونڈ نکالا تھا۔

بابا صاحب تک اپنی کوئی بھی التجا براہ راست پہنچانا کارِ دارد تھا ــــــ اس کے

بجائے وہ لوگ رخسانہ کو استعمال کرتے تھے۔

لیکن ــــــ

رخسانہ تک پہنچنے کے لیے انہیں راستے میں آنے والی کئی رکاوٹوں کو اپنے

اپنے اثر و رسوخ کی کشتی میں سوار ہو کر عبور کرنا پڑتا تھا۔

رخسانہ کو بھی ان لوگوں کی کمزوریوں کا علم تھا۔ وہ کام کی نوعیت کے لحاظ
سے اپنا حصہ ایڈوانس وصول کر لیا کرتی تھی۔ اس شہر میں وہ کروڑوں کی جائیداد کی
مالک تھی۔ اس نے کہاں کہاں، کس کس مد میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے اس
کسی کو بھی علم نہیں تھا۔

لیکن ــــ

ایک بات سب بخوبی جانتے تھے کہ وہ کروڑوں میں کھیلتی ہے۔ دوسری
بات ہے کہ کسی کو آج تک اس کے متعلق کوئی بات اپنے لبوں تک لانے کی
جرأت نہیں ہوئی تھی۔

یہ لوگ رخسانہ کے اندر چھپی اس درندہ صفت عورت سے بخوبی آگاہ تھے
جو معمولی سی ناراضی پر بڑی بھیانک سزا دلا سکتی تھی۔ اُس نے جب بھی کسی
تحریک کے کسی بڑے کی آنکھوں یا رویئے میں اپنے متعلق غصہ یا نفرت محسوس کی
اُسے باباصاحب کے ذریعے ایسا سبق سکھایا کہ دوسروں کے لیے عبرت کا نشان
کر رکھ دیا۔

باباصاحب جیسے درندہ صفت انسان کو مطمئن رکھنے والی عورت کتنی اہم
پسند ہو سکتی تھی۔

اس کا اندازہ کوئی بھی لگا سکتا تھا ـــــ!

باباصاحب کے خصوصی عملے کے لوگوں میں سے کسی کی جرأت نہیں تھی
اپنی مرضی سے تحریک کے کسی بھی بڑے سے ذاتی سطح پر روابط استوار کرے
کیونکہ باباصاحب کے نزدیک ایسا کرنا بغاوت کے مترادف تھا۔

لیکن ـــ

یہ رخسانہ تھی جس کے بڑے بڑوں سے ذاتی تعلقات تھے۔ ان میں

تحریک ہی کے نہیں بلکہ حکومت کے بھی بڑے بڑے عہدیدار شامل تھے۔
کسی بھی سرکاری دفتر میں رخسانہ بی بی کا فون جانے کا مطلب تھا کہ یہ کام بہر حال ہونا
ہے۔ ورنہ باباصاحب کی ناراضی مول لینا پڑے گی۔

○

رخسانہ گاڑی کو اپنی رہائش گاہ پر لے آئی تھی ـــــ!

اس کی حواس باختہ شکل پر نظر پڑتے ہی اس کے سمندر کنارے موجود
شاندار بنگلے کے مستعد محافظوں نے بنگلے کا آہنی گیٹ کھولا اور اس کی کار کے گرد
گھیرا ڈال کر مؤدب کھڑے ہو گئے۔

"تم لوگ جاؤ ـــ صبح تک کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دینا۔" اُس نے
پہرے داروں کو حکم دیا۔

اپنے منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر وہ سب لوگ جس مستعدی سے یہاں آئے
تھے اُس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اپنی جگہ پر واپس چلے گئے۔

عارف میاں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارا دیا ہوا تھا اور اس
نے اپنے کندھے پر رخسانہ کا آدھا بوجھ برداشت کرتے ہوئے اس کی شاندار
خوابگاہ تک چلے آئے تھے۔

عارف میاں نے اس سے پہلے اس بنگلے کو دور سے ہی دیکھا تھا۔ تحریک کے
دوسرے لوگوں کی طرح اُسے صرف اس بات کا علم تھا کہ یہ باباصاحب کی سیکرٹری رخسانہ
کا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

اس بات کا تو اُسے بھی اندازہ تھا کہ اندر سے یہ بنگلہ کتنا شاندار ہوگا لیکن
بنگلے کے اندر کا احوال دیکھ کر اس کی حیرت گم ہو رہی تھی۔ اُسے اپنی آنکھوں
پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس ملک میں کوئی عورت اتنے قیمتی اور عظیم الشان ساز و سامان

کے ساتھ بھی زندگی بسر کر رہی ہے۔

بابا صاحب کا رہن سہن بظاہر جتنا سادہ تھا رخسانہ کا اس کے برعکس اتنا ہی شاہانہ ـــــ!

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلے سرہانے رکھے انٹرکام پر اپنی سیکرٹری سے رابطہ کیا تھا۔

"میں جب تک خود بیدار نہ ہو جاؤں کوئی کال نہ ملانا" ـــــ مختصر سا پیغام دے کر اس نے فون رکھا اور اپنے شاندار پلنگ پر بے دم سی ہو کر لیٹ گئی۔

"بیٹھو ـــــ!" اُس نے عارف میاں کو ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

تین چار گہرے سانس لینے کے بعد وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اُف میرے خدایا۔ میرا تو دل ابھی تک ڈوبا جاتا ہے۔ خدا کی پناہ! مجھے تو اپنے زندہ رہنے پر یقین نہیں آرہا ـــــ" اس کی آواز میں گھبراہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔

"آپ آرام کیجئے۔ میں آپ کے لیے کوئی جوس وغیرہ منگواتا ہوں۔ کوئی ٹرنکولائزر لے لیجئے۔ آپ کے لیے آرام کرنا ضروری ہے" ـــــ عارف میاں بچھے جا رہے تھے۔

اُسے یقین تھا کہ لسانی تحریک کی طرف سے اس قتل عام کی تفتیش ہوا تو کسی بھی کمیٹی کے عتاب سے اُسے صرف رخسانہ بچا سکتی ہے۔ عین ممکن تھا وہ انکوائری کمیٹی میں کسی بھی گھاگ ممبر کے نزدیک اپنی کسی غیر معمولی حرکت پر مشتبہ ٹھہر جاتا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لوگ اُسے محض اس لیے زندہ نہ رہنے دیتے کہ وہ ایک بڑے حادثے کا عینی شاہد ہے۔

عارف میاں نے "۹۵" میں لمبا عرصہ گزارا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کالیا کے ہاتھوں زندہ بچ جانے والی زندہ درگور نرس کی سانسوں کی ڈور تب تک بندھی ہے جب تک اس معاملے کی تحقیق میں اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے جس کے فوراً بعد تحریک کی بقا کے لیے اس کی قربانی دے دی جائے گی۔

یہ سلوک اس کے ساتھ بھی کیا جا سکتا تھا۔

ان جرائم پیشہ درندوں کے درمیان زندگی کی ضمانت کیا تھی ـــــ کسی بھی لمحے اُسے "رازداری" قائم رکھنے کے لیے کتے کی موت مارا جا سکتا تھا۔

آئے روز اس شہر کے گلی کوچوں میں لسانی تحریک کے وفاداروں کی جو لاشیں برآمد ہوتی تھیں ان میں بعض ایسے بھی ہوتے تھے جنہیں بابا صاحب کے حکم پر کسی ایک "بڑے جرم" میں حصہ لینا پڑتا تھا اور بابا صاحب کے حکم پر ہی پھر انہیں رازداری کے تحفظ کے لیے قتل بھی ہونا پڑتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو ـــــ؟" اچانک ہی رخسانہ نے اُسے چونکا دیا۔

"جی کچھ نہیں" ـــــ اس کو کہنے کے لیے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔

رخسانہ نے چند منٹ بعد ہی خود کو حیرت انگیز حد تک نارمل کر لیا تھا ـــــ!

"میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو ـــــ لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میرے جیتے جی کسی کو تمہاری طرف میلی نظروں سے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوگی ـــــ عارف تم نے میری جان بچائی ہے۔ اگر تم نہ ہوتے تو وہ پاگل کتا مجھے بھی مار دیتا۔ میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان نہیں بھولوں گی۔ تم میرے محسن ہو۔ شاید قسمت نے مجھے اسی لیے تم تک پہنچایا کہ تم میری زندگی بچا لو ـــــ یہ ٹھیک ہے کہ میں کالیا کو زمین کی ساتویں تہہ سے بھی ڈھونڈ نکالوں گی اور اسے ایسی موت نصیب

ہوگی جس کا تصور بھی شاید اس شہر میں کسی نے نہ کیا ہوگا۔ لیکن اُس لمحے وہ
جان لے سکتا تھا اس بات سے میں بخوبی آگاہ ہوں ___ تم اطمینان سے لیٹ جاؤ۔
یہ کہتے ہوئے اس نے عارف میاں کو اپنے پلنگ پر اپنے قریب ہی بازو
ہلکا سا کھینچ کر لٹا دیا۔

تھوڑی دیر بعد عارف میاں خود مانارمل ہونے لگے۔ کچھ دیر پہلے جو گزا ہوا
رخسانہ پر طاری تھی اب اُن کے ذہن پر سوار ہونے لگی تھی۔ انہوں نے زندگی میں کبھی
سوچا نہیں تھا کہ باباصاحب کی سیکرٹری اُن پر اتنی مہربان ہو جائے گی کہ اپنا آپ
ہی نچھاور کرنے پر تل جائے۔

رات دیر گئے تک رخسانہ عارف میاں کے احسان کا بدلہ چکاتی رہی۔ صبح
عارف میاں کی آنکھ اس کے بستر پر کھلی تھی۔

رخسانہ وہاں موجود نہیں تھی ___!!

تھوڑی دیر بعد وہ واپس لوٹی تو خاصی نکھری نکھری اور مطمئن دکھائی دے
رہی تھی۔ رات والی پریشانی کا دور تک نام و نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ اُس نے
عارف میاں کی رہنمائی بھی خود ہی باتھ روم تک کی اور اس کی واپسی پر اُن
کا استقبال ناشتے کی میز پر کیا۔

"باباصاحب کا فون آیا تھا" ___ اُس نے ٹوسٹ کو مکھن لگا کر عارف میاں
کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"خیریت" ___ عارف میاں کا دل دھک سے رہ گیا۔

"ہاں میں نے انہیں تمہاری بہادری اور تحریک کے لیے جاں نثاری سے آگاہ
کر دیا ہے۔ بہت خوش ہو رہے تھے باباصاحب ___ ہم ابھی تھوڑی دیر بعد
اُن ہی سے ملنے جا رہے ہیں ___ تحریک کا کوئی بھی ذمہ دار اگر تم سے کچھ پوچھے

کی کوشش کرے تو اُسے سختی سے ڈانٹ دینا"
رخسانہ نے اس کی تسلی کرواتے ہوئے کہا۔
"میں آپ کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں" ___ عارف میاں رخسانہ پر بچھے
جا رہے تھے۔
"اس منہ سے" ___
رخسانہ نے کہتے ہوئے ایک عجیب سی حرکت کر دی۔

○

تھوڑی دیر بعد ہی وہ "باباصاحب" کے آستانے پر موجود تھے۔
رخسانہ بی بی کی شکل پر نظر پڑتے ہی وہاں موجود باباصاحب کے ذاتی عملے
کے لوگوں کی نظریں جھکتی چلی جاتی تھیں۔ وہ رخسانہ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے
عارف میاں کو بھی اتنا ہی احترام دے رہے تھے۔
باباصاحب کے جس کمرے کی طرف رخسانہ اُسے لیے جا رہی تھی وہاں کوئی پرندہ
بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ باباصاحب کی خواب گاہ میں کسی کو قدم رکھنے کی مجال
نہیں تھی۔ جب کہ رخسانہ کے تعاقب میں عارف میاں منہ اُٹھائے چلتے چلے جا
رہے تھے۔

باباصاحب اکثر فراش رہتے تھے ___!!
یہ ان کی خاص ادا تھی۔
یہ ایک سگنل ہوتا تھا حکمرانوں کے لیے کہ باباصاحب کو اُن کی خوشنودی مقصود
ہے اور وہ کسی بات پر ناراض ہو گئے ہیں۔ اُن کا طبی معائنہ کرنے کے لیے بھی خصوصی
ٹیم مقرر تھی جس کے تمام ارکان لسانی تنظیم کے جاں نثار تھے۔
باباصاحب کی خواب گاہ میں قدم رکھتے ہی ایک لمحے کے لیے عارف میاں

کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑنے کا احساس ہُوا۔

بابا صاحب ایک آرام دہ تخت پوش پر ٹانگیں پسارے بیٹھے تھے اور ایک رضاکارہ بڑے خشوع و خضوع سے اُن کے پاؤں دبا رہی تھی جبکہ دوسری اُن کے چرنوں میں پاؤں پسارے بیٹھی تھی۔

"چلو تم لوگ" ـــــ انہوں نے رخسانہ کی صورت دکھائی دیتے ہی رضاکاراؤں سے کہا۔

دونوں نے قریباً جھکتے ہوئے رخسانہ کو آداب کہا اور اُلٹے قدموں کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"آؤ عارف میاں آؤ ـــــ بڑی تعریف کی ہے تمہاری رخسانہ نے۔ بھئی بڑے زبردست آدمی معلوم ہوتے ہو" ـــــ

بابا صاحب نے اتنی بے تکلفی سے عارف میاں کو مخاطب کیا تھا کہ اُنہیں اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

"بابا صاحب اگر کل یہ نوجوان اپنی جان پر کھیل کر میری جان نہ بچاتا تو ـ"

"اسے چھوڑو رخسانہ جی! ہمارے جیتے جی کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔"

بابا صاحب نے اس کی بات راستے ہی میں کاٹ دی۔

"تم ذرا چائے وغیرہ کا بندوبست کرو ـــــ" انہوں نے رخسانہ کو حکم دیا۔

رخسانہ نے تسلی دینے والی نظروں سے عارف میاں کی طرف دیکھا اور باہر چلی گئی۔

"کیا ہو گیا تھا اس سالے کالیا کو ـــــ کتے کے پلے کی یہ مجال۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔ ارے بنے بھائی کو مار ڈالا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس شہر میں قیامت کیوں نہیں آ جاتی۔ پہلے ذاکر مارا گیا اور اب بنے بھائی ـــــ اُف میرے خدایا ـ"

بابا صاحب نے عالم وحشت میں دو مرتبہ اپنی عینک اتار کر دوبارہ ناک پر جمائی تھی۔ اس دوران اُن کے چہرے پر بنتے بگڑتے تاثرات اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ غصے سے باؤلے ہو رہے ہیں ـــــ انہیں اپنے ساتھیوں کی موت کا غم نہیں تھا اس بات پر اُن کا خون کھول رہا تھا کہ اس ملک میں کون شخص ہے جس نے اُن کے دو جاں نثاروں کو جان سے مار دینے کی ہمت کی۔

"بابا صاحب! جہاں تک مجھے شک ہے ایجنسی کے لوگ ہماری صفوں میں خاصے اندر تک گھس آئے ہیں۔ یہ سب اُن ہی کا کیا دھرا ہے۔ عارف میاں نے اپنے خشک گلے میں تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"ارے کھال کھینچ لوں گا سالوں کی۔ اُن کے جسموں میں اتنے سوراخ کرواؤں گا کہ جسموں کی شناخت ممکن نہ رہے ـــــ ڈھونڈو ـــــ ڈھونڈو ان غداروں کو اور ایک ایک کر کے مار ڈالو۔ جاؤ، تمہیں کھلی چھٹی دے رہا ہوں۔ کسی سے اجازت کی ضرورت نہیں۔ اُن کے جسموں سے پاؤ پاؤ گوشت اُتار کر تڑپا تڑپا کر مار ڈالو۔ کیا ہوا کیا تھا ـــــ کیسے ہُوا؟ مجھے بتاؤ ـــــ بتاؤ مجھے ـــــ میں سوچتا ہوں کچھ مجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ باقی تو سالے سارے عیاشیوں میں پڑ گئے ہیں" ـــــ بابا صاحب کی وحشت دیدنی تھی۔

کبھی وہ اپنے سر کے بالوں میں زور زور سے انگلیاں چلاتے۔ کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہاتھ کو جھٹکا دیتے اور کبھی عینک اُتار کر اچانک اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتے پھر ناک پر جما لیتے۔

عارف میاں نے انہیں تفصیلاً ساری واردات سنانی شروع کی۔ اس نے کمال ہوشیاری سے بابا صاحب کو بھی باور کروا دیا کہ کالیا ہی اصل غدار تھا جس نے بنے بھائی کو بروقت خبردار کر کے دوڑا دیا اور جب اس کی غداری کا بھید کھل گیا تو

اُس نے بنّے بھائی کو ہی قتل کر ڈالا۔ اُس نے جان بوجھ کر باباصاحب کے ذہن میں ایک مستقل شک پیدا کر دیا تھا کہ اُن کے نزدیکی لوگوں میں ضرور ایجنٹ قسم کے لوگ موجود ہیں۔

"مجھے پہلے ہی اس بات کا شک تھا ـــــ خیر دیکھ لوں گا ـــ ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔"

باباصاحب کی لاف گزاف جاری تھی جب رخسانہ چائے کی ٹرالی لے کر آئی۔ اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی حیرت انگیز طور پر باباصاحب کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔

"اسے مرکز میں لے آؤ ـــ کام کا لڑکا ہے" ـــ انہوں نے رخسانہ کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

"جو حکم باباصاحب۔"

رخسانہ نے کہتے ہوئے چائے بنا کر اُن کے سامنے رکھ دی۔

چائے نوشی کے دوران باباصاحب بڑی مکاری سے عارف میاں کو ٹٹولتے رہے۔

وہ اس سے مختلف نوعیت کے سوال پوچھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے اُسے خصوصی میٹنگ میں اب سے ایک گھنٹہ بعد شرکت کا حکم دے کر اُسے وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔

رخسانہ اُسے اپنے کمرے میں بٹھا کر دوبارہ باباصاحب کے پاس آ گئی تھی جنہوں نے فوراً پرویز بھائی سے رابطے کو کہا تھا۔

چند منٹ میں لسانی تنظیم کے پانچ سرکردہ بھیڑیوں تک باباصاحب کا یہ پیغام پہنچ چکا تھا کہ اُنہیں فوراً میٹنگ کے لیے "آستانہ" پہنچنا ہے۔

○

اس اہم میٹنگ میں ان پانچوں کے علاوہ باباصاحب اور عارف میاں بھی موجود تھے۔ صبح کے اخباروں میں بنّے بھائی کے قتل کی خبر ان لوگوں نے پڑھ لی تھی اور ان اہم میٹنگ کے بعد ہی انہیں اگلا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

باباصاحب کے حکم پر ایک مرتبہ پھر عارف میاں نے اپنا گھسا پٹا بیان سب کے سامنے دہرایا جس میں اس نے حسبِ سابق کالیا کو ایجنسی کا ایجنٹ قرار دیتے ہوئے اس پر غداری کا الزام لگایا اور کہا کہ بابر کو فرار کروانے میں اُسی کا ہاتھ ہے۔ بنّے بھائی کو اس پر شک ہو گیا تھا۔ اسی لیے اُنھوں نے مزید تفتیش کے لیے اسے "وہ" بھیجنا چاہا تھا جبکہ کالیا راستے میں فرار ہو گیا اور اُن کی موجودگی ہی میں واپس آ کر اُس نے چار بندے بھی مار ڈالے۔

بنّے بھائی نے آخر کالیا پر ہی کیوں شک کیا تم پر....."

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ ہم تصدیق کر چکے ہیں۔ پرویز نے کچھ کہنا چاہا تو باباصاحب نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے روک دیا۔

"مجھ پر بھی شک کیا تھا انہوں نے ـــــ لیکن ایک مرحلے پر طیش کھا کر کالیا نے خود ہی تسلیم کر لیا کہ اس پر شک بجا ہے۔ اُس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن دو لوگوں گارڈز کی مدد سے ہم نے اس پر قابو پا لیا۔"

باباصاحب کے منع کرنے کے باوجود عارف میاں نے ایک ایسی کہانی سنا دی جس کا عینی شاہد اُن کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

اس کے بعد کسی کو بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ سب کو باباصاحب کی ناراضگی کی فکر دامنگیر ہونے لگی تھی۔

"بنّے بھائی اور باقی تینوں کے قتل کا الزام ایجنسیوں پر لگاؤ اور مخالف پارٹی کی

بلی بھگت قرار دے دو۔۔۔ کالیا کا نام کسی کی زبان پر نہیں آنا چاہیے۔
اُسے ۴۸ گھنٹے کے اندر اندر زندہ یا مردہ میرے پاس پیش کرو گے۔۔۔ اور تم
بابا صاحب نے اچانک ہی حاکمانہ لہجے میں اُنہیں مخاطب کیا تھا اور
انہوں نے ہاتھ کی انگلی سے عارف میاں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اگر میں بھول نہیں رہا تو اس کی دو بہنیں جوان ہیں۔۔۔ ہیں ناں۔۔۔
دونوں کو آج رات ہی "۵۹" پر پہنچا دو۔ اس کی ماں کو مار ڈالنا۔ بوڑھیا تو
اپنی جوان بیٹیوں کے اغوا اور بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت کرنے سے
گی۔۔۔ میں تنظیم کے جانثاروں کے والدین کی بہت عزت کرتا ہوں اور ان
دونوں کو میرے آنے تک چھونا بھی نہیں۔۔۔ پہلے میں پھر کوئی اور۔۔۔
اتنی عزت تو ملنی چاہیے آخر وہ کالیا کی بہنیں ہیں۔"

اپنی بات کے خاتمے پر بابا صاحب نے زوردار قہقہہ لگایا جس میں وہاں
درندوں نے اُن کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ ان سب کی آنکھوں میں خون اُتر آیا
تھا۔ ان کے چہروں پر برستی لعنت دوچند ہو گئی تھی۔ اپنے ہی ایک ساتھی
کی نوجوان بہنوں کی آبروریزی کے تصور نے اُن کے شیطانی ذہنوں میں
مچا دی تھی اور وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح جلد از جلد اپنے خون کی پیاس
بجھانا چاہتے تھے۔

میٹنگ برخاست ہو گئی

O

اگلے ہی لمحے بابا صاحب اپنے کمرے میں جمع ہونے والے اخبار نویسوں
مخاطب تھے۔ انہوں نے بڑے بھائی کے قتل کو لسانی تنظیم کے لیے کبھی نہ پورا
والا نقصان قرار دیا اور اس قتل کا الزام ایجنسیوں پر لگاتے ہوئے کہا کہ ا

کے لوگوں کی آشیرباد سے مخالف لسانی تنظیم نے یہ گھناؤنا کارنامہ انجام دیا ہے
اس ضمن میں انہوں نے مخالف لسانی تنظیم کے چار سرکردہ لوگوں کے نام لیتے ہوئے
براہ راست ان کو اس بہیمانہ واردات کا مرتکب قرار دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے
نہ صرف بڑے بھائی اور تین دوسرے لوگوں کو اُن کی رہائش گاہ پر قتل کیا بلکہ
تنظیم کے میڈیکل یونٹ کی ایک ایمبولینس پر حملہ کر کے ایک نرس کو آبروریزی
کرنے کے بعد گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور دوسری تنظیم کے ہسپتال میں قریب المرگ ہے۔

بابا صاحب نے اخبار نویسوں کو ان دونوں رضاکاراؤں پر ہونے والے گھناؤنے
ظلم کی واردات رو رو کر سنائی۔ ان کا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا اور وہ بار بار اپنی
عینک اتار کر آنکھوں میں آنے والی نمی کو صاف کرتے تھے۔

بابا صاحب نے مخالف لسانی تنظیم کی اس غیر انسانی حرکت کی زبردست مذمت
کرتے ہوئے ان پر الزام لگایا کہ انہوں نے ایمبولینس روک کر دونوں نرسوں کو
اغوا کیا اور ان کی اجتماعی آبروریزی کرنے کے بعد اُن میں سے ایک کو مار ڈالا
دوسری کی حالت بھی خطرناک ہے۔

ابھی بابا صاحب کی کانفرنس جاری تھی جب اُن کے ایک خادم نے ایک
ٹیلیفون ان تک پہنچا دیا۔

بابا صاحب نے فون پر ابھی کچھ سنا ہی تھا کہ ریسیور اُن کے ہاتھ سے
گر پڑا۔

اُن کے خادمین دیوانہ وار بابا صاحب کی طرف لپکے۔ شاید انہوں نے کوئی
انتہائی افسوسناک خبر سن لی تھی۔

بابا صاحب کمال کے اداکار تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ انہوں نے بچوں کی طرح زار و قطار

رونا شروع کر دیا۔

"حضرات! ہمیں افسوس ہے کہ باباصاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ۔ دراصل
ابھی ابھی ہمیں خبر ملی ہے کہ اس حادثے کی دوسری شکار نرس اور ہماری پیاری
ساتھی جس نے تنظیم کے لیے عظیم الشان قربانیاں دی ہیں انتقال فرما گئیں ۔ کل سے
ہمارے ڈاکٹر مرحومہ کی جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے لیکن اس حادثے
سے ان کے دماغ کو زبردست صدمہ پہنچا تھا ــــ جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں۔"

بات کرنے والے بھیڑیئے کی آواز بھرا گئی۔

یہ مقامی ایم پی اے اور تنظیم کے غنڈوں کا چیف تھا۔

"حضرات ہم آپ سے معذرت چاہتے ہیں باباصاحب کی حالت صدمے کی وجہ
سے سنبھل نہیں رہی اس لیے وہ مزید بات چیت نہیں کر سکیں گے ۔ میں حکومت کو
وارننگ دیتا ہوں کہ اگر ۴۸ گھنٹے کے اندر اس نے قاتلوں کو گرفتار نہیں کیا تو
ہم راست اقدام کریں گے ۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ حکومت اپنی ایجنسیوں کو لگام دے
ورنہ ہمارے کارکن خود ان سے نمٹ لیں گے ۔ ہمارے لیے اس وقت سب سے بڑا
مسئلہ اپنے کارکنوں کے جذبات پر کنٹرول حاصل کرنا ہے ۔ آپ سب جانتے ہیں
کہ ڈاکٹر بھائی کی موت نے ہی ان کے دل چھلنی کیے ہوئے تھے کہ اب ظالموں نے
بنے بھائی کو مار ڈالا ــــ ہم پر زبردست دباؤ ہے لیکن میں اپنے دکھی دل کے
بہنوں سے التجا کرتا ہوں کہ وہ باباصاحب کے حکم کے مطابق کوئی انتقامی کارروائی
نہیں کریں گے ۔ براہ کرم پُرامن رہیے ۔ ہمیں آپ کے جذبات کا احساس ہے
اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر حکومت نے ہمارے دیے ہوئے وقت کے اندر
قاتلوں کو گرفتار نہ کیا تو ہم خود حکومت سے نمٹ لیں گے ۔"

یہ لسانی تنظیم کا نام نہاد چیئرمین علیم شارق تھا ــــ!!

اس نے اخبار نویسوں کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کیا اور کانفرنس ختم کر دی۔

○

اشفاق بھائی کے فون کی گھنٹی بجی اور بجتے ہی چلی گئی!

اس نے حیرانگی سے فون کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ اس فون پہ آخر کس
نے کال کیا ہے ۔ کیونکہ اس فون کا نمبر اس کے چند ساتھیوں کے علاوہ کسی کے پاس
نہیں تھا اور ان میں سے کسی کو کم از کم اس وقت فون کرنے کی ضرورت بھی
نہیں تھی۔

"ذرا دیکھنا کون ہے" ــــ انہوں نے اپنے ساتھی عظمت سے کہا۔

"ہیلو" ــــ عظمت نے آواز بدل کر ہیلو کہا تھا۔

"آپ جو کوئی بھی ہوں ۔ میری ایک درخواست سن لیجیے" ــــ دوسری طرف
سے کوئی بہت جلدی میں بات کر رہا تھا۔

"کون ہو تم ــــ؟" عظمت نے سختی سے پوچھا۔

"خدا کے لیے میری بات سنیے ۔ تعارف ہوتا رہے گا ۔ کالیا یا تو آپ تک
پہنچ گیا ہے یا جلدی پہنچ جائے گا ــــ مستقبل میں وہ آپ کا بہترین ساتھی ثابت
ہوگا۔ اس وقت جیسے بھی ممکن ہو اس کی والدہ کو کہہ دیجیے کہ فوراً کہیں روپوش
ہو جائیں ۔ فوراً ۔ شام کے بعد کسی بھی لمحے ان پر قیامت ٹوٹ سکتی ہے ۔"

دوسری طرف سے بات کرنے والا بہت جلدی میں دکھائی دے رہا تھا۔

"تم کون ہو ــــ اور کیا بات کر رہے ہو ۔ کون سا کالیا ۔ تم نے کس نمبر پہ
فون کیا ہے ــــ"

عظمت نے فون کرنے والے سے تین چار سوال ایک ساتھ پوچھ کر اس
سے بات کرنے کی چال چلی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کو پہچان لے۔

"میرا حوالہ بابر کا دوست ہے ــــ کالیا سے کہنا جس نے تمہیں رہا کروایا
نے فون کیا تھا۔ خدا حافظ۔"

دوسری طرف سے بات کرنے والے عارف میاں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
جب سے "بابا صاحب" نے اُسے کالیا کی بہنوں کے اغوا کا حکم دیا تھا
بیقراری سے اس لمحے کا منتظر تھا جب اُسے فون کرنے کا موقع ملے اور وہ بابر
کے اس احسان کا بدلہ اتار سکے جو اس نے دونوں کی جان بخشی کر کے اس پر
چڑھایا تھا۔

یہ فون نمبر اُسے بابر نے دیا تھا۔

بابر کے روابط لسانی تنظیم کے باغی گروپ سے تھے جس کی قیادت
کر رہا تھا اور یہ لوگ "دستوری گروپ" کے نام سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ
بنا کر بیٹھ گئے تھے۔

یہ لوگ ابھی اس قابل بھی نہیں ہوئے تھے کہ اپنے ہی شہر میں آزادانہ
گھوم پھر سکیں۔ ان کا گناہ صرف یہ تھا کہ انہوں نے اپنے نوجوانوں کو دشمن
کا آلۂ کار بنا کر اس کے کیمپوں میں تخریب کاری کی تربیت دینے کی مخالفت
انہوں نے بابا صاحب کو باور کروانا چاہا تھا کہ جن لوگوں کی قیادت
کے وہ دعویدار ہیں وہ تو اس ملک کے قیام کے لیے اپنی قربانیوں کا خون
ہوئے ہیں۔ انہوں نے تو اس تنظیم کی بنیاد ہی اس ناانصافی پر رکھی تھی جو
کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والوں کے ساتھ روا رکھی جا رہی تھی۔

بابا صاحب تو ان کی بنیادیں ہی ڈھا دینا چاہتے تھے۔

انہیں کہا جاتا کہ یہ بڑا کم ظرف دشمن ہے۔ اُن کی مدد نہیں کرنی
استعمال کرنا چاہتا ہے۔ تنظیم کے نوجوان خون کو گرما کر ملک کی بنیادوں پر

بہانا چاہتا ہے جس میں ان کے آباؤ اجداد کا خون کام آیا ہے۔
ان مٹھی بھر سرپھرے نوجوانوں کا گناہ یہ تھا کہ انہوں نے غیر ملکی طاقت کا
ایجنٹ بننے کے بابا صاحب کے فیصلے کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اُسے ملک دشمن قرار
دیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ بابا صاحب نے لسانی تنظیم کے نام پر ایک سموک سکرین
بنا رکھی ہے۔

در اصل اصلیت وہ نہیں ہے جو انہیں بتائی گئی ہے۔
اس دھوئیں کی چادر کے پیچھے ملک و قوم کی سلامتی کے ساتھ ایک گھناؤنا
کھیل رچایا گیا ہے۔ عقل کے اندھے لیکن گانٹھ کے پورے بابا صاحب نے اپنے
غیر ملکی آقاؤں کی آشیرواد سے ملک کا نقشہ ہی بدل دینے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔
وہ ایک چھوٹی سی ریاست بنا کر اس کا مہاراجہ بن کر زندگی بتیانے کے
خواب دیکھ رہا تھا۔

وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کی مدد سے اپنا علیحدہ ملک بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔
اس گھناؤنے خواب کی تعبیر کی صورت تب ہی مل سکتی تھی جب وہ اس
سرزمین پر بدامنی اور لاقانونیت کا طوفان لے آتا۔ جس کے لیے اُسے جوان خون کی
ضرورت تھی جو اسے میسر تھا۔
اشتیاق بھائی کبھی بابا صاحب کا قریب ترین اور جانثار ساتھی شمار ہوتا تھا۔
دونوں نے مل کر بُرے دن اکٹھے گزارے تھے۔
لیکن ــــ
اشتیاق بھائی کا خواب وہ نہیں تھا جس کی تعبیر کرنے بابا صاحب جا رہے تھے۔
ان لوگوں نے کبھی یہ جان کر ہنگامہ آرائی نہیں کی تھی کہ اس طرح وہ ملک کا
شیرازہ بکھیر کر رکھ دیں گے۔

وہ تو جلسے اور جلوسوں کو جمہوری طریقے سے اپنے مطالبات منوانے کا
صحیح راستہ جانتے تھے۔

اس بات کا علم تو انہیں بعد میں ہوا کہ آج تک وہ استعمال ہی ہوتے رہے
تھے اور بابا صاحب کی شکل میں دراصل ایک خونخوار بھیڑیا اُن پر مسلط ہو گیا تھا
کے زہریلے دانت ملکی سلامتی کی جڑوں میں گہرے اُترتے جا رہے تھے۔
اشفاق بھائی کا ضمیر انگڑائی لے کر جاگا اور ایسا بیدار ہوا کہ پھر اُنہوں نے
اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ عزم کیا کہ وہ بابا صاحب کے گھناؤنے خوابوں کو
شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیں گے۔
اس کے ساتھ لسانی تنظیم کی خاموش اکثریت تھی۔
لیکن ——
کسی کو زبان کھولنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔
بہرحال ایک ایسا سرپھرا درکار تھا جو بلی کے گلے میں گھنٹی باندھتا اور
سرپھرا اشفاق بھائی تھا۔ اس نے جرأت رندانہ سے کام لے کر ایک روز
شہر کی ایک پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں کے سامنے بابا صاحب کی اصلیت
بے نقاب کر دی ——!
اس ناکردہ گناہ کی اُسے جو قیمت چکانا پڑی اس کا شاید اشفاق بھائی نے
تصور نہیں کیا تھا۔
اُسے تو یہی امید تھی کہ جس طرح اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس نے نعرہ
بلند کیا ہے اور پریس کو بابا صاحب کی اصل شکل دکھائی ہے اس کے بعد باشعور
لوگوں کی ایک فوج اس کی پشت پر آن کھڑی ہو جائے گی اور وہ بابا صاحب
کے خونی پنجے سے تنظیم کو رہائی دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن ——
اگلے روز وہ حیران رہ گیا۔
کسی اخبار نویس نے اس کی بات شائع کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اپنے
اپنے مفادات کے غلام ان قلم کی عصمت بیچنے والے صحافتی درندوں میں سے کسی کو یہ
زہن ہی نہ ہوئی کہ وہ اشفاق بھائی کی تنظیم سے علیحدگی کی خبریں شائع کر دیتا۔
انہوں نے تو اپنے قلم اور ضمیر جانے کب سے بابا صاحب کے پاس گروی رکھ دیے
تھے، وہ بھلا بابا صاحب کی ناراضی کیسے مول لے سکتے تھے۔
اشفاق بھائی کی کانفرنس کا تو اخبارات نے مکمل بائیکاٹ کیا تھا۔
لیکن ——
اُن کے حوالے سے ایک بڑی خبر کو تمام اخبارات نے اپنے صفحۂ اول پر خوب
مسالے لگا کر سرخیاں جما کر شائع کیا تھا۔
اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ لسانی تنظیم کے ناراض اور غصے سے بپھرے جلوس
نے اشفاق بھائی اور اس کے ساتھیوں کے مکانات کو آگ لگا دی ہے۔ ان کے
اہل خانہ میں سے بہت سے نفرت کی بھڑکائی اس آتش کا ایندھن بن گئے تھے۔
انہیں بابا صاحب کے غنڈوں نے زندہ باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں دی تھی۔
اُن کے اہل خانہ کی لاشیں بابا صاحب کی اگنی کی بھینٹ چڑھ گئیں۔
اشفاق بھائی اور ان کے ساتھیوں کو دیکھتے ہی قتل کر دینے کے احکامات
"اوپر" سے جاری ہو گئے۔
بابا صاحب کے تربیت یافتہ قاتل شکاری کتوں کی طرح اُن کی بُو چاروں
طرف سونگھتے پھرتے تھے۔
ان حالات میں بھی اشفاق بھائی اور ان کے ساتھیوں نے ہمت نہ ہاری اور

وہ لوگ بابا صاحب کے قہر سے بچتے بچاتے اپنے آپ کو منظم کرتے چلے گئے۔ وہ
بہت کم اس شہر میں قیام کرتے تھے اور اکثر ملک کے دوسرے حصوں میں اپنے خفیہ
ٹھکانوں پر رہا کرتے تھے۔

دستوری گروپ نے لسانی تنظیم میں موجود اپنے دیرینہ ساتھیوں سے کبھی رشتہ
نہیں توڑا تھا۔ انہیں اُمید تھی کہ جلد یا بدیر یہ لوگ اُن سے آن ملیں گے کیونکہ
بابا صاحب کی اصلیت اب بے نقاب ہونے لگی تھی۔

بابر اور کالیا جیسے باغیوں کے لیے اُن کے ٹھکانے جائے پناہ کا کام دیتے
تھے۔ تنظیم کا ہر باغی اپنی پہلی فرصت میں ان ہی سے رابطہ قائم کیا کرتا تھا
اس طرح اُنہیں قدرے اخلاقی سہارا ہی مل جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں کی
تعداد بڑھنے لگی تھی۔

انقلابی تبدیلی

عارف میاں کو اُمید تھی کہ کالیا بھی پناہ لینے کے لیے ہی سہی ادھر کا رُخ کرے
گا۔ اب جو اُن کا ضمیر جاگا تھا تو عارف میاں اپنی سی کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔
اُنہوں نے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب چکانے کا مصمم ارادہ باندھ لیا تھا۔
فی الوقت عارف میاں اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ علمِ بغاوت بلند کر سکیں۔
اُن کے ساتھ "را" کا دُم چھلا لگا تھا اور اس دلدل میں وہ بہت گہرے اُتر گئے
تھے۔ انہیں لعنت کا یہ طوق اپنے گلے سے اتارنے کے لیے کسی مضبوط سہارے اور
تحفظ و ضمانت کی ضرورت تھی۔

وہ جانتے تھے بالآخر یہ دستوری گروپ ہی اُن کا سہارا بنے گا۔

لیکن

ابھی اس میں شمولیت کا وقت نہیں آیا تھا۔

ابھی تو اُسے بڑے حساب چکانے تھے۔

اُن کے سر پہ قرض کا بوجھ آن پڑا تھا اُسے اُتارنا تھا اور اس بوجھ کو اتارنے
کے لیے انہیں کسی سرکاری سہارے کی تلاش تھی۔

انہوں نے بابر کی مدد کر کے، کالیا کو فرار کروا کر اور اب کالیا کی بہنوں کی عزت
و آبرو بچا کر درحقیقت اپنے اوپر احسان کیا تھا۔ اپنا مستقبل محفوظ کیا تھا اور

دستوری گروپ کو اپنے خاموش لیکن مؤثر حامی ہونے کا یقین دلایا تھا۔

عارف میاں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر بڑی احتیاط سے رکھتے ہو
منزل کی طرف گامزن تھے۔

صبح سے اب تک وہ رخسانہ سے چپکا ہوا تھا . .

اس نے اشفاق بھائی کو باباصاحب کے گھر سے فون کیا تھا۔

لیکن ــــــ

اتنی ہوشیاری کے ساتھ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکے۔ اس نے رخسا
بتا دیا تھا کہ وہ باباصاحب کے حکم پر کالیا کی بہنوں کو اغوا اور ان کو قتل کر
جا رہا ہے۔!

رخسانہ نے اس خبر پر بڑی مسرت کا اظہار کیا تھا۔ اس نے رخسانہ کے چ
پر اس اطلاع کا خوشگوار تاثر دیکھ کر ہی اندازہ لگایا تھا کہ رخسانہ کو اس خ
دل خوشی ہوئی ہے اور اس کے جذبہ انتقام کو خاصی تسکین بھی ملی ہے۔

"میں خود تمہارے ساتھ ان دونوں کی مہمانداری میں شمولیت کروں گی"
نے بے قابو ہوتے ہوئے عارف میاں سے لپٹ کر کہا۔

عارف میاں نے اس کے سامنے ہی "۹ ۵" میں فون کر کے تین چار لڑ
ایمبولینس کا بندوبست کر لیا تھا۔

"مریضوں کو بڑی محبت سے لے کر آنا"

شام ڈھلنے پر رخسانہ نے اس سے کہا۔

"بس ایک رات باباصاحب دونوں کے ساتھ گزار لیں۔ پھر دونوں
تصرف میں ہوں گی"

رخسانہ نے جنس زدہ عورتوں کی طرح سسکاری لی۔

"ارے کیوں نہیں ــــــ کیوں نہیں" ــــ عارف میاں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"۹ ۵" سے ایمبولینس یہاں آئی تھی اور عارف میاں یہیں سے اٹھ کر ان لوگوں
کے ساتھ ہو لیے۔

انہوں نے ایمبولینس والوں کو ان کی منزل اور مقصد سمجھا دیا تھا اور اب دل
ہی دل میں خدا سے دعا مانگ رہے تھے کہ ان کا پیغام کالیا تک پہنچ گیا ہو۔

ایمبولینس ان لوگوں نے کالیا کے گھر کے بالکل سامنے کھڑی کی تھی۔ کالیا ایک
شاندار بنگلے کا مالک تھا اور خاصے ماڈرن اور مہنگے علاقے میں رہائش پذیر تھا۔

عارف میاں نے ہاتھ میں پستول تھام کر اس حملے کی قیادت کر لی تھی۔ اس نے
اپنے من میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اگر خدانخواستہ لڑکیاں گھر میں موجود ہوئیں تو وہ بصورت
انکار بچانے کا بھلے اسے ان سب کو مارنا ہی کیوں نہ پڑے۔

تین نوجوان ان کے ساتھ تھے۔!

اس نے ہاتھ کے اشارے سے ان میں سے ایک کو دیوار پھلانگ کر اندر داخل
ہو کر مین گیٹ کھولنے کا حکم دیا۔

بلی کی سی پھرتی سے ان میں سے ایک نے دیوار پھلانگی اور اندر داخل ہو کر
مین گیٹ کھول دیا۔

اس ماڈرن آبادی کے مکینوں کے پاس اتنا وقت ہرگز نہیں تھا کہ اپنی ناک
سے آگے بھی کسی کی فکر کرتے۔ اول تو اسے کسی نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اگر کسی نے
دیکھ بھی لیا تو اس کو پولیس کو فون کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ان لوگوں
کو بخوبی اندازہ تھا کہ ایسی وارداتوں کے پس پردہ کس کا ہاتھ ہے؟

وہ اس خفیہ ہاتھ کے متعلق ایک لفظ بھی اپنی زبان پر لانے کی قیمت چکانے
کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔

تینوں اندر داخل ہو گئے۔

عمارت کی ویرانی نے عارف میاں کے دل کو قدرے حوصلہ دیا اور انہیں امید ہونے لگی کہ ان کی محنت ثمر آور ہوگی۔

"تم ادھر نکلو — تم دوسری طرف" — عارف میاں نے پستول لہراتے ہوئے دونوں ساتھیوں کو عمارت کے دروازے اور پچھلے دروازے سے اندر داخل ہونے کی ہدایت کی۔

اپنے تیسرے ساتھی کی مدد سے وہ دونوں اس کھڑکی کے راستے ڈرائنگ روم میں کود گئے۔

اگلے ہی لمحے اُسے احساس ہو گیا کہ وہ جھک مار رہے ہیں۔ بنگلے کے کمرے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔

سٹور روم اور دوسرے کمروں میں بکھرا سامان اس بات کی نشاندہی کے لیے کافی تھا کہ یہاں کے مکین بڑی افراتفری کے عالم میں اپنے گھر سے فرار ہوئے ہیں۔ وہ کپڑوں کے دو تین بکس مختلف کمروں میں اس طرح پھینک گئے تھے: بہت جلدی میں اُن سے چند جوڑے ہی نکال سکے ہوں۔

"میاں تو کوئی نہیں" — اُن میں سے ایک نے کہا۔

"کہاں مر گئے کمبخت" — دوسرے نے کہا۔

"بھاگ گئے" — تیسرے نے اپنی رائے دی۔

"لیکن جائیں گے کہاں — انہیں بہرحال آج تلاش کرنا ہے۔ بابا صاحب کا حکم ہے کہ دونوں لڑکیاں آج اُن کے سامنے پیش ہونی چاہئیں" — عارف میاں کا بظاہر پارہ آسمان کو چھوتا نظر آ رہا تھا۔

لیکن —

اُن کے دل کو جیسے قرار سا آ گیا تھا۔ اس کی محنت ثمر آور ہوئی تھی اور قدرت نے اُسے ایک بڑے امتحان سے بچا لیا تھا۔

"کہاں جا سکتے ہیں یہ لوگ — ؟"

اس نے غصّے سے جھنجھلانے کی اداکاری کی۔

"عارف میاں! چلتے ہیں اب یہاں کیا دھرا ہے" — اُس کے ایک ساتھی نے رائے دی۔

"ٹھیک ہے — چلو" —

وہ لوگ بے نیل و مرام واپس "۹ ۵" پر پہنچ گئے۔

○

بابا صاحب کے لیے یہ اطلاع کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی جو اُن کے سر کے بالکل اُوپر پھٹا تھا۔

"ہوں" — انہوں نے بڑی لمبی سانس لی تھی۔

"لیکن یہ ہوا کیسے" — انہوں نے رخسانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

عارف میاں نے کمال ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ اطلاع رخسانہ کو دی تھی کیونکہ سارا دن وہ اس کے ساتھ گزار چکا تھا اس لیے رخسانہ کو اس بات کا شک نہیں گزر سکتا تھا کہ یہ کام اس نے دکھایا ہے

"بابا صاحب! کالیا بڑا چالاک آدمی ہے۔ اس نے آپ کی اور دوستوں کی خصوصی تربیت حاصل کی ہے۔ گدھا نہیں ہے وہ۔ اُسے علم تھا کہ اس کے اس اقدام کے بعد اس کے گھر والوں کو کس انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ میرا خیال ہے ... بڑے بھائی کے ہاں جانے کے بعد پہلا کام ہی یہی کیا ہوگا کہ اپنے گھر والوں کو یہاں سے نکال لے —!!

رخسانہ نہیں چاہتی تھی کہ ایک لمحے کے لیے بھی باباصاحب کے ذہن میں عارف
میاں سے متعلق معمولی سا شک پیدا ہو۔

"لیکن ہماری اطلاع کے مطابق صبح وہ لوگ وہاں تھے"۔۔۔۔ باباصاحب
کی جھنجھلاہٹ دیدنی تھی۔

"آپ کی اطلاع بالکل صحیح ہو گی لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس اطلاع کے
فوراً بعد وہ نکل گئے ہوں۔ کیا معلوم کہ کالیا کا اپنے گھر سے رابطہ ہی صبح قائم ہوا ہو"
رخسانہ نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"رخسانہ! اس واردات کی اطلاع ملتے ہی اس کے گھر کا فون ہم نے ٹیپ
شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے گھر فون نہیں کیا۔۔۔۔ وہ اپنے گھر نہیں آیا پھر"۔
"باباصاحب کالیا کسی گدھے کا نام نہیں۔ وہ بڑا کایاں آدمی ہے۔ اُسے اس
کا احساس رہا ہو گا کہ اس کے گھر کا فون ٹیپ ہو رہا ہے۔ یہ پیغام اس نے کسی اور
ذریعے سے بھیجا ہو گا۔ اپنے کسی آدمی کے ذریعے۔۔۔۔ ہمسایوں کے ذریعے۔۔۔ آپ
میری بات کی تصدیق کر لیں۔ یقیناً اس کے گھر والوں کے لیے ہمسایوں کے ہاں
فون آیا ہو گا۔۔۔۔ میرا دل کہتا ہے ایسا ضرور ہوا ہو گا"۔
رخسانہ نے باباصاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اُس کی بات باباصاحب کے دل کو لگی تھی اور اُنہیں یقین ہونے لگا
کہ واقعی کالیا نے اپنے گھر والوں کو خبردار کر دیا ہو گا۔
اگر اس کے علاوہ کوئی بات ہوئی تھی تو یہ کسی آستین کے سانپ کا
تھا جو باباصاحب کی صفوں میں گھس آیا ہے۔
باباصاحب بڑا گھاگ بھیڑیا تھا۔۔۔۔!!
اُس کا ذہن بار بار عارف کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں جس

طرح کریدا لیا تھا اور اسے علم ہو چکا تھا کہ اس نے سارا دن رخسانہ کے ساتھ
گزارا ہے اور یہیں سے اُٹھ کر اپنے مشن پر گیا تھا۔ کم از کم وہ یہاں سے فون
کر کے کسی کو خبردار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔
تھوڑی دیر بعد باباصاحب کے سامنے کالیا کے گھر کے فون کی ریکارڈنگ
پڑی تھی۔ اس میں کوئی بھی فون انہیں خبردار کرنے والا نہیں تھا۔ جس کا مطلب
تھا کہ کالیا نے اطلاع دینے کے لیے اس فون کی بجائے یا تو کوئی دوسرا فون
یا دوسرا ذریعہ استعمال کیا تھا۔
لیکن کالیا کو کس نے مطلع کیا؟
یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان پانچوں میں سے کوئی۔۔۔۔؟!!
اچانک ہی اس سوچ نے باباصاحب کا بلڈ پریشر بڑھا دیا تھا۔ ان کا ذہن
جب کسی طرف لگ جاتا تو وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ باباصاحب
نے جو مفروضہ قائم کر لیا تھا اب وہ مسلسل اس پہ سوچے جا رہے تھے۔
رخسانہ کی بات اُن کے لیے کارآمد تھی۔۔۔۔! ان کی سیکرٹری باباصاحب کے
جب اپنی سیکرٹری کے رازوں میں اتنا زیادہ شریک تھے کہ دونوں ایک
دوسرے کو دھوکہ دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔
رخسانہ نے کہہ دیا تھا کہ عارف میاں پر شک نہیں کیا جا سکتا تو باباصاحب
نے اس پر شک کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد اگر کالیا نے بھی اپنے گھر والوں
کو فون نہیں کیا تھا تو ضرور وہ اُن پانچ بڑوں میں سے ایک ایجنسی سے ملا ہوا تھا۔
کون تھا وہ؟
باباصاحب کو اب اس آستین کے سانپ کو تلاش کرنا تھا۔۔۔۔!!

افسرِ اعلیٰ کے سامنے شیر گل مؤدب بیٹھا تھا اور وہ خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات اپنے چہرے پر سجائے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

شیر گل نے بڑا اسکوپ مارا تھا۔

یکے بعد دیگرے دو اہم کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ رخسانہ کے فون ٹیپ سے انہوں نے اشفاق بھائی کے لیے "کال" ٹریس کی تھی۔ اس کال بھائی کے ذریعے کالیا کو پیغام دیا گیا تھا کہ اس کی ماں اور بہنوں کی جان خطرے میں ہے۔ فون کرنے والے نے اپنا نام نہیں بتایا تھا لیکن بابر کا حوالہ بھی دیا تھا ــــــ!!

ایجنسی کا کوئی ایسا "سورس" نہیں تھا جس کے ذریعے یہ کام کروا ہوں۔ اس فون کا مطلب یہ تھا کہ لسانی تنظیم کے اندر بغاوت پھوٹ پڑی انہوں نے اب اس "باغی" کو تلاش کرنا تھا جس کی مدد سے کے کالے کرتوت کی خبریں انہیں مسلسل ملتی رہیں۔

اور جب یہ باغی ایک روز اچانک انسپکٹر شیر گل سے ٹکرایا تو کر رہ گیا۔

○

"میرا نام عارف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے وہ کال ضرور جس میں کالیا کے نام پیغام دیا گیا تھا۔ یہ فون میں نے کیا تھا۔ میں ہوں جس نے بابا صاحب کے حکم پر آپ کو اغوا کیا۔ ۵۹ "پر میرے نے آپ پر تشدد کیا تھا۔"

سانولے رنگ اور پتلے جسم والے پچیس سالہ نوجوان نے جس کے کرنے کے بعد شیر گل نے اس سے ایک کیفے ٹیریا میں ملنے پر رضامندی

...رف کرواتے ہوئے کہا۔

"میرا فون نمبر تم نے کہاں سے لیا؟" ـــــ شیر گل نے اسے پہچان لیا تھا۔

"میں نے بتایا ناں کہ آپ کو اغوا کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔ آپ کا ایڈریس اور دونوں فون نمبر میرے پاس محفوظ تھے ـــــ میں یہ بات بھی ...ہوں کہ ذاکر بھائی کو اس کے بدترین انجام تک پہنچانے کے لیے آپ نے اہم ...ادا کیا ہوگا حالانکہ تنظیم کے بڑے اب بھی اسے مخالف لسانی تنظیم کے کھاتے ...ڈال رہے ہیں۔"

...لڑکا خاصا ہوشیار دکھائی دیتا تھا۔

"مجھ سے تم کیا امید رکھتے ہو؟" شیر گل نے اس سے سیدھا سوال کیا۔

"میں آپ کے ذریعے آپ کے اعلیٰ افسران سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تمہیں ...کے بس کی بات نہیں۔ میرے پاس آپ لوگوں کو دینے کے لیے اتنا کچھ ہے ...کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں چاہتا تو براہِ راست بھی آپ کے افسرِ اعلیٰ تک ...پہنچ سکتا تھا لیکن میں نے مناسب یہی جانا کہ پہلے کسی مصدقہ محبِ وطن پاکستانی سے ...ملنا ہے۔"

"معاف کرنا دوست دراصل میں نے اپنی آنکھوں سے اتنا کچھ سن لیا ہے کہ ...سرکار دربار سے میرا اعتقاد اٹھ چکا ہے۔ مجھے ہر بڑے عہدیدار پہ بھی شک ...ہے کہ کہیں وہ بابا صاحب سے ملا ہوا نہ ہو۔ عین ممکن ہے کہ میں جس شخص سے ...میرا بازو پکڑ کر سیدھا بابا صاحب کے پاس لے جاتا ـــــ کم از کم تمہارے ...بارے میں یہ گمان نہیں کر سکتا ـــــ میں نے تمہیں ابھی اپنا مختصر تعارف کروایا ...مکمل تعارف سن کر شاید تم اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکو ـــــ میں ایک بات ...کے ساتھ کہتا ہوں کہ تمہارے ذریعے میری کسی بھی اعلیٰ افسر سے ملاقات

سے ہی آپ کی اگلے عہدے میں ترقی ہو جائے گی اور مجھے اس بات
مل سکے گی کہ تم مجھے غلط ہاتھوں میں نہیں دھکیل رہے ۔"

شیر گل کے لیے ابھی کوئی اندازہ قائم کرنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ اُسے
آ رہی تھی کہ اس نوجوان کے متعلق کیا فیصلہ کرے۔ یہ اس کا مجرم بھی تھا
شخص تھا جس نے اسے اغوا کر کے "۵۹" میں پہنچایا۔

لیکن ——

کیا اپنی ذاتی دشمنی کو وہ ملکی مفاد کی بھینٹ چڑھا دے؟

یہ تھا وہ اہم سوال جس نے اُسے پریشان کر رکھا تھا۔ ایک طرف
کا جی چاہتا تھا کہ اس نوجوان کو باہر لے جائے اور مناسب موقعہ دیکھ کر
مار کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔ اس کے پاس بڑا معقول جواز
یہ نوجوان بھارتی انٹیلی جنس کا تربیت یافتہ تھا —— اس کی بیوی
تھی۔ اس نے خود شجاع نے لسانی تنظیم کے حکم پہ کتنے کتنے گھناؤنے جرم

لیکن ——

شیر گل نے اُسے کچھ نہ کہا۔ اس نے سوچا اس نوجوان کے ضمیر نے
نیکی کی راہ دکھا دی ہے تو کیوں نہ اس کی صلاحیتوں کو ملک و قوم
استعمال کیا جائے۔ اس کے پاس بتانے کو اتنا کچھ تھا کہ واقعی گل شیر کے
اپنے افسرِ اعلیٰ کے سامنے پیش کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

اُسے عارف میاں کی صورت میں باباصاحب کی سیاسی اور سماجی موت
رہی تھی۔ اب یہ فیصلہ اس کے اعلیٰ افسران نے کرنا تھا کہ انہیں ملک کی
مقصود ہے یا نہیں۔

"کچھ بھی ہو ——" اس نے سوچا ——!! اگر اس کے اعلیٰ افسران نے

ان ہو گیا تو وہ خود اس نوجوان کی مدد سے اس سسٹم ہی سے ٹکرا جائے گا۔
بہن کی موت کے بعد سے اس کے خیالات میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ اس
ب سیٹ کے بجائے انصاف پہ بھروسہ کرنا شروع کر دیا تھا —— وہ جان گیا
یار کھوکھلے نعروں کی آڑ میں سیاست کا گندا مکروہ اور گھناؤنا کھیل اس ملک
کھیلا جا رہا ہے۔

اس نے خفیہ محکمے میں رہتے ہوئے ایسے متعدد سرکاری افسروں کو دیکھا تھا جو
لوٹ کے ملکی سلامتی کا سودا کرتے تھے اور کوئی ان پہ انگلی اُٹھانے کی جرأت
نہیں کرتا تھا۔ خود اس نے لسانی تنظیم کی وطن دشمنی سے متعلق ایسے اہم ثبوت حاصل
لیے تھے جن کی بناء پر اس تنظیم پہ فوراً پابندی عائد کی جا سکتی تھی لیکن پابندیاں
بازی کرنے والے تو خود باباصاحب کی خوشنودی کے لیے اس کے آستانے کے
ایڑیاں رگڑا کرتے تھے۔

جب چور اور کُتیا اکٹھے ہو جائیں تو پھر گاؤں کے مکینوں کا خدا ہی حافظ تھا۔

"دیکھو عارف میاں میں بھی ایک کمزور انسان ہوں۔ یقیناً میرے دل میں بھی
انتقام کی آگ سُلگ رہی تھی لیکن میں اپنی ذاتی دشمنی کو ملکی مفاد پہ کوئی اہمیت
دیتا۔ میں تمہیں اس بات کا یقین دلا سکتا ہوں کہ اگر ہمیں حکومت کا تعاون
تو بھی یہ جنگ ختم نہیں ہو گی۔ میں خود تمہارے ساتھ شانہ بشانہ اس
سے ٹکراؤں گا —— اب یا تو ہم ختم ہوں گے یا غداروں کو جہنم رسید کر
گے۔"

اس نے بڑے پُراعتماد لہجے میں عارف میاں سے کہا۔

دونوں نے اگلے روز ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔ عارف میاں کا اصرار تھا کہ
ایجنسی کے افسرِ اعلیٰ کی ملاقات کسی پرائیویٹ ٹھکانے پہ ہونی چاہیے۔

گل شیر نے یکے بعد دیگرے تین چار ایسی کامیابیاں حاصل کی تھیں
مقامی افسر اعلیٰ کی مرکزی دفتر میں خاصی عزت افزائی کی تھی جس کے بعد
وہ اس نوجوان آفیسر کے لیے اپنے دل میں بڑے احترام کے جذبات رکھنے
افسر اعلیٰ نے ملاقات پر آمادگی ظاہر کر دی۔

○

اس وقت تینوں گل شیر کے ایک رشتہ دار کے گھر اکٹھے ہوئے تھے
گھر کو لگا تالا گل شیر نے ہی کھولا تھا۔
عارف میاں کو یہی تاثر دیا گیا تھا کہ یہ گل شیر کے کسی دوست کا گھر
اصل میں یہ ایجنسی کا "سیف ہاؤس" تھا۔
عارف میاں کے منہ سے ہونے والے انکشافات نے ایک لمحے کے لیے
افسر اعلیٰ کو گڑبڑا کر ہی رکھ دیا تھا۔ بھارتی انٹیلی جنس نے اپنا جال کتنی
سے بُنا تھا اور جانے کتنے سادہ لوح نوجوان تھے جنہیں بابا صاحب نے
نے "را" کے ایجنٹ بنا کر ساری زندگی کے لیے غداروں کی صف میں لا کھڑا
وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ اس میں کسی نوجوان کی
ہو یا نہ ہو اگر وہ ایک مرتبہ بھارت کے کسی کیمپ میں پہنچ جائے اس کے بعد
تنظیم کی گرفت میں اتنی مضبوطی سے جکڑا جاتا تھا کہ اس کے بعد اس کا
سے کچھ کرنا ممکن ہی نہیں رہتا تھا۔
اگر کسی نوجوان کا ضمیر بیدار ہو بھی جائے تو بھی وہ اس بری طرح ان
کے ہاتھوں بلیک میل ہو چکا ہوتا ہے کہ اس کی جان بچتی نظر نہیں آتی
اس شہر سے ہر سال ہزاروں نوجوانوں کا بھارت کے مختلف شہروں
آنا جانا لگا رہتا تھا ـــ خدا جانے ان میں سے کتنے ایسے تھے جو "را" کے

نے بینا کشی کی طرح سنجانے اور کتنی فاختاؤں کو پاکستان کے مختلف شہروں
بنایا ہے اور وہ کتنی کامیابی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہیں۔
عارف میاں نے بڑے لرزا دینے والے انکشافات کیے تھے۔ افسر اعلیٰ محسوس
رہے تھے کہ واقعی یہ ملاقات ضروری تھی۔ انہوں نے ملاقات کے خاتمے پر
ان کا شکریہ ادا کیا۔
انہوں نے عارف میاں کو یقین دلایا کہ قومی مقاصد کی بجا آوری کے لیے
وہ ہر طرح کی ناروا پابندیوں کو بھی خاطر میں نہیں لائیں گے اور ملک دشمنوں کی
بابت اس مشن میں اسے ہر ممکن تعاون مہیا کریں گے۔
انہوں نے عارف میاں کو چند ذمہ داریاں سونپی تھیں۔ اور اس بات کی بطورِ
خاص ہدایت کی تھی کہ اپنی خود ساختہ بیوی بینا کشی کے ساتھ اپنا رویہ بالکل پہلے
کے معمول کے مطابق زندگی گزارتا رہے۔ اگر ممکن ہو تو اس کے ملاقاتیوں کی تفصیل
اور اس کے معمولات پر نظر رکھے۔ اسی نوعیت کی ہدایات انہوں نے رخسانہ کے
لیے بھی دی تھیں۔
"ایک بات جو بہت ضروری ہے اور جس کی امید میں تم سے ضرور کروں گا
احتیاط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ تمہارے ذریعے ہم نے ایک بڑے مشن
کا آغاز کیا ہے۔ اس کو انجام تک پہنچانے میں ہمیں قدم قدم پر تمہارا تعاون درکار
ہوگا۔ اس کے لیے تمہاری جان کی سلامتی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے ـــ خدا
پر بھروسہ کر کے آج سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کر دو۔ لیکن اس بات کا بطورِ خاص
خیال رکھنا کہ تمہارے معمولات میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے ـــ تمہارے کسی بھی عمل
سے کسی تبدیلی کا احساس نہ ہو۔ بابا صاحب کے قریبی حلقے میں گھس جاؤ۔ ہمیں

ان سفارت کاروں کی تفصیل اور اگر ممکن ہو تو دونوں کے درمیان ہونے
گفتگو کا ریکارڈ چاہیے جن سے یہ موذی ملاقاتیں کرتا رہتا ہے۔

میں بار بار اس بات پر زور دوں گا کہ محتاط رہنا۔ جتنا چوکس رہو
وقوم کے لیے اتنے ہی کارآمد ثابت ہو گے ۔۔۔ اس بات کا خیال رہے
تنظیم کے مرکز میں خصوصاً "را" نے اپنا جال بچھا رکھا ہے۔ تمہاری معمولی
مشتبہ حرکت سارا کھیل بگاڑ دے گی۔ ہم تمہیں بڑے محفوظ ٹیلی فون نمبر
میں تم پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ باباصاحب کی سیکورٹی کے معاملات وہ
کرتی ہے۔ یہ بڑا مکار آدمی ہے اور تنظیم کے اکثر اہم ٹیلی فون نمبر خود وقتاً
فوقتاً ٹیپ کرواتا رہتا ہے۔ اس کے اتنے ذرائع ہیں کہ جب بھی چاہے
اثر و رسوخ سے اپنے کسی بھی کارکن کا ٹیلی فون نمبر ٹیپ کرنا سکتا ہے تاکہ
کے دلی جذبات سے باخبر رہ سکے۔ ہم تمہیں ایک ایسا آلہ دیں گے جو اس
بات کی نشاندہی کرتا رہے گا کہ تمہارا ٹیلی فون ٹیپ تو نہیں ہو رہا ۔۔۔ یہ
کی ضرورت نہیں کہ ایسی صورت میں تمہیں کیا کرنا ہے ۔۔۔ کوئی اہم فون
رخسانہ کے کسی فون سے کرنے کی غلطی نہ دھرانا ۔۔۔ اہم پیغام پہنچانے کے
ہم تمہیں دوسرے طریقے بھی بتا دیں گے ۔۔۔ نارمل رہو۔ اعتماد کے ساتھ
کے بھروسے پر آگے بڑھو۔ تم بہت خوش قسمت ہو کہ اللہ تعالیٰ نے
جہنم کا ایندھن بننے سے بچا لیا ۔۔۔"

افسر اعلیٰ صاحب نے اُسے بریفنگ دیتے ہوئے کہا۔

"مطمئن رہیے سر! میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے پہلے
مر دوں گا۔"

عارف میاں کے لہجے میں اس ملاقات کے بعد سے ایک اعتماد سا

افسر اعلیٰ صاحب تو وہیں رہ گئے جب کہ شبر گل اُس کے ساتھ باہر آ گیا۔
رف میاں کو کچھ دُور تک چھوڑنے کے بعد واپس آ گیا۔
اب انہیں زیادہ مستعدی کے ساتھ آگے بڑھنا تھا ۔۔۔!!

شکار اور شکاری

اپنی دانست میں وہ نوجوان بیناکشی سے اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے ملا تھا کہ اس کی حرکت پہ بیناکشی کو شک ہی نہیں گزر سکتا تھا۔

لیکن ——

یہ اس کی غلط فہمی تھی۔

بیناکشی جانتی تھی کہ اس کے پاس حسن اور جنس کا جو خزانہ ہے وہ بڑے پارساؤں کو لڑکھڑا دیتا ہے۔ اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اکثر فرسٹریٹیڈ نوجوان کسی خوبصورت لڑکی سے تعلق خاطر قائم کرنے کے لیے ملاقات کا کوئی نہ کوئی جواز ضرور تلاش کرتے ہیں۔

لڑکیوں سے تعارف کے لیے یہ لوگ کیا کیا ڈرامے رچا سکتے ہیں اس کو وہ بخوبی جانتی اور سمجھتی تھی۔ یہ نوجوان بھی بہرحال پاکستانی تھا اور بیناکشی کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر یہاں سے گزر جانا کسی بھی دل والے کے لیے ممکن نہ تھا۔

"معاف کیجیے —— آپ کو زحمت ہوئی" —— نوجوان نے کھڑے ہوتے معذرت کی۔

اس کے بالوں کی کٹنگ کا مخصوص انداز، لباس، چال ڈھال اور بے

سنجیدگی اس امر پہ دلالت کر رہی تھی کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ ایسے لوگوں کا شکار کھیلنے کے لیے تو بیناکشی یہاں آئی تھی۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔ میں خود بہت کنفیوز ہو جاتی ہوں کبھی کبھی" —— اس نے اپنے شکار کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تول کر اس کی قیمت لگاتے ہوئے کہا۔

"میرا نام ملک ہے —— اختر ملک" —— اس نے روائتی انداز میں کہا۔

"جی مجھے پروین کہتے ہیں" —— بیناکشی نے ہونٹوں پر مسکراہٹ جماتے ہوئے کہا۔

"مجھے کہنا تو نہیں چاہیے کیونکہ روائتی سی بات ہو جائے گی لیکن میں آپ کو یقین دلاؤں کہ مجھے واقعی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" —— اختر ملک نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں میں اندازہ کر سکتی ہوں۔ میں نفسیات کی طالب علم رہی ہوں بلکہ اب بھی ہوں" —— بیناکشی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ارے واہ کمال ہے گویا آپ کے کچھ شوق بھی میرے ساتھ مشترک ہیں۔ میں بھی نفسیات کا سٹوڈنٹ ہوں —— لیکن کیا ہم کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہیں گے۔ چلیے ناں ایک ایک کافی کا کپ ہو جائے۔ یوں بھی اب تک ہمیں اتنے لوگ گھور گھور کر دیکھ چکے ہیں کہ اب کم از کم مجھے تھوڑی دیر کے بعد شرم آنے لگے گی۔"

اختر ملک کا انداز گفتگو بے ساختہ اور بے تکلفانہ تھا۔

"چلیے صاحب آپ بھی کیا یاد کریں گے حالانکہ اجنبیوں کے ساتھ کچھ بھی شیئر کرنا مناسب نہیں ہوتا" —— بیناکشی نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"کم از کم اب تو ہم اجنبی نہیں رہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے نام معلوم ہو چکے ہیں۔ نفسیات ہم دونوں کا موضوع ہے اور —— اور میرے خیال سے ایک

دوسرے کے ساتھ کافی کا ایک کپ شیئر کرنے کے لیے اتنا تعارف کافی نہیں؟"
ملک اختر کی بات پر بینا کشش بے ساختہ کھل کھلا کر ہنس دی۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے نزدیکی ہوٹل تک آ گئے تھے۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں اِکا دُکا میزیں ہی بھری نظر آتی تھیں۔ وگرنہ تو سارا ہال خالی تھا۔ دونوں نے کونے میں دھری ایک خالی میز سنبھال لی تھی۔ ملک اختر نے ایک مودب بیرے کو کافی لانے کا آرڈر دیا تھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس شہر میں کسی سے تعارف تو ہوا۔ دراصل میں نے تازہ ہی میں سینیئر سول سروس جوائن کی ہے اور میری پوسٹنگ بھی اس بڑے شہر میں ہو گئی ہے۔۔۔ میں نے ابھی تک آفس جوائن نہیں کیا۔"

اختر ملک بڑا خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"ملک صاحب اس شہر میں کیا بلکہ اس دنیا میں ہر ذی شعور انسان کا سب بڑا مسئلہ ہی تنہائی ہے۔ آپ تو اس شہر میں نئے ہیں۔ میں تو نہیں، لیکن پھر بھی ہجوم میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگتی ہوں۔ جب کوئی ہم خیال ہی میسر نہ ہو تو انسان اکیلا ہوتا ہے چاہے وہ لاکھوں کے مجمع میں موجود ہو۔۔۔ ویسے بائی دی وے آپ یہ بھی بتا ہی دیں کہ آپ کون سے ڈیپارٹمنٹ میں جا رہے ہیں؟"۔۔۔

بینا کشش کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔

"شاید آپ کو اچھا نہ لگے۔۔۔ بہرحال پولیس سمجھ لیجئے۔۔۔ [illegible] سفید پوش پولیس"۔۔۔ اختر ملک نے ہنستے ہوئے بینا کشش کے چہرے کے بدلتے روپ بھی دیکھ لیے تھے۔

"ونڈرفل"۔۔۔ بینا کشش نے بے ساختہ کہا۔۔۔ "تب تو ہماری دوستی خوب نبھے گی۔۔۔ میں بھی سنجیدگی سے پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے بینا کشش نے اپنا ہاتھ بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔
"ضرور۔۔۔ کیوں نہیں"۔۔۔ اختر ملک نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا۔

ملک اختر پھولے نہیں سما رہا تھا۔

گزشتہ سات آٹھ روز سے وہ مسلسل اس شاپنگ پلازہ کے چکر کاٹ رہا تھا یہ اس کی لڑکپن کی عادت تھی۔ اس نے کالج کیسے پاس کیا؟ اعلیٰ سول سروس کا معرکہ کس طرح سر کر لیا؟ یہ ایسے سربستہ راز تھے جن پر ملک میں ہونے والے بہت سے دوسرے کھیلوں کی طرح پردہ ہی پڑا رہا۔

اس کا باپ اور اس سے پہلے دادا پردادا بھی اعلیٰ آفیسر رہے تھے انگریزوں کے بعد کالے انگریزوں کی غلامی نسل در نسل انہیں منتقل ہوتی آئی تھی۔ اس کے والد نے میٹرک کے بعد کبھی اسے دلجمعی سے پڑھنے ہی نہیں دیا تھا۔ ہر امتحانی مرکز میں پہلے سے اس کے خیر مقدم کے لیے اس کے والد کے محکمے کے ملازمین موجود ہوتے۔ انہوں نے اختر ملک کو میٹرک سے اعلیٰ سروس کے امتحان تک ہمیشہ اعلیٰ نمبروں سے کامیابی دلائی۔

ملک کی ہر کمزور، شریف اور غریب لڑکی پر وہ بلا شرکت غیرے اپنا حق سمجھتا تھا اور متعدد مرتبہ اس سلسلے میں اُسے تھانے کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔

لیکن۔۔۔

ہر دفعہ معاملے تھانے میں ہی ختم ہو جاتا۔ کبھی کورٹ کچہری تک نہ گیا۔ اُسے [illegible] اس بات کا یقین تھا کہ اس ملک میں رشوت اور کرپشن کے ذریعے ناممکن بات کو ممکن بنایا جا سکتا ہے جس کی زندہ مثال وہ خود تھا۔

اس بڑے شہر میں اس کی پوسٹنگ سے اُسے صرف اس بات کی خوشی تھی کہ اُسے زیادہ حرام کاری کے مواقع ملیں گے اور اس کی روز بروز بڑھتی ہوئی خواہش کے لیے بھی یہاں تسکین کا زیادہ سامان موجود ہے۔

سانولے رنگ کی اس عورت کو جسے قدرت نے کسی سانچے میں ڈھال کر اس دنیا میں اُتارا تھا وہ گزشتہ چار پانچ روز سے دیکھ رہا تھا۔

اس کی شکاری آنکھوں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ اس لڑکی کے پاس اُسے دینے کے لیے بہت کچھ ہے اور اس کی چال ڈھال اور انداز نشست و برخاست اس امر کا غماز تھا کہ اُسے بھی ملک اختر جیسے لوگوں کی تلاش رہتی ہے۔

پروین سے پہلی ملاقات نے ہی اُسے کامیابی کا یقین دلا دیا تھا۔ تین چار ملاقاتوں میں دونوں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو گئے اور ایک روز جب دو گھنٹے تک پروین نے اختر ملک کی جنسی ہوس کو تسکین بہم پہنچا دی، اس روز کے بعد سے تو ملک اختر اس کا بندۂ بے دام بن کر رہ گیا تھا۔

اس کا تعلق خفیہ پولیس کے جس محکمے سے تھا اس کا کام غیر ملکیوں کی نقل و حرکت پر قیام پاکستان کے دوران نظر رکھنا اور بھارت میں موجود پاکستانیوں میں ویزا کی درخواست دینے والوں کے کیسوں پر نظر ثانی کرنا تھا۔ دہلی کا پاکستانی سفارت خانہ بیشتر ویزے اختر ملک کے محکمے کی سفارشات کے بعد ہی بھارتی باشندوں کو جاری کرتا تھا۔

ایسا گدھا مینا کشی کے ہاتھ کیا لگا اس کے بیے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا۔ اس نے "را" کے لیے بڑا معرکہ سر کیا تھا۔

وہ دو تین ماہ میں اختر ملک جیسے جنسی مریض کے دل و دماغ پر قبضہ جما چکی تھی ـــــ اس نے اختر ملک کے بیٹے اپنا وجود ناگزیر بنا لیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز اختر ملک کو شدت سے جسمانی ہوس کی تسکین کے لیے اس کی طلب محسوس ہوتی تھی۔

اختر ملک کو زمانۂ طالب علمی سے شراب نوشی کا چسکا لگ گیا تھا۔ اس شوق کو مزید ہوا پروین کی ملاقاتوں نے دی۔ پہلے وہ مہینے میں ایک آدھ بار شراب پیتا تھا اب ہفتے میں دو تین مرتبہ پینے لگا۔

○

مینا کشی نے پروین کا روپ دھار کر "را" کے لیے یوں تو بہت سے کام کیے تھے لیکن اختر ملک کو تسخیر کر کے وہ سب پر بازی لے گئی تھی۔ اس نے اختر ملک کو پہلے جسمانی ملاپ کے بعد ہی کہہ دیا تھا کہ اس کے خاندان کے صرف تین افراد ہی یہاں رہتے ہیں باقی سب بھارت کے شہری ہیں اور اب تک وہ پانچ چھ ایسے "بھارتی شہریوں" کے لیے اختر ملک کی مدد سے مناسب سہولتیں بھی حاصل کر چکی تھی۔

پاکستان میں غیر قانونی طور پر قیام پذیر اپنے "دو بھائیوں" کے قیام کو قانونی شکل دے چکی تھی۔

اس کام کے لیے اس نے اپنے ان "بھائیوں" کے ذریعے ایک خطیر رقم بطور رشوت ملک اختر تک پہنچائی تھی۔

"محبت اپنی جگہ اور بزنس اپنی جگہ" ـــــ اس نے ملک اختر کی بانہوں میں جھولتے ہوئے کہا جب اس نے مینا کشی سے کہا کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی ـــــ

"یہ میرا جانی ہے کہ ملک صاحب کہ آپ کو بھی اوپر والوں کا منہ بند کرنا ہوتا ہے۔ دراصل ہم سب ایک بڑے سیٹ اپ کے درمیانی مہرے ہیں۔ ہماری

حیثیت ہی کیا ہے ! جب اوپر والے بھی کھا رہے ہیں ۔ نیچے والے بھی کھا رہے ہوں تو درمیان والوں کو کون پوچھتا ہے" ــــ بیناکشی نے کہا۔

"ٹھیک ہے پروین لیکن میں اپنی ضرورتیں اور کسی جگہ سے پوری کر سکتا ہوں کم از کم تمہارے حوالے سے کوئی کام کرتے ہوئے مجھے ....."

"ملک جی آپ کن چکروں میں پڑ گئے" ــــ بیناکشی نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ "جن لوگوں کا آپ نے کام کیا ہے وہ بھی کوئی صوفی نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے سب رشتہ دار ہیں لیکن وہ بھی ہزاروں دیگر لوگوں کی طرح سمگلنگ کے دھندے سے لگے ہیں ۔ انہوں نے بھی لاکھوں کمائے ہیں۔ ان میں سے چند لاکھ آپ کو مل جائیں تو کیا قیامت آ جائے گی !"

بیناکشی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی تربیت کے مطابق پورا تیر چلایا تھا لیکن خلافِ توقع لگا عین نشانے پر ۔ !!

ملک اختر کی رال ٹپک پڑی ۔

پیسہ اُس کی خاندانی کمزوری تھی ۔ وہ تو نجانے کب سے کسی ایسے گر کی تلاش میں تھا جس سے ڈیل کر کے وہ ایک ہی مرتبہ اپنا مستقبل محفوظ کر لے۔ بیس پچاس ہزار کی رشوت لینا اب اس کا لیول نہیں رہا تھا ۔ اس نے بڑے بڑے خواب دیکھے تھے اور اس یقین کے ساتھ کہ ان تمام خوابوں کی تعبیر بھی اسی ہیرا پھیری اور بے ایمانی کے ذریعے ممکن ہوتی جس کے ذریعے وہ اس اہم منصب تک پہنچا تھا۔ اُس کے باپ نے رشوت سے کروڑوں کی جائیداد بنائی تھی اور کوئی اُس کا بال بیکا نہیں کر سکا تھا ۔

کیا وہ ساری زندگی باپ کے ٹکڑوں پر پلتا رہے گا ؟

اس نے سوچا اور خود ہی فیصلہ کر لیا کہ اب اُسے خود پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔ بے چارے والد صاحب پہ آخر کب تک بوجھ بنا رہے گا ۔

اس کے دادا نے انگریزوں کی "ٹوڈی" سے جو دولت کمائی تھی اُس میں دس گنا اضافہ اس کے باپ نے کیا تھا ۔ وہ تو تیسری نسل تھا اُس نے سوچا کہ اُسے تو سو گنا اضافہ کرنا چاہیے ۔ افراطِ زر بھی تو اسی رفتار سے ہوا تھا ۔ مہنگائی بھی تو اسی رفتار سے بڑھ رہی تھی ۔

پروین کی صورت میں تو جیسے الٰہ دین کا چراغ اُس کے ہاتھ لگ گیا تھا اس کے ذریعے اختر ملک کو کیا کیا تسکین کے سامان میسر نہیں آئے تھے ۔ ایک نشہ سا اس کے حواس پہ مسلسل چھایا رہتا تھا ۔ اُس کی صحبت کی خمار نے اختر ملک کو مخمور کر رکھا تھا اور اب وہ اُس کے لیے دولت کے انبار بھی اکٹھے کرتے جا رہا تھا۔ اُسے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ ابھی اس عظیم الشان محبوبہ کو اس کے شایانِ شان "تحفہ" کس طرح پیش کرے ۔

"پروین تم واقعی میرے لیے کسی آسمانی تحفے سے کم نہیں ہو" ــــ اس نے اپنے بازوؤں کا حلقہ "ہما" کی حرافہ کے گرد تنگ کرتے ہوئے کہا۔

"اور تم میرے لیے ....." تربیت یافتہ بیناکشی نے اس سے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

بیناکشی نے تب ہی اندازہ کر لیا تھا کہ ملک اختر اس کے جال سے بچ کر نہیں جا سکتا۔

اب اُسے ملک اختر کو اپنا بندہ بے دام بنانا تھا اور اسے کسی ایسے جال میں پھنسانا تھا جس سے باہر نکلنا پھر جیتے جی ملک اختر کے لیے ممکن نہ رہے ۔ اور اس نے یہ سنہرا جال بھی ایک لمحہ اختر ملک پر پھینک ہی دیا۔

اس روز ملک اختر شراب اور شباب کے نشے میں دھت اس کے پہلو میں پڑا ہُوا تھا جب اچانک... ہی بینا کشی نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں علم ہے کہ میرے جس کزن کی تم نے سفارش کی تھی۔ وہی جن لوگوں نے دو لاکھ روپے لیے تھے" —— اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"ہاں! ہاں! کیا ہُوا اُسے —— ؟" ملک اختر نے بے چینی سے پوچھا۔

"دیکھو ملک! میں نے بھی زندگی میں بہت سے خواب دیکھے ہیں تمہاری طرح —— جب سے ہم دونوں ملے ہیں میرا دل کہنے لگا ہے کہ ہمیں ان خوابوں کی تعبیر بھی ضرور مل جائے گی۔ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ لوگ کیا بزنس کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے اعتماد میں لے کر کہا ہے کہ اگر ہم دونوں چاہیں تو وہ لوگ ہمیں دنوں میں کروڑپتی بنا سکتے ہیں —— اختر! تم جانتے ہو گے ان دنوں میں اسلحہ کی سمگلنگ کا دھندا عام چل رہا ہے۔ وہ جو ہے ناں۔ وہ لسانی تنظیم کا جنرل سیکرٹری شاید وہ اس گروہ کا سرغنہ ہے اور تمہاری اطلاع کے لیے بھی بتا دوں کہ تمہارے کون کون سے افسر اُن سے ملے ہوئے ہیں" —— جس کے بعد اس نے تین چار ایسے افسروں کے نام لے دیئے کہ ملک اختر کو اپنا نشہ ہرن ہوتا محسوس ہُوا۔

اُسے اس بات کا تو علم تھا کہ ڈرگ مافیا یا اسلحہ کے سمگلروں کا دھندا ... کے محکمے کے تعاون کے بغیر نہیں چلتا، لیکن جن افسروں کے نام پروین نے لیے کیا وہ بھی —— ؟

اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ ایک بات کا تو اُسے علم تھا کہ اس تنخواہ سے جو اُنہیں دی جا رہی ہے کوئی بھی بال بچے دار شخص صرف اپنی سفید پوشی قائم رکھ سکتا تھا۔ یہ آئے روز غیر ملکی تفریحی دورے اور وہ بھی اپنے اہل خانہ سمیت دنیا کے مہنگے ترین ہوٹلوں میں قیام اور عیاشیاں۔

ایسی باتوں کا تو تصور بھی کوئی تنخواہ دار شخص نہیں کر سکتا تھا۔

ان لوگوں کی عیاشیوں اور بداعمالیوں کا علم اعلیٰ حکام کو رہتا تھا۔

لیکن ——

کوئی انہیں پوچھتا نہیں تھا۔ معاشرے میں انہیں معزز مقام حاصل تھا۔ کسی کی یہ ہمت نہیں تھی کہ اُن کی طرف انگلی اٹھا کر کوئی بات ہی کر سکے۔

لسانی تنظیم سے متعلق اُسے کوئی خوش فہمی اس سروس میں آنے سے پہلے بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود اُن لوگوں کے حکومت وقت سے بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔

"دراصل وہ لوگ تمہارے حسن سلوک سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ تم نے آڑے وقتوں اُن کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بہت خطرہ مول لے کر کام کیا ہے —— اب وہ لوگ بھی تمہیں OBLIDGE کرنا چاہتے ہیں۔ یوں بھی ان لوگوں کو 'اچھے دوستوں' کی تلاش تو رہتی ہی ہے" —— بینا کشی نے بھرپور جذباتیت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"یار تمہیں مروا نہ دینا" —— ملک اختر نے یہ فقرہ اتمام حجت کے لیے ہی کہا تھا۔

"ایسا تو جئیں گے بھی اکٹھے اور مریں گے بھی اکٹھے" —— بینا کشی نے اپنا سارا بوجھ اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے —— سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔"

ملک اختر پر دیوانگی طاری ہونے لگی تھی۔

بینا کشی نے اگلی شام اس سے دوستوں کی ملاقات کے لیے طے کی تھی۔ وہ رات اس نے ملک اختر کے فلیٹ پر ہی بسر کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اگلے روز شام تک

ملک اختر سے سائے کی طرح چپٹی رہے۔

وہ ملک اختر کو سوچنے سمجھنے کا موقعہ بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔ اُسے یقین
ایک مرتبہ اس کے دوستوں سے ملک کی ملاقات ہو جائے تو پانچوں گھی میں
اس کے بعد ملک اختر زندگی بھر اس کی ڈگڈگی پہ بندروں کی طرح ناچتا رہے گا
کبھی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔

○

رات ملک اختر کو شراب اور شباب کی ایسی خماری چڑھی کہ وہ صبح دیر
تک سوتا رہا۔ اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔

بے چارے ملک اختر کو احساس ہی نہ ہو سکا کہ پروین کے بڑے
ہینڈ بیگ میں موجود چھوٹے سے کیمرے نے اس کی کتنی تصویریں عالم خواب
اُتار لی ہیں۔ اس کا کپڑوں سے بے نیاز جسم بڑی ہوشیاری سے پروین نے
سلولائیڈ کی فلم پہ اُتار لیا تھا۔

"بیڈ ٹی" اُسے پروین نے ہی بنا کر دی۔

"بہت دیر ہو گئی آج"۔۔۔ ملک اختر نے اپنے سرہانے رکھی گھڑی پر نظر
جماتے ہوئے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ یہ کام ہی ایسا ہے۔ اس میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے"
پروین نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"خیرا بیرے کو ناشتے کے لیے کہہ دیا"

"کون سا بیرا؟ میں کس لیے ہوں آپ کی خادم ملک صاحب!"۔۔۔ اُ
نے جھکتے ہوئے ملک اختر سے کہا۔

"ارے تم کیوں تکلیف کرتی ہو بھئی"۔۔۔ ملک نے اُٹھ کر ہاتھ روم کی

ہوئے کہا۔
یا کی نے اس کا جواب ایک خاص ادا سے مسکراتے ہوئے دبا دیں گی ہن میں

...اختر کے لیے اُس نے میز پر ناشتہ سجاتے ہوئے اس بات کو ملحوظ خاطر
...کہ آج اُسے دفتر میں کم سے کم بیٹھنے کا موقعہ ملے اور شام کی متوقع ملاقات
...عقل و خرد سے بالکل بیگانہ رہے۔

"میرے خیال سے چند منٹ کے لیے دفتر میں شکل دکھا آؤں"۔۔۔ ملک اختر
...۔

"لیکن صرف چند منٹ"۔۔۔ پروین نے اس کے کندھے پر بازو ڈالتے ہوئے
۔۔ "دوپہر کا کھانا میں آپ کے لیے خود تیار کروں گی"
"کیا بات ہے آج بڑی مہربانی ہو رہی ہیں"۔۔۔ ملک اختر نے مسکراتے
...۔

"کیا مطلب ہے آپ کا ۔۔۔ آج سے کیا مراد ہے آپ کی۔ میں تو ملک صاحب
...روز سے آپ کی اطاعت گزار ہوں"
"...بھی"۔۔۔ ملک نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
ملک اختر نے دفتر میں واقعی اپنی شکل ہی دکھائی تھی۔
...کی مختصر سی کارروائی اور چند فائلوں پر دستخط۔ دو تین فون اپنے ہیڈ کوارٹر
...پیغامات ہیڈ کوارٹر کی طرف سے وصول کیے۔ ان پیغامات میں
...کی فرمائشیں کی گئی تھیں چونکہ یہ فرمائشیں افسرانِ اعلیٰ کی طرف سے
...اس لیے ملک اختر کے لیے یہ حکم کا درجہ رکھتی تھیں۔ یوں بھی اس نے
...مطلب ہمیشہ اعلیٰ افسران کو خوش رکھنا ہی سمجھا تھا۔ یہی اس کے باپ دادا

کی تربیت تھی جو اُس کے کام آ رہی تھی۔

گھر پہنچ کر وہ بے ساختہ اپنی محبوبہ سے لپٹ گیا جس نے اپنا تن من [illegible] نچھاور نہیں کیا تھا۔ ایسے اسباب مہیا کر دیے تھے کہ اب اس کی سفلی خواہشات کا روپ دھارنے لگی تھیں۔

دوپہر کا کھانا دونوں نے اکٹھا کھایا۔

ینا کشی بڑی منجھی ہوئی ایجنٹ تھی۔ اُس نے بطورِ خاص ملک اختر کی [illegible] وائن کی بوتل نکال کر میز پر سجائی تھی۔

اس کا اندازِ مہمان نوازی ملک اختر کے لیے جان لیوا ہوتا جا رہا تھا۔ اس بڑی طرح اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو گئی تھی کہ اگر وہ ملک کو کان پکڑنے کا حکم بھی دیتی تو وہ بلا چون و چرا اس کی تعمیل کرتا۔

شام تک وہ سائے کی طرح ملک اختر سے چمٹی اسے جنسی تسکین کا سامان پہنچاتی رہی اور اب دونوں شہر کے ماڈرن علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ ملک اختر خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے بجائے پرائیویٹ سفر مناسب جانا تھا۔

"اُن لوگوں نے ہوٹل میں کھانے کا اہتمام کیا تھا ــــ لیکن میں نے نہیں جانا۔ میرے خیال سے ہم یہاں زیادہ اطمینان سے بات کر سکیں گے۔"

"بہت مناسب فیصلہ تھا تمہارا" ــــ ملک اختر نے اس کی طرف دیکھا۔

گاڑی اب شہر کے انتہائی ماڈرن علاقے میں داخل ہو رہی تھی اور سب سے مہنگے بلاک کے کونے میں بنی کوٹھی کے دروازے کے سامنے [illegible]

کوٹھی کے دروازے پر موجود مسلح پہریدار نے ان کی شکل پر نظر ڈال کر دروازہ کھول دیا۔ کار سمیت دونوں اندر چلے گئے۔

ملک اختر کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ کس طرح اس کی "ایجنسی" کے مخالف حضور میں اپنے "مہمانوں" کے لیے "سیف ہاؤس" بنا رکھے ہیں۔ اسی طرح کا ایک "سیف ہاؤس" تھا جسے لسانی تنظیم نے اس جیسے گدھوں کو پھانسنے کے لیے بطورِ خاص تیار کروایا تھا۔

لسانی تنظیم کے اس سیف ہاؤس کے ہر کمرے میں خفیہ کیمروں اور ریکارڈنگ کے ذریعے یہاں ہونے والی تمام گفتگو اور حرکات ریکارڈ کر لی جاتی تھیں۔ پھر یہ لوگ موقع محل کی مناسبت سے اپنے حق میں استعمال کیا کرتے تھے۔ ملک اختر یہاں آنے والا پہلا قربانی کا بکرا نہیں تھا۔

اس سے پہلے کئی بکرے یہاں ذبح ہو چکے تھے۔ بہت سے سرکاری عمال [illegible] اور مجبر لسانی تنظیم کے بندہ بے دام بن کر رہ گئے۔ انہیں گفتگو کے ایسے [illegible] پھنسایا جاتا تھا کہ مہمان "لوز ٹاک" پر مجبور ہو جاتا۔ اگر وہ ان لوگوں کی خواہش [illegible] پھنستا بھی نہیں تھا تو بھی خفیہ کیمرے سے تیار کردہ فلم کی اس صفائی [illegible] کی جاتی کہ وہ مجرم بن کر رہ جاتا اور ان لوگوں کے احکامات کی تعمیل اس [illegible] ہو جاتی تھی۔

[illegible] یہ کہ وہ خودکشی کر لے ــــ اور ایسے کئی واقعات ہو بھی چکے تھے کہ نادانستگی [illegible] کے ہاتھوں پھنسنے والے عزت مند اور محبِ وطن افسران نے بالآخر [illegible] مناسب جانا تھا۔ ان میں اتنی ہمت بھی نہ ہوتی تھی کہ مرنے سے پہلے [illegible] گزرنے والی اس قیامت کا احوال ہی اپنے اعلیٰ افسران تک پہنچا [illegible] مرتے وقت بھی خوف لاحق رہتا تھا مبادا یہ مواد ان کی نسل ہی کو [illegible] کے رکھ دے۔

شاندار اور جدید ترین سامان آرائش سے مزین اس کوٹھی کے پارکنگ میں جس شخص نے ان کا استقبال کیا وہ مقامی ایم پی اے پرویز بھائی تھا۔ ملک اختر نے اُن کا نام تو سُن رکھا تھا لیکن بالمشافہ ملاقات آج پہلی بار ہو رہی تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور ڈرائینگ روم میں آ گئے۔ ملک اختر کو بطور خاص اس آرام دہ صوفہ پر بٹھایا گیا تھا جس پر بیٹھنے والے کی معمولی حرکت بھی کیمرے کی آنکھ سے محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔

کمرے میں پہلے سے موجود ڈینا کشی کے دونوں "بھائیوں" نے پرویز بھائی سے بھی زیادہ گرمجوشی دکھائی تھی۔

ملک اختر کے بیٹھتے ہی پرویز بھائی نے اپنی چرب زبانی کے کمالات شروع کیے اور چند منٹ کی گفتگو ہی میں ملک اختر کو بھی کھلنے پر مجبور کر دیا۔ اگلے ہی لمحے ڈینا کشی جیسی ایک اور خوبصورت اور نیم برہنہ دوشیزہ شراب کی مختلف بوتلوں سے سجی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس نے ملک اختر کو خاصا فرشی سلام کیا تھا۔

ملک اختر سے اس کی چوائس پوچھنے کی بھی زحمت نہیں کی گئی، ڈینا کشی نے انہیں پہلے ہی سے سمجھا دیا تھا۔

اگلے ہی لمحے یہاں موجود تمام لوگوں کے ہاتھوں میں شراب کے جام ہو چکے تھے۔

یہ کاک ٹیل بطور خاص تیار کی جاتی تھی اور ملک اختر کو "خاص مہمان" کی حیثیت میں اسی جام سے سرفراز کیا گیا جس کے چند گھونٹ حلق میں اُترتے ہی ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

اگلے ہی لمحے اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ اوّل تو اس کے دل و دماغ میں دُور دُور تک کہیں احساسِ گناہ یا احساسِ ندامت نہیں تھا کیونکہ ضمیر نام کی چیز ان کے والد گرامی کی خصوصی تربیت کے سبب اس کے بدن کو چھوڑ کر کب کی اُڑ گئی تھیں۔ اگر کوئی ایسی خلش دُور دُور تک بھی تھی تو اب وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔

"ملک صاحب اس حمام میں سب ننگے ہیں"—— پرویز بھائی نے سلسلہ گفتگو مطلب کی طرف لاتے ہوئے اس کے محکمے کے دو تین اعلیٰ افسروں کے نام لیے۔ "ان لوگوں کو کون نہیں جانتا۔ آپ سے زیادہ باخبر کون ہے لیکن آپ نے دیکھا کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ ارے بھئی کیوں کریں گے۔ یہاں ہر شخص ضرورت مند ہے۔ زندگی نے اور سب سے بڑھ کر حالات نے ہمارے لیے بے شمار مسائل پیدا کر دیے ہیں کہ ہم میں سے کسی کے لیے بھی زندگی آسان نہیں رہ گئی۔

ایک لمحے کے لیے رُک کر اُس نے گھاگ قصائیوں کی طرح بکرے کی طرف دیکھا اور مطمئن ہو کر خود ہی گردن ہلا دی۔ اس درمیان ملک اختر کے لیے دوسرا جام تیار ہو چکا تھا۔

"ملک صاحب! ہم سیاسی لوگ ہیں۔ اس شہر میں اپنے تحفظ کے لیے ہمیں بھی گولہ بارود کی ضرورت رہتی ہے آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے دشمن اور مخالفین صرف بارود کی زبان سمجھتے ہیں اور اسی میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں۔ اگر ہم صرف امن آشتی کا پرچار کرتے رہیں تو یہ اپنے ہاتھوں اپنی سیاسی قبر کھودنے والی بات ہو گی——"

ملک ہمہ تن گوش تھا——!!

"ہمارا کام تو جیسا تیسا چل ہی رہا ہے" ـــــ پرویز بھائی نے گھونٹ لیتے ہوئے
آرام سے کہا۔ "اس شہر میں تو کسی مائی کے لال کی جرأت نہیں کہ ہمارے مال کو چھو کر دیکھے۔
آپ جانتے ہیں کہ "انٹری پورٹس" پر کوئی ایک ایجنسی تو ہے نہیں کہ جس سے ڈیل کر لی جائے۔
ایجنسیوں نے اپنے ٹارگٹ سنبھال رکھے ہیں۔ ان میں آپ کے لوگ بطور خاص
سرگرم ہیں۔ ہم نے ہر ایک سے اس کی حیثیت کے مطابق سلوک کو اپنی روایت
بنا رکھا ہے۔ آپ کے لوگ بھی ہمارے ساتھ تعاون تو کر ہی رہے ہیں لیکن
سلسلے میں براہ راست آپ سے معاملات طے کرنا چاہتے ہیں ـــــ آپ نے
طرح پروین کے دوست کی حیثیت سے ہمارے ساتھیوں کی مدد کی ہے اس
نے ہمیں تو بہت متاثر کیا ہے۔ اب ہم بھی کوئی ایسے گئے گزرے نہیں کہ اپنے
دوستوں کا خیال نہ رکھیں۔ اس لیے آج سے آپ کی اور ہماری یاری پکی۔"

اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ بناکشی کے "بھائیوں" میں سے
ایک نے اپنے پہلو میں رکھا بریف کیس پرویز بھائی کی طرف بڑھا دیا جس نے
کیس کھول کر ملک اختر کی طرف بڑھا دیا۔

"دس لاکھ ـــ ہماری دوستی کی پہلی قسط۔" ـــــ اس نے بریف کیس ملک
کی آنکھوں کے سامنے دھری میز پر رکھ دیا۔ جس میں موجود نوٹوں پر نظر پڑتے
ہی اختر ملک کی رال ٹپکنے لگی تھی۔

"شکریہ ـــ" اس نے مدہوش نظروں سے بریف کیس کی طرف
"ملک صاحب آپ کو کچھ نہیں کرنا۔ بس ہماری طرف سے آنکھیں بند
ہیں۔ ہم آپ کو صرف ایک بات کا یقین دلاتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ کبھی
کوئی ہنگامی صورتِ حال بن گئی تو ہمارے کارکن مر جائیں گے لیکن آپ کے
ان کی زبان کوئی نہیں کھلوا سکتا ـــــ ہم اپنے دوستوں کی

لیکن ان سے یہ امید ضرور رکھتے ہیں کہ مصیبت کے وقت میں وہ ہمیں تنہا
نہ چھوڑیں گے اور ضرور ہماری مدد کو آئیں گے۔ جہاں آپ کی عزت کا سوال ہوگا
ہم مال کی پرواہ کرنے والے لوگ نہیں ہیں، لیکن ہماری اور آپ کی عزت
ایک جیسی ہونی چاہیے۔"

پرویز بھائی نے سگریٹ سلگا کر اس کے دھوئیں کے مرغولے بنائے۔
"پرویز بھائی آپ مجھے کبھی پیچھے نہیں پائیں گے صرف رازداری شرط ہے۔"
ملک اختر نے اپنی چونچ کھولی۔

"ملک صاحب اس بات کا احساس ہم سے زیادہ اور کس کو ہوگا۔ سوائے ہم
لوگوں کے یا پھر پرویز بھائی اور کوئی کبھی آپ کو نہ فون کرے گا نہ اپنی شکل دکھائے
گا۔ بلکہ ہم بھی پروین کو درمیانی رابطے کے لیے استعمال کریں گے ـــ اور بس۔"
اس مرتبہ ان دونوں میں سے ایک نے کہا۔

"لیکن میں اپنا حصہ برابر لوں گی بھائی جان ـــ"
پروین نے کہا اور تمام شیطان کھلکھلا کر ہنس دیے۔

"کیوں نہیں ـــ کیوں نہیں۔ سب آپ کا ہی تو ہے ـــ" ملک اختر نے
اس کی طرف ہوسناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

رات کا کھانا انہوں نے نہیں کھایا تھا۔ اس دوران پرویز بھائی نے
سے بتا دیا تھا کہ ان کا "کوڈ نام" کیا ہوگا اور ان کے علاوہ اور کون اُن
سے رابطہ کر سکتا ہے۔ انہوں نے اس ملاقات میں ملک کے ایک ساحلی علاقے
کی نشاندہی کرتے ہوئے ملک اختر سے کہا تھا کہ وہاں تیسرے روز رات گئے
ہماری کھیپ آئے گی وہ اپنے ملازمین کو موقعۂ واردات سے ہٹا لے تاکہ یہ درندے
آسانی سے اپنا کام کر لیں۔

ملک اختر نے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

وہ رات بھی بیناکشی نے ملک اختر کے ساتھ گزاری۔ اس دوران اس نے ملک اختر کو اگلی زندگی کے ایسے ایسے خواب دکھا دیئے تھے کہ اب اس کی طرف سے معمولی مزاحمت کی توقع بھی ختم ہو چکی تھی۔

اس نے ملک اختر سے کہا تھا کہ دنیا کے جس ملک میں اور جس کرنسی میں وہ چاہے یہ لوگ ادائیگی کر دیں گے۔ اس نے ملک اختر کو مشورہ دیا تھا کہ وہ فوری طور پر کسی غیر ملک میں اپنا اکاؤنٹ کھولے اور رقم بھی اسی بینک میں جمع کروایا کرے۔

اس تجویز کو ملک اختر نے دل و جان سے پسند کیا تھا اور اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ پروین سے زیادہ وفا شعار عورت روئے زمین پر اس کے لئے شاید کبھی نہ دکھائی دے۔ وہ اس کے ایک اشارے پر گردن کٹوانے کو بھی تیار نظر آنے لگا تھا۔

○

وہ دن عارف میاں کے لیے بڑا چونکا دینے والا تھا۔ صبح جب پروین گھر میں داخل ہوئی تو سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔

"میرے خیال میں اب ہمیں الگ ہو جانا چاہیے ــــ" اس نے عارف کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"کیوں ــــ؟" عارف کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اس کا جواب تو تمہیں دہلی والے ہی دے سکتے ہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ میں ان کے حکم سے ہی کوئی فیصلہ کر دوں گی۔"

بیناکشی نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس طرح ۔۔۔۔"

"کس چکر میں پڑ گئے ہو تم عارف میاں ــــ" اس نے عارف میاں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"خدا کا شکر کرو تمہیں مجھ سے نجات مل رہی ہے۔ اب تم کم از کم اپنی مرضی سے یہاں شادی تو کر سکو گے۔ بھئی تم جانتے ہو ہماری شادی ایک بزنس تھا۔ بزنس ــــ اور یوں بھی اب تم کم از کم میرے جسم کے محتاج نہیں رہے ــــ ویسے ایک دوست ہونے کے ناطے تم جب بھی چاہو ہم ماضی کی یادیں تازہ کر سکیں گے۔" بیناکشی نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

"بیناکشی! ٹھیک ہے۔ میں مجبور ہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہیں لیکن کم از کم اتنی بات کا خیال تو کرو کہ میں اپنے والدین کو ۔۔۔۔"

"جہنم میں جاؤ تم اور تمہارے والدین۔ میرے منہ نہ لگو۔ تم جانتے ہو اس بزنس میں معمولی سے انکار پر بھی کتنی بھیانک سزا مل سکتی ہے ــــ اگر میرے رویے سے بھی ان لوگوں پر تمہاری طرف سے سرتابی حکم کا احساس ہو گیا تو جانتے ہو ــــ تمہیں تمہارے والدین سمیت کتے کی موت مار دیا جائے گا ــــ جانتے ہو تم کن کے ٹکڑوں پر پل رہے ہو۔ کن لوگوں نے تمہیں اس قابل بنایا ہے۔ مجھے فوراً بلکہ اسی وقت ایک علیحدہ کاغذ پر طلاق لکھ دو اور اس کی ایک نقل کونسلر کو بھی پہنچا دینا۔"

"کیا کیا پاکھنڈ پھیلا رکھے ہیں تم لوگوں نے ــــ ہونہہ ــــ" اس نے نفرت سے ناک سکوڑی۔

"ٹھیک ہے ــــ ٹھیک ہے ــــ جیسے تمہاری مرضی" ــــ عارف میاں کی گھگی بندھ گئی تھی۔

یوں بھی آج کل وہ غیر معمولی حالات کا شکار تھے اب اچانک مینا کشی نے ان کے سر پر ہتھوڑا چلا دیا تھا۔ عارف کو حیرانگی اس بات پر ہو رہی تھی کہ وہ نجانے کب سے اس گندی اور گھٹیا قسم کی ازدواجی زندگی سے نجات کی دعائیں مانگ رہا تھا اور اب جب اُسے نجات ملنے لگی تھی تو وہ گھبرا گیا تھا۔!!

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو ۔۔۔ تم نے اس سے پہلے میرا کچھ نہیں دیکھا۔ گدھے کہیں کے۔"

"جاؤ اور جیسے میں نے کہا ہے فوراً کرو۔ اور ہاں خبردار اگر کسی سے اس بات کا تذکرہ بھی کیا ۔۔۔ ٹھیک ہے تم لوگوں کو پوچھنے پہ بتا دینا کہ تم نے مجھے طلاق دے دی ہے لیکن اب میں کہاں ہوں اس کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا علم نہیں ۔۔۔ اپنے تنظیم کے ساتھیوں میں یہ افواہ پھیلا دینا کہ میں بھارت واپس چلی گئی ہوں۔"

مینا کشی نے اُسے قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اس کا رویہ اتنا اچانک اور بوکھلا دینے والا تھا کہ اگر عارف میاں کو اس سے ذرا سی بھی محبت رہی ہوتی تو ان کا شاید ہارٹ ہی فیل ہو جاتا۔

عارف میاں نے اس کے حکم کی تعمیل وہیں کھڑے کھڑے کر دی اور اب وہ مینا کشی ہی کے حکم پر اس کی گھر میں موجود تمام تصویریں اکٹھی کر کے اُس کے سامنے ڈھیر لگا رہا تھا۔ اسی بات کا تو اُسے بھی علم تھا کہ مینا کشی نے ان تصاویر کے نیگیٹوز اپنے قبضے میں رکھے ہوئے تھے۔

اس نے جان بوجھ کر بڑی ہوشیاری سے تین چار تصویریں غائب کر لی تھیں جن کا علم شاید مینا کشی کو بھی نہ رہا ہو۔

"دیکھو اگر تمہارے گھر سے میری کوئی تصویر برآمد ہو گئی تو خواہ مخواہ مارے

جاؤ گے۔ اس لیے احتیاط کرنا ۔۔۔ اگر میرے جانے کے بعد کوئی تصویر نظر آ جائے تو اسے جلا دینا۔"

مینا کشی نے اُسے حکم دیا۔

O

گھر کے دوسرے کمروں میں موجود اُس کے والدین کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو سکی کہ ان کی بہو رانی نے کیا گل کھلائے ہیں۔ انہیں صرف اس بات کا علم تھا کہ پروین کی ایک دُور کی رشتہ دار اس شہر میں رہتی تھی جس کے ہاں کبھی کبھی وہ رات گزار لیا کرتی تھی۔ چونکہ بے چاری کے ننھیال انڈیا میں تھے اور جب کبھی ان کی یاد اُسے ستاتی تو اپنا دل ہلکا کرنے کے لیے اپنی خالہ اماں کے ہاں چلی جاتی تھی اس لیے کسی نے بھی کبھی اس پر اعتراض نہ کیا۔

آج بھی اُن کی بہو رانی دو دن اپنی خالہ اماں کے ہاں گزار کر گھر آئی تھیں۔ انہوں نے حسبِ سابق اس کی اور خالہ اماں کی خیریت دریافت کی جس کا جواب بہو بیگم نے ہوں ہاں میں دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

عارف میاں چونکہ اُن کے "کماؤ پوت" تھے اور انہوں نے اس گھر کیا سارے خاندان ہی کا نقشہ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس لیے کوئی بھی ان کے سامنے زبان نہیں کھولتا تھا نہ ہی اس کے کسی فیصلے پر اعتراض کرتا تھا۔

وہ لوگ کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ پروین کے لچھن کچھ ایسے اچھے نہیں تھے کہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے۔ اس کا بن ٹھن کر بازاروں میں گھومنا انہیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لیکن جب دو تین مرتبہ انہوں نے عارف میاں کی توجہ اس طرف مبذول کروانا چاہی تو انہوں نے اس بری طرح گھر والوں کو ڈانٹا تھا کہ پھر کسی کو ان کی ناراضگی مول لینے کا حوصلہ ہی نہ پڑا۔

اُن لوگوں نے بادلِ ناخواستہ سب کچھ جانتے بوجھتے اور دیکھتے بھالتے بھی خاموش رہنے کی پالیسی اپنا رکھی تھی اور کوئی پروین کے منہ نہیں لگتا تھا۔

عارف میاں اپنی سابقہ زوجہ محترمہ کے حکم پہ اُن کے لیے ایک ٹیکسی بُلا لائے تھے اور اب اُس کے تیار کردہ دونوں اٹیچی کیس اُٹھا کر ٹیکسی میں رکھ رہے تھے۔ عارف میاں کے سامنے میناکشی نے جان بوجھ کر ٹیکسی والے کو غلط ایڈریس بتایا تھا اور اُسے لے کر سیدھی ایئرپورٹ آ گئی تھی۔

ایئرپورٹ سے اُس نے ٹیکسی تبدیل کی اور اپنی نئی منزل کی طرف چل پڑی۔ اُس نے اپنے رہنے کا بندوبست فی الحال ایک ہوسٹل میں کیا تھا۔ اس ہوسٹل میں زیادہ تر غیر ملکی لڑکیاں قیام پذیر تھیں۔

اسے اپنی قیادت کی طرف سے کل ہی حکم مل گیا تھا کہ اب شادی والا ڈرامہ برقرار رکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ابھی تک اس نے ملک اختر کو اپنی قیام گاہ سے آگاہ نہیں کیا تھا نہ ہی اس نے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔

لیکن ——

اب کسی بھی لمحے اُسے کسی بھی طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا تھا۔ یوں بھی اُس نے پہلے ہی ملک اختر کو بتا دیا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے اگر اچانک اس پہ اپنے کسی نام نہاد خاوند کا انکشاف کر دیتی تو شاید وہ پسند نہ کرتا۔

"کیا ہوا بیٹا —— پروین پھر چلی گئی ——" عارف میاں کی والدہ نے ان کی شکل پہ نظر پڑتے ہی پوچھا۔

"ہاں اماں بی —— اب ہمیشہ کے لیے دفع ہو گئی ——"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میں نے اُسے طلاق دے دی اماں بی۔"

"طلاق —— تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ——"

"ہاں اماں بی —— میرا دماغ ٹھیک ہی اب ہوا ہے۔ اس سے پہلے واقعی میرا دماغ خراب تھا جو اس کی ہر غلط حرکت کو بے غیرتی سے برداشت کرتا رہا۔ میں آپ کا بھی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری وجہ سے اتنی دیر تک اس کا وجود برداشت کیا ——"

اس نے سکھ کا لمبا سانس لے کر کہا۔

"لیکن بیٹا! آخر ہم برادری والے ہیں —— رشتہ داروں کی زبانوں کو کیسے تھام لیں گے —— وہ لوگ تو پہلے ہی ہم سے بہت حسد کرتے ہیں۔"

"اماں بی —— انہیں بکنے دیجئے۔ آپ آرام سے زندگی گزاریں۔ میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ اب وہ کبھی یہاں نہیں آئے گی۔ شاید آج کل میں وہ بھی انڈیا چلی جائے —— اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا ——" اُس نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس اچانک صورتِ حال نے اُسے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔

"کہیں ان لوگوں کو مجھ پہ شک تو نہیں ہو گیا؟"

یہ تھا وہ سوال جو بار بار اُسے کچوکے دے رہا تھا لیکن وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا کہ اپنی دانست میں ابھی تک اس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی اور اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو اُسے "بابا صاحب" کے نزدیک بھی کوئی نہ پھٹکنے دیتا۔ نہ ہی [illegible] مہربان ہوتی۔

تنظیم کے بڑے لوگوں میں شامل ہونا ہی اس بات کی دلیل تھا کہ وہ ابھی تک اور اس پر کوئی شک نہیں کیا جا رہا۔ بابا صاحب کی نگرانی اور اُن کے

نزدیکی حلقوں پر نظر رکھنے کا کام "را" کرتی تھی اور اس بات کے امکانات
کے برابر تھے کہ "را" کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کوئی بابا صاحب کا قرب
حاصل کر لے۔

شاید بیناکشی کو دوسری کوئی مہم سونپی گئی ہو گی۔ اس نے سوچا۔

یوں بھی جس مقصد کے لیے بیناکشی کے مالکوں نے یہ شادی کا ڈرامہ رچایا تھا
وہ تو پورا ہو ہی چکا تھا۔ انہوں نے یہ سارا کھڑاگ اُسے پاکستان میں قانونی حیثیت
دینے کے لیے پھیلایا تھا جو اُسے مل چکی تھی۔ ایک مرتبہ پاکستان میں آ جانے کے بعد
اُسے جو کام کرنے تھے اس کے لیے جو معاشرتی حیثیت درکار تھی وہ بھی اسے حاصل
ہو گئی تھی۔

یوں بھی جن حلقوں میں اُسے کام کرنا تھا وہاں اُن کا شادی شدہ ہونا بھی
کسی مرحلے پر اُسے "ڈس کریڈٹ" کر دیتا۔ اب وہ ایک کنواری حسینہ کے روپ
میں زیادہ آسانی سے اپنا کام کر سکتی تھی۔

یہ بھی ممکن تھا کہ "را" عارف میاں کو جہاں تک لے جانا چاہتی تھی وہاں
تک لے گئی ہو اب وہ کسی رہنمائی کے بغیر خود ہی اپنا کام کر سکتا تھا۔ اس
لیے اس پر کوئی "نگران" رکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔

اس نے اپنے گھر والوں کو سمجھا دیا تھا کہ انہیں پیرو دین سے متعلق
کے سوالات کے کیا جوابات دینے ہیں۔ طلاق نامے کی نقل اس نے
کو پہنچا دی تھی اور خاصا مطمئن بھی تھا۔

"اسے تلاش کرو۔۔۔ اس سے رابطے کی کوشش کرو۔ یہ بہت ضروری ہے"
شیر گل نے عارف میاں سے کہا۔

شیر گل سے ملاقات سے پانچ چھ روز پہلے ہی بیناکشی نے اُسے خیر باد کہا
تھا۔ اس نے اپنی کہانی جو شیر گل کو سنائی تھی اس کے بعد شیر گل کے لیے تفصیلی
تو ممکن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ کوئی قدم اُن کی اجازت کے بغیر اٹھا
ہی نہیں سکتا تھا۔

اب جو ملاقات ہوئی تو اس نے پہلا سوال ہی پیرو دین سے متعلق کیا تھا۔
"میں نے اس کی دو تصویریں کسی طرح بچا لی ہیں۔۔۔" اس نے یہ کہتے ہوئے
یہ تصویریں شیر گل کو تھما دیں۔

"ہوں۔۔۔"

شیر گل نے تصاویر پر ایک نظر ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"اس نے اپنی منزل بھی مجھے نہیں بتائی۔ جو منزل ٹیکسی والے کو بتائی تھی
ظاہر ہے وہ غلط ہو گی اور اس کا ٹھکانہ کوئی اور ہو گا۔۔۔ ہاں اس بات کی
امید مجھے ضرور ہے کہ کبھی نہ کبھی وہ مجھ سے رابطہ ضرور کرے گی۔۔۔ میں نے اس
سے اپنا رابطہ نمبر دینے کی درخواست کی تھی لیکن اس نے ڈانٹ دیا۔"

عارف میاں نے شیر گل کو ساری واردات سمجھا دی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ کچھ کرنا ہو گا۔ خدا کرے ان تصویروں سے ہی کام چل جائے
تم کوشش کرنا کہ پرویز بھائی کے ذریعے اس تک پہنچ جاؤ۔ آج کل انڈیا انٹیلی
جنس لائزن ڈیسک اس نے سنبھال لیا ہے۔ بڑے بھائی کے بعد پرویز بھائی نے
ان کی جگہ لی ہے۔۔۔ اور ہاں رخسانہ کے نزدیک رہ کر بھی محتاط رہنا اگر کبھی
تمہیں ٹٹولنے کے لیے کوئی ڈھونگ بھی رچائے تو بھی محتاط رہنا۔ یہ عورت
بہت خطرناک ہے تمہاری توقع سے بھی بڑھ کر خطرناک۔۔۔"

شیر گل نے اُسے تلقین کی۔۔۔!!

"میں جانتا ہوں شیر گل صاحب ـــــ لیکن میں نے بھی اب گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ آپ مطمئن رہیے۔ میں بہرحال انڈین لابی میں زیادہ قریب ہو کر مینا کشی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔"

"یہ میگنٹ اپنے پاس رکھ لو۔ آج تمہیں ایک ضروری کام کرنا ہے۔ شام کو کسی وقت بھی تمہارے "بابا صاحب" سے سندھو موومنٹ کے لوگ ملاقات کرنے آئیں گے۔ یہ بہت خفیہ ملاقات ہے کیونکہ بظاہر دونوں کی دشمنی چل رہی ہے۔ اگر آسانی سے ممکن ہو تو رخسانہ کے ٹیلی فون میں یہ چھوٹا سا پرزہ فٹ کر دینا۔ اس کی ترکیب بہت آسان ہے۔ کریڈل کی لیٹنے والی سمت کو کھولو اور اسے اندر رکھ کر بند کر دو۔ اس میں موجود میگنٹ خود اپنی جگہ جما لے گا۔ اس بات کی کوشش کرنا کہ جب تم یہ پرزہ فٹ کرو۔ رخسانہ کو یہ علم نہ ہو کہ اس دوران تم وہاں موجود رہے ہو ـــــ میرا مطلب سمجھ گئے ناں کہ اگر تم نے اپنی موجودگی کا ثبوت دے دیا اور نظر بچا کر یہ پرزہ نصب بھی کر دیا تو فوری انکشاف ہونے پر ان تمام مشتبہ افراد کو لسٹ میں شامل کر لیا جائے گا اور اس کے باوجود کہ تم پر شک کے امکانات کم ہیں پھر بھی تم "بابا صاحب" کے ساتھیوں کی بدخصلتی سے آگاہ نہیں۔ وہ اپنے طور پر تمہاری نگرانی ضرور کریں گے۔ تم سے سائے کی طرح چمٹ جائیں گے اور عین ممکن ہے کہ....."

"یہ کام ہی دوسرا کروں گا ـــــ" اس نے شیر گل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیا ـــــ؟" شیر گل نے بے چینی سے پوچھا۔

"کسی بھی نزدیکی ساتھی کو پھنسا دوں گا ـــــ آپ بے فکر رہیے۔ کام بآسانی سے ہو گا اور اگر کبھی اس کا انکشاف ہو بھی گیا تو ان کا کوئی اور ساتھی ان کے شک کا شکار ہو گا ـــــ اس طرح ان لوگوں میں مشتبہ کی تعداد اور بڑھ جائے گی۔"

"ویل ڈن ـــــ" شیر گل نے اسے داد دی ـــــ "اور ہاں ابھی کالیا وغیرہ سے زیادہ رابطہ نہ کرنا۔ جو پیغام تمہیں کسی بھی ایسے دوست تک پہنچانا ہے اس کے بارے میں بتانا ضروری ہوں ـــــ عارف میاں! تم بہت سی ایسی باتیں جانتے ہو جن کا علم میرے متعلق خدا کی ذات کے علاوہ اور کسی کو بھی نہیں ـــــ ہمارے بزنس میں کوئی ایسا شخص جو ہمارے ایسے رازوں سے واقف ہو جائے جن کا انکشاف ہماری ذات یا ادارے کے لیے تباہ کن ہو۔ اس کی کم از کم سزا موت ہے۔ میں انصاف پر یقین رکھنے لگا ہوں۔ گو کہ میرے یا تمہارے پاس ایسی کوئی عدالتی طاقت نہیں ناں ہی معاشرے نے ہمیں اس مقام پر متمکن کیا ہے کہ ہم فیصلہ اور عمل کا اختیار رکھتے ہوں۔ اس کے باوجود کم از کم میں اپنی آنکھوں کے سامنے اس ملک کو جس کی بنیادوں میں ہمارے بزرگوں کا خون اور ہڈیاں دفن ہیں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں خدا کی عدالت میں جب روزِ محشر پیش کروں گا تو مجھ پر سوائے دنیاوی قوانین کی خلاف ورزی کے اور کوئی الزام نہیں ہو گا ـــــ عارف میاں! مجھے اپنی بہن سے اتنی ہی محبت تھی جتنی ہمارے معاشرے کے بھائیوں کو اپنی بہنوں سے ہو سکتی ہے۔ جس روز اسے قتل کیا گیا اس روز مجھے احساس ہوا کہ اس راستے کی وہ پہلی مسافر نہیں تھی۔ اس سے پہلے جانے کتنی بہنوں کی پاکبازی کا خون کرنے والے درندوں نے انہیں خون میں نہلایا ہو گا ـــــ اگر ذاکر جیسے لوگ نہ رکے تو معاشرے میں شر پھیلے گا۔ وہ لوگ جو "خیر" کے راستے پر سفر کر رہے ہیں وہ مایوس ہوں گے اور جب شر کا قلع قمع ہو گا تو خیر کی راہ ہموار ہو گی اور انہیں کامیابی ملے گی ـــــ ان کے حوصلے بڑھیں گے ـــــ اور ہمارا مشن مکمل ہو گا۔"

شیر گل نے اُسے سمجھایا۔

"میں آپ کے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔ کم از کم اب ضرور سمجھ سکتا ہوں جب مجھے ٹھوکر لگنے کے بعد میری آنکھیں کھلی ہیں خدا کا شکر ہے کہ مجھے ان زیادتیوں کے عینی شاہد ہونے کا موقع نہیں ملا۔ جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں جن کا میں گواہ ہوں۔ میں آج سوچتا ہوں کہ میں نے وہ سب برداشت کیسے کر لیا —— آپ نہیں جانتے بھارتی انٹیلی جنس کے جو نوجوان تربیت حاصل کرتے ہیں اُن کے ذہنوں میں کتنا خطرناک زہر بھرا جا رہا ہے۔ یہ لاوا اگر پھٹ گیا تو اپنے ہی گھر کو جلا کر راکھ کر دے گا۔ ہمیں اس آتش کدے کو ابھی سے ٹھنڈا کرنا ہے ——"

دونوں دیر تک اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے رہے جس کے بعد اس نے اُسے رخصت کر دیا۔

بے چارہ

شیر گل سے الگ ہو کر وہ سیدھا رخسانہ کی طرف آیا تھا۔

اس کی خصوصی حیثیت کے پیش نظر اب کوئی اس سے شناخت طلب نہیں کرتا تھا ورنہ بابا صاحب کے آستانے کے دور دور تک کسی چڑیا کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں تھی۔

وہ سیدھا رخسانہ کے کمرے کی طرف آیا تھا۔

رخسانہ شاید ملحقہ کمرے میں کسی کام سے گئی تھی کیونکہ "گشتی فون" جبل کا تول میز پر رکھا تھا۔

فون کی طرف دیکھ کر اس کا دل ایک مرتبہ زور سے دھڑکا۔

لیکن ——

اپنا دل کڑا کر کے اس نے بالآخر یہ جوا کھیلنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اپنی جیب میں موجود چھوٹے سے بگنٹ کو ٹٹول کر اُس نے موجودگی کی تصدیق کی اور دوسرے ہی لمحے اس نے فون کا کریڈل اتار کر پھرتی سے مائیک والا حصہ کھول لیا —— بگنٹ نما آلے کو وہاں نصب کرنے کے بعد اُس نے بجلی کی سی پھرتی سے دوبارہ اسے بند کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس کا دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آنے کو تڑپنے لگا تھا۔

عارف میاں نے رخسانہ کے کمرے میں جانے کے لیے وہ راستہ اختیار کیا
جس پر صرف وی آئی پی ہی جا سکتے تھے۔ عام کارکنوں کو اس طرف سے گزرنے
کی اجازت نہیں تھی۔ اس نے باتھ روم کا ارادہ کیا تھا اور اس وقت تک
باتھ روم میں بند رہا جب تک اس نے دروازہ کھلنے کی تصدیق نہیں کر لی۔
دو مرتبہ دروازہ کھلا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ یہاں دو شخص اندر
داخل ہوئے ہیں۔ عارف میاں نے باتھ روم کا وہ دروازہ استعمال نہیں کیا جو
رخسانہ کے کمرے میں کھلتا تھا بلکہ ملحقہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔
اب وہ چکر کاٹ کر رخسانہ کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔۔۔ ایم این اے
مقامی ایم پی اے نفیس میاں پہلے سے براجمان تھے۔ اب اُسے سمجھ آ گئی کہ ایک
پہلے نفیس میاں ہی یہاں آئے ہوں گے اور دوسری مرتبہ جب اس نے دروازہ
کھلنے کی آواز سنی تھی تو یہ رخسانہ کی آمد تھی۔

نفیس میاں کا شمار بہر حال تنظیم کے اس گروپ میں ہوتا تھا جس کو بلا
اجازت حاصل کیے بغیر رخسانہ کے کمرے میں آ سکتے تھے۔ اس نے اچانک کمرے
میں داخل ہو کر رخسانہ کو یہی تاثر دیا تھا جیسے وہ ابھی ابھی آیا ہے۔

جس فون میں اس نے شیر گل کا فراہم کردہ آلہ نصب کیا تھا وہ ہمیشہ رخسانہ
کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ وائرلیس نما فون تھا اور عموماً اس وقت زیر استعمال رہتا
جب وہ گاڑی میں سفر کرتی تھی۔

شیر گل نے اس فون میں آلہ نصب کرنے کی ہدایت کی تھی۔ شاید اسے
فون کی کسی اور طرح "بگنگ" ممکن نہیں رہی تھی۔

"کیسے ہو بھئی ۔۔۔ کہاں غائب ہو کل سے ۔۔۔ سناؤ تمہاری چڑیا اُڑ گئی"
رخسانہ نے اُسے اپنے نزدیک بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اچانک تیر چلایا۔

کہہ دیں۔

نفیس میاں حیرانی سے اس کی عارف میاں کے ساتھ بے تکلفی کا نظارہ کر رہے تھے۔

رخسانہ کا اس پر اس حد تک مہربان ہونا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ کیونکہ وہ
بد زبانی اور بدتمیزی کے لیے تنظیم میں ایک خاص شہرت رکھتی تھی۔

"چڑیا کو بہر حال اپنے گھونسلے میں واپس جانا تھا اور پھر آپ سے ملاقات کے
بعد اب ہمارے لیے تو کسی اور طرف دیکھنا بھی گناہ کے مترادف ہے ۔۔۔" اس
نے نفیس میاں سے نظریں بچا کر رخسانہ کو آنکھ مار دی۔

"جی نفیس بھائی ۔۔۔ آپ فرمائیں ۔۔۔" رخسانہ نے شاید نفیس میاں کی اپنی
گفتگو میں دلچسپی کا نوٹس لے لیا تھا۔

"بس میں تو ادھر سے گزر رہا تھا سوچا آپ کو دیکھے کئی روز ہو گئے سلام
کرتا چلوں ۔۔۔ کیسی ہیں آپ ۔۔۔" ڈھلتی عمر کے نفیس میاں جنہوں نے اپنا
خضاب سے اپنے دل کی طرح سیاہ کر رکھا تھا دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولے

"ایک تو لوگوں کو نجانے کیوں میری صحت کی بڑی فکر لگی رہتی ہے ۔۔۔ میرے
حال سے آپ نے اندازہ فرما لیا ہو گا کہ میں بفضل تعالیٰ خیریت سے ہوں اور آپ
کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔ اب اگر کوئی اور کام نہ ہو تو آپ
تشریف لے جائیں۔ آئندہ تشریف آوری سے پہلے مطلع فرما دیا کریں تاکہ آپ کے
شایانِ شان استقبال کا اہتمام کر لیا کروں۔"

رخسانہ نے ایم پی اے کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن وہ
بے شرموں کی طرح دانت نکالتا رہا۔

"آداب عرض ہے۔ آداب عرض ہے ہمارے صاحب وہ کیا کہا ہے کسی شاعر

نے کہ گالیاں بھی تیرے منہ سے کیا خوب لگتی ہیں ملایا کوئی اور۔۔۔" انھوں نے
کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنا چاہا۔

"اچھا خدا حافظ"۔۔۔ رخسانہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اس کا ساتھ
چہرہ کرسی سمیت عارف میاں کی طرف گھما دیا تھا۔

"خدا حافظ۔۔۔" کہتے ہوئے نفیس میاں نے راہ لی۔

"بڑے سینیئر آدمی ہیں۔ ایسے لوگوں کو اس طرح تو نہ دھتکارا کیجئے"
عارف میاں نے کہا۔

"جی ہاں۔۔۔ ان کی طرف سے شادی کی پیش کش قبول کرتی رہا کروں۔
موصوف میرے ساتھ شادی کے خواہشمند ہیں۔۔۔" رخسانہ نے مسکراتے ہوئے
گھنٹی بجائی۔

"کیا مضائقہ ہے۔ ایسا فرمانبردار شوہر آپ کو اور کہاں ملے گا۔"

"لعنت بھیجو۔۔۔ کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ ایسے جلنے کٹنے روزانہ آتے
اور جاتے رہتے ہیں۔"

رخسانہ نے گھنٹی کی آواز پر اندر آنے والے چپراسی سے کافی لانے کو کہا۔

"لیکن محترمہ یہ معمولی ہستی نہیں۔ کالیا کے ساتھ اس کے قریبی مراسم ہیں۔
اس بات کا علم مجھ سے زیادہ اور کسے ہو گا۔۔۔ محترمہ! ہم نے "دا" کی شاگردی میں
چند دن گزارے ہیں اور ایسے شریف زادوں کو بڑی آسانی سے پہچان لیتے ہیں۔
جو بظاہر بابا صاحب کے نام کی مالا جپتے رہتے ہیں لیکن اصل میں تنظیم کی جڑیں
کاٹ رہے ہیں۔

محترمہ! میں نے زندگی میں کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ کالیا بھی غداری کر
سکتا ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا۔۔۔ ذرا احتیاط ہی رہا کیجئے۔"

اس نے خدا کا نام لے کر تشکیک کا بیج ڈال دیا۔

رخسانہ نے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں سوائے سادگی
اور بشاشت کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"اس حادثے کے بعد سے تم کچھ زیادہ ہی سیریس ہو گئے ہو۔ حالانکہ کم از کم
میرے ہوتے ہوئے تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

"اجی صاحب! آپ کے جانثاروں پر کبھی گھبراہٹ طاری ہو۔ ایسا ممکن ہی
نہیں۔ میں تو یونہی بات برائے بات کر رہا ہوں۔"

اس نے رخسانہ کا کمرہ خالی دیکھ کر معمولی سی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا جسے
رخسانہ نے خوشدلی سے قبول کر لیا۔

"اچھا مجھے بھول نہ جائیے۔ آج تمہیں کچھ خصوصی مہمانوں کو ریسیو کرنا ہے۔ ان
لوگوں کو بڑی رازداری سے "الف۔ بی" میں پہنچا دو۔۔۔ اپنی مرضی کے لوگ ساتھ
لے لو۔۔۔"

ان لوگوں نے بابا صاحب سے میٹنگ کرنی ہے جس کے بعد یہ چلے جائیں
گے۔ لیکن کسی کو مہمانوں کی آمد اور بابا صاحب سے میٹنگ کا علم نہیں ہونا چاہیے۔
"اس میٹنگ" کا چارج تم خود سنبھالنا۔۔۔ میں تمہاری معاونت کے لیے وہاں موجود
رہوں گی"۔۔۔ اس نے یہ بات رازداری کے انداز میں کہی تھی۔

لیکن۔۔۔۔

عارف میاں کے لیے تو جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ سمجھانے کتنی شدت
سے اس واقعے کا عینی شاہد بننا چاہتا تھا۔

"بابا صاحب سے ملو گے۔۔۔۔؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔۔۔" عارف میاں نے انکساری سے کہا۔

"مل لو ــــ باباصاحب سے جب بھی موقع ملے ضرور مل لیا کرو۔ تم جانتے ہو بڑے بڑے جانثاران کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترس جاتے ہیں۔ خصوصاً تمہارے لیے تنظیم کے لوگوں میں یہ تاثر بنائے رکھنا ضروری ہے کہ تم باباصاحب کے نزدیک ہو۔ اس طرح یہ لوگ دب کر رہیں گے ــــ بصورت دیگر تم نے تیزی سے عروج حاصل کیا ہے اور تنظیم میں اپنی جگہ بنائی ہے اس سے بے شمار حاسد پیدا ہو گئے ہیں ــــ عارف میاں!

تم بہت سمجھ دار ہو لیکن ہم بھی تمہارے ہمدرد ہیں۔ یاد رکھنا کبھی نہ کبھی ضرور احساس ہو گا۔ تم ابھی تنظیم کے بہت سے رازوں کو نہیں جانتے تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ ہمارے اکثر لوگ اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں محض ایک چشمک" میں مارے جاتے ہیں اور اُن کا الزام ایجنسی یا مخالف لسانی تنظیم پر ڈال کر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔"

رخسانہ نے رازداری سے کہا۔

"اس عورت سے محتاط رہنا ــــ بہت مکار ہے۔ تمہاری توقعات سے بڑھ کر چالاک!"

اس کے لاشعور میں ابھی تک شیرگل کی وارننگ گونج رہی تھی۔

"لیکن باباصاحب کو تو ایسی باتوں کا علم رہتا ہو گا" ــــ اس نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر کہا۔

"باباصاحب سے کچھ پوشیدہ نہیں رہ سکتا ــــ میں تمہیں حلفاً کہتی ہوں اُن کے پاس کوئی ایسی پُراسرار قوت موجود ہے۔ جو انہیں معاملات سے باخبر رکھتی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کی کوئی بات باباصاحب سے پوشیدہ ہے تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے ــــ لیکن یہ ان کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ بہت کچھ برداشت کرتے ہیں" ــــ رخسانہ کافی جذباتی ہو رہی تھی۔

"باباصاحب واقعی عظیم ہیں" ــــ عارف میاں نے بھی اداکاری کے جوہر دکھائے۔

اس نے اپنی کوئی رائے نہیں دی تھی۔ وہ اب بہت محتاط ہو گیا تھا۔ جس خطرناک راستے پر وہ چل رہا تھا وہاں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہی بہترین حکمت عملی تھی۔

رخسانہ نے کچھ دیر بعد ہی اسے اپنی معیت میں باباصاحب کے سامنے پیش کر دیا۔

"آج کے میزبان عارف میاں ہوں گے ــــ ویسے تو بڑا سمجھدار نوجوان ہے۔"

باباصاحب نے شان بے نیازی سے کہا۔

"آپ کی نظر کرم درکار ہے باباصاحب! ہماری جان آپ کے کام آجائے یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے ــــ" عارف میاں نے چاپلوسی کا مظاہرہ کیا۔

انہیں علم ہو گیا تھا کہ باباصاحب کو اپنی تعریف سننے کا جنون کی حد تک شوق ہے اور اسے اُمید تھی کہ یہی شوق انہیں کسی روز جہنم واصل کر دے گا۔

باباصاحب نے اسے بطور خاص چند ہدایات دے کر رخصت کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ رخسانہ کا شکریہ ادا کر کے "۹۵" کی طرف جا رہا تھا جہاں اسے مہمانوں کے استقبال اور آج کی تقریب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بے شمار کے نذرانے حاصل کرنے تھے۔

○

وزیرہ سیفل اپنے تین ساتھیوں سمیت اپنی پجیرو میں اُن کا منتظر تھا۔ ان لوگوں

کی شکلوں ہی سے اُن کی اصلیت دکھائی دیتی تھی ۔ ان کے چہروں سے برستی لع...
اس امر پہ دلالت کرتی تھی کہ یہ وحشی جو انسانوں کے روپ میں یہاں گھوم...
ہیں جنگلوں میں رہنے والے جانوروں سے کئی گنا زیادہ خطرناک ہیں ۔ اگر ان...
بس چلے تو یہ ملک کے تمام شہروں کو جنگلوں میں تبدیل کر کے رکھ دیں کیونکہ...
کے نزدیک جنگل کا قانون ہی دراصل صحیح قانون ہے ۔

ان لوگوں کو دیکھتے ہی چند لمحوں کے لیے عارف میاں حیران ضرور ہو...
تھے کیونکہ ملک بھر کے اخبارات میں دونوں تنظیموں کی دشمنی کے واقعات کا...
بندھا رہتا تھا اور اخباری طور پہ دونوں ایک دوسرے کی جان کے دشمن بنے...
تھے ۔ دونوں ایک دوسرے پہ دن رات غداری کے الزامات لگاتے تھے اور
ایک دوسرے کو ظالم اور خود کو مظلوم بتاتے تھے ۔

لیکن ـــــ

اصل میں دونوں مل کر اس ملک کے بدقسمت اور سیدھے سادے عوا...
کو بیوقوف بنا رہے تھے اور انہیں احساس تک نہیں ہو رہا تھا کہ ان کے سا...
گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے ۔!

طے شدہ پلان کے مطابق عارف میاں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اُن لوگوں...
اپنی گاڑیوں کے جلوس میں لسانی تنظیم کے مخصوص ٹھکانے "الف - بی" پہ...
آئے جہاں بابا صاحب پرویز بھائی اور اُن کے چیدہ چیدہ ساتھی ان لوگوں...
استقبال کے لیے موجود تھے ۔

عارف میاں حیران تھے کہ یہ کیسے ملک دشمن ، غدار ، قاتل اور خونی...
کا استقبال کرنے کے لیے بابا صاحب بنفس نفیس باہر آئے ہیں ۔ عام حالات...
وہ کبھی کسی کے استقبال کے لیے اپنے آستانے سے نہیں اٹھا کرتے تھے اور

...ں کی قدم بوسی کے لیے اُن کے در دولت پہ خود آیا کرتے تھے ۔

○

تھوڑی دیر بعد شیطانوں کی مجلس جم گئی تھی ـــ !!

بابا صاحب کی تنظیم کی تربیت یافتہ فاختاؤں نے حاضرین کے سامنے شراب
شباب سجا دیے تھے اور اب وہ آپس میں مذاکرات کر رہے تھے ۔

"بابا صاحب ! ہماری اور آپ کی لڑائی ایک ہے ۔ دشمن ایک ہے ۔ دوست
...ہے پھر آخر آپ یہ کیا کر رہے ہیں ـــ" سندھو موومنٹ کے وڈیرہ سیفل
نے سلسلہ گفتگو کا آغاز کیا ۔

"ابھی تو میں کہتا ہوں ـــ ابھی تو بتانے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے کہ
جب ہم دونوں الگ الگ اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں ۔ آپ کو بھی اپنا علاقہ
اس ملک کی فوج سے چھڑانا ہے اور ہمیں بھی ۔ ہمیں تو مستقبل میں اچھے ہمسایوں کی
طرح زندگی بسر کرنی ہے ۔ ہمارے تو مفادات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں
پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے ۔ آپ جانتے ہیں ہمارے دہلی والے دوست اس بات
کو سخت ناپسند کرتے ہیں ۔"

بابا صاحب نے زہر فشانی کی ۔

"لیکن اس کی ابتدا ہمیشہ آپ کی طرف سے ہوئی ہے ـــ" وڈیرہ سیفل
کے ساتھی نے کہا ۔

"نہیں یہ غلط الزام ہے ـــ" پرویز بھائی بولا ـــ "آپ اطمینان سے میری
بات سن لیں ۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جن لوگوں کی لسٹ فراہم کی ہے ۔ ان کے علاوہ
اندرون شہر سے کسی کو اغوا کر کے تاوان طلب نہیں کریں گے ـــ لیکن آپ نے
اس اصول کی دھجیاں اُڑا دیں ۔ مانڈا والا کو اغوا کر لیا جبکہ وہ ہمارا دوست ہے ۔

آپ کو علم تھا — ہمیں مجبوراً پیر بادشاہ سے مدد لینی پڑی۔"

"بابا! اگر کسی لڑکے بالے نے غلطی کر لی تھی تو آپ مجھے حکم دیتے میں آپ
کا بندہ خود لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ لیکن سائیں آپ نے اس معاملے
میں جی ایچ کیو کے بندوں کو گھسیٹا۔ یہ غلط بات ہے۔ اس طرح جب ہم تیسری
پارٹی کو درمیان میں لائیں گے تو ہمارے دہلی والے دوست ناراض ہوں گے۔"
وڈیرہ سیفل نے بڑی دھیمی آواز میں جس سے مکاری صاف جھلک رہی تھی جواب دیا۔

"وڈیرہ سیفل! میں ماضی کی باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا — لیکن آپ کو
تین بندے واپس کرنے ہوں گے۔ جن کے نام آپ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہی ایک
طریقہ ہے جو ہمیں دوبارہ اکٹھے کر سکتا ہے —" بابا صاحب نے ہاتھ اٹھا کر
حتمی بات کر دی۔

"ٹھیک ہے بابا صاحب! ٹھیک ہے — لیکن آپ تو ان جنگلی لوگوں کو
جانتے ہیں — اب یہ واقعی ڈاکو بن چکے ہیں۔ اب انہیں ہر کام کا معاوضہ چاہیے
کروڑ پتی پارٹیوں کو شیر کے منہ سے واپس نکالنا بھی تو بچوں کا کھیل نہیں —
سائیں! اُن کا منہ بھی تو بند کرنا پڑے گا ناں۔"

وڈیرہ سیفل نے بابا صاحب کی طرف مکارانہ مسکراہٹ اچھالی۔

"یہ آپ کا معاملہ ہے۔ آپ خود نمٹیں اس سے —" پرویز بھائی بولے۔

"ایک تو آپ نے اپنے بندوں کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔ جہاں بات
نہ کرنی ہو وہاں بھی بات کر دیتے ہیں۔"

وڈیرہ سیفل کی آنکھوں کا رنگ پرویز بھائی کی مداخلت سے بدلنے لگا۔

"ٹھیک ہے — ٹھیک ہے، خاموشی —!"

بابا صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اپنے ساتھیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

جانتی بابا صاحب کے چہرے کی بدلتی کیفیت سے جان لیا کرتے تھے۔ اب
بلاتے ہیں کیا مجال جو کسی نے زبان بھی کھولی ہو۔

"سائیں آپ جانتے ہو کہ ہمارے مالی حالات آج کل ٹھیک نہیں ہیں —
کروڑ روپیہ نہیں دے سکتے۔ صاف بات ہے ہمارے پاس اتنے وافر فنڈز نہیں
ہیں۔ سب کچھ دوستوں سے نہیں ملتا۔ کچھ مارکیٹ سے بھی خریدنا پڑتا ہے آپ
جانتے ہیں —" بابا صاحب نے اُسے بتایا۔

"بابا صاحب ہماری اور تمہاری مجبوری کو یہ ڈاکو لوگ نہیں سمجھتے۔ آپ کی تو
بڑی تنظیم ہے۔ اسمبلی میں سیٹیں ہیں آپ کی۔ وزارتیں ہیں آپ کے پاس۔ ہم
لوگ تو ان کے برابر بھی نہیں ہیں۔ جب آپ کے پاس فنڈز نہیں رہے تو
ہم بیچارے کہاں رہیں گے — بابا ہماری مجبوری کو بھی سمجھو۔"

وڈیرہ سیفل بھی پیروں پہ پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔

"ایک بات آتی ہے ذہن میں اس طرح ہمارا اور آپ کا مسئلہ اکٹھے حل ہو
جائے گا — اور مالک بھی خوش ہو جائیں گے —" وڈیرہ سیفل نے کہا۔

"کیا تجویز ہے —" بابا صاحب نے بے چینی سے پوچھا۔

"اِدھر انڈیا میں معاملہ بہت گڑبڑ ہے۔ یہ آرمی والوں نے سنبھال کر رکھ دیا ہے۔
کشمیر، آسام، پنجاب اور اب تو دہلی میں بھی بڑے دھماکے ہوئے ہیں۔ کل مجھ
سے ملنے آئے تھے انڈین قونصلیٹ سے وہ لوگ کوئی بڑا کام چاہتے ہیں — تین
کروڑ آفر ہے — ایک کروڑ آپ کا اور دو کروڑ ہمارا۔ اس بات کا خیال ہے
اپنے بندے بھی واپس لینے ہیں ڈاکوؤں سے — اُن کا منہ بھی بند کرنا ہو
گا —" وڈیرہ سیفل نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ دوست ہیں ہمارے لیے انہوں نے کیا نہیں کیا — اب ہمیں بھی

حق نمک ادا کرنا چاہیئے ——" باباصاحب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"لیکن رقم ڈبل کروادو۔"

باباصاحب جانتا تھا کہ وڈیرہ سیفل جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کام کے

نے کم از کم دس کروڑ روپے وصول کیے ہوں گے اور وہ لوگ بھارتیوں کی

کرنے کے لیے اکثر ایک دوسرے سے تعاون کر لیا کرتے تھے۔

"باباصاحب آپ فکر نہیں کریں بابا! لین دین ہوتا رہے گا — آپ علاقہ

نشاندہی تو کریں۔ ہم کر دیں گے آپ کے تعاون کا — آپ کو اُدھر سے بھی

دیں گے۔"

وڈیرہ سیفل نے آنکھ دبائی۔

"اُدھر کی فکر نہ کریں — وہ ہمارا اور اُن کا آپس کا معاملہ ہے

وہاں سے خود لیں گے۔ آپ اپنی بات کریں —" باباصاحب نے بھی کچی گولیاں

کھیلی تھیں۔

بڑی رد و قدح کے بعد بالآخر وہ یہ رقم ڈبل کرنے پر آمادہ ہو گئے

اپنا گھناؤنا کھیل کھیلنے کے لیے علاقہ درکار تھا جہاں وہ بے فکر ہو کر نشانہ

اپنے بھارتی آقاؤں کو خوش کر سکیں۔

"وہ کیا نام ہے اس کا وہ حیدر آباد والا ——" باباصاحب نے پرویز

کی طرف دیکھا۔

"مہتاب میاں —"

"ہاں! ہاں — وہی۔ وہی — وڈیرہ سیفل تم وہاں حملہ کر دو سب

کو مار ڈالو۔ ہمیں اپنی تنظیم کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے ابھی بہت

خون درکار ہے۔ ہمیں شہید مل جائیں گے اور تمہیں شکار کھیلنے کے لیے میدان

تمام درندوں نے شیطانی قہقہے لگا کر آسمان سر پہ اُٹھا لیا تھا۔

"لیکن باباصاحب وہ تو اپنے لوگ ...." نفیس میاں نے دبی دبی آواز میں

کہا۔

"ابے سالے۔ بڈھے! تیرا دماغ سٹھیا گیا ہے کیا — ابے حرام کے پلے!

کوئی اپنا نہیں ہوتا اور سب اپنے ہوتے ہیں۔ یہ جو وڈیرہ سیفل ہے یہ ہمارا

ہے لیکن ہم اس وقت ایک دوسرے کے لیے کتنے عزیز اور ناگزیر ہیں۔

سالے تیرے دماغ کو بخار ہو گیا ہے سالے پرویز بھائی! ذرا اس کا

ناں ۔"

باباصاحب نے شیطانی قہقہہ لگا کر پرویز بھائی کی طرف دیکھا۔

"ابے کتے کے پلے۔ باباصاحب کی مدبّروں پہ پلنے والے سالے تیرے دماغ

میں یہ بات آئی ہی کیسے۔ تجھے کیسے ہمت ہوئی باباصاحب کے فیصلے پہ ریمارکس

ابے جس کا کھاتا ہے اسی کے سامنے زبان کھولتا ہے۔ وحشت تیرے

کہتے ہوئے پرویز بھائی نے اچانک اتنے زور سے نفیس میاں کی کمر میں

کہ وہ منہ کے بل باباصاحب کے قدموں میں گر پڑا۔

"مارو۔ مارو سالے کو — خوب مارو — خوب مارو —" باباصاحب پہ

کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

یہ دورہ ان پہ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ پڑتا تھا لیکن بڑا خطرناک ہوتا تھا۔

ساری محفل پہ جنون طاری ہو گیا تھا۔

وڈیرہ سیفل اور اس کے ساتھیوں سمیت تمام لوگ اُس کو ٹھوکریں مار

یوں لگتا تھا جیسے ان وحشی درندوں کے ہاتھ کوئی کھلونا لگ گیا ہو۔

نفیس میاں باباجی کے قدموں کو بار بار چھو کر اُن سے معافی مانگتا لیکن

بابا صاحب اُس کے منہ پر ٹھوکر مار کر پرے کر دیتے۔

"بس کرو ——— بس کرو ——— اے پرویز بھائی اسے معاف کر دو۔ اِس نے بہت خدمت کی ہے ہماری ———"

بابا صاحب نے اچانک ہی انہیں رُکنے کا اشارہ کیا۔

پرویز بھائی نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور پلک جھپکتے میں وہاں عارف بھائی اور اُن کے مسلح ساتھی موجود تھے۔

"اسے "وہ" پہ لے جاؤ ——— پھر معاف کر دینا" ——— پرویز بھائی نے بابا صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نفیس میاں جنونیوں کی طرح "بابا صاحب معاف کر دو۔ بابا صاحب مولا" کی ورد کی گردان کر رہا تھا۔

لیکن ———

جواب میں شیطانی قہقہے بلند سے بلند تر ہوتے چلے گئے۔

"سالا کتے کا پلا۔ ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں ——— ویڈیو سیٹھ ساتھ ساتھ کل ہی نظارہ دکھا دو۔ ہا ہا ہا ———"

وحشیوں نے آپس میں جام ٹکرائے اور شب بسری کے لیے اُن لڑکیوں کی طرف لپکے جو پرویز بھائی کے یہاں سے ہٹنے کے بعد اندر آ گئی تھیں۔ انہیں بطور خاص ان مواقع کے لیے رکھا گیا تھا۔

شیطانوں کا رقص اپنے نقطۂ عروج کو چھو رہا تھا۔

درندگی کا ننگا ناچ جاری تھا۔

انسانیت اپنا منہ چھپائے پھرتی تھی۔

اگلے روز حیدر آباد کے ایک علاقے میں جہاں لسانی تنظیم کے دفاتر تھے، سندھو موومنٹ کے غنڈوں نے حملہ کر دیا۔

انہوں نے آگ اور خون کا ایک سمندر بہا دیا ——— بے کس، بے بس افراد اور بابا صاحب کی ذلالتوں کے شکار معصوم بچے، مرد، عورتیں گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ اس حملے میں اُس شخص نفیس بھائی کو بطور خاص نشانہ بنایا گیا۔ اُسے گھر میں مکینوں سمیت زندہ نذرِ آتش کر دیا گیا۔

سندھو موومنٹ نے "را" کا حقِ نمک ادا کر دیا تھا۔

لسانی تنظیم نے کالی ماتا کے حضور اپنے بے گناہوں کی بلی چڑھا دی تھی۔

دونوں نے سیاسی فوائد حاصل کر لیے تھے۔

لسانی تنظیم مظلوم بن گئی تھی۔

سندھو موومنٹ معتوب ہو کر مظلومیت کا پرچار کر رہی تھی۔

بابا صاحب نے حسبِ روایت اس تباہی و بربادی کا ذمہ دار مخالف لسانی تنظیم اور ابابیلوں کی ملی بھگت کو قرار دیا۔

شہرِ بے مثال میں موجود بھارتی قونصلیٹ میں وہ شام ایک یادگار قرار پائی۔ اور نہ یہاں کوئی تقریب منائی جا رہی تھی جس میں مختلف سیاسی تنظیموں کے نمائندے بھی مدعو تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جو وقت آنے پر اپنی غیرت کا سودا اپنے ہاتھوں کر سکتے تھے۔ بھارتی قونصلیٹ کے چہرے پر طویل عرصے بعد ایک گہری مسکراہٹ جاگی تھی۔

سیکورٹی والے

نفیس میاں کا جسم دُکھتا ہوا پھوڑا بن چکا تھا۔

زخموں سے زیادہ بے عزتی اور ذلت کا احساس انہیں مارے ڈالتا تھا۔ اذیت کے جن لمحات سے وہ گزر رہے تھے کبھی وہ دن بھی تھے جب وہ اپنے مخالفین کو ایسی ہی ذلت، اذیت اور پھر گمنام موت سے دوچار کیا کرتے تھے۔

انہوں نے پارٹی میں یہ مقام یونہی نہیں حاصل کر لیا تھا۔ اس کے پیچھے برسوں کی محنت، قربانیاں اور جدوجہد موجود تھی۔ وہ گزشتہ دس سال سے حلقے کی سیاست پر بلاشرکت غیرے قابض تھے اور اکثر بلامقابلہ کونسلر منتخب ہوا کرتے تھے۔ انہیں لسانی تنظیم کے سہارے کی ضرورت کبھی نہیں رہی تھی۔ اگر وہ لسانی تنظیم میں شامل نہ بھی ہوتے تو بھی اُن کے حلقے کے ووٹر انہیں کم از کم کونسلر کا الیکشن نہ ہارنے دیتے اور اس سے آگے انہوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کیونکہ کونسلر کی حیثیت سے ہی وہ دو تین مرتبہ منتخب ہو کر ساری زندگی کی روٹیاں کھری کر چکے تھے۔

بُرا ہو اُس وقت کا جب انہوں نے قناعت ترک کی اور اسمبلی میں جانے کی سوچی جس کے لیے انہیں اس شہر میں کم از کم لسانی تنظیم کا کور ضرور حاصل کرنا تھا۔

لیکن ——

اس سب کچھ کے باوجود نفیس میاں نے تنظیم کو جو کچھ دیا اتنا کچھ اُس سے حاصل نہیں کیا۔ بس یہ ضرور تھا کہ انہیں لڑکپن ہی سے جو علت لگ گئی تھی اس کے لیے مہیا، ان وافر سامان میسر تھا اور وہ جب بھی چاہتے بلاخوف و خطر اپنی عیاشی کا سامان حاصل کر لیتے۔

لیکن ——

اس کی اتنی زیادہ قیمت؟

نفیس میاں کا جسمانی اور روحانی تکلیف سے دل و دماغ پھٹ رہا تھا۔

"اچھا! باباصاحب! زندہ تو تم مجھے چھوڑو گے نہیں لیکن اپنی قسمت سے اگر میں تمہارے شکنجے سے بچ نکلا تو میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد رہ جائے گا اور وہ ہوگا تمہاری بربادی —— ہاں باباصاحب! میں تمہیں اسی طرح سسکا سسکا کر مار دوں گا جس طرح تم نے مجھے زندہ درگور کیا ہے۔" ——

نفیس میاں نے دل ہی دل میں عہد کیا ——!!

انہیں اپنے زخموں کی تکلیف قدرے کم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ اب اس تکلیف، اذیت اور ذلت پر انتقام کا جذبہ غالب آنے لگا تھا۔

عارف میاں اور اس کے تین ساتھیوں نے نفیس میاں کو تنظیم کی ایمبولینس میں اسٹریچر پر مریضوں کی طرح لٹا کر ان کے جسم کو اسٹریچر سے فاسک پٹیوں سے باندھ دیا تھا۔ انہیں "۹۰" کی طرف لے جایا جا رہا تھا تاکہ نفیس میاں کے علاج کا بندوبست ہو سکے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ نفیس میاں کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُبل پڑا۔ وہ اپنا جسم تو ہلا نہیں سکتے تھے زبان البتہ ضرور چلا سکتے تھے کیونکہ ان کے منہ پر کوئی بند نہیں باندھا گیا تھا۔

نفیس میاں دیوانگی کے عالم میں ایمبولینس میں اپنے سرہانے کھڑے عارف میاں

اور ان کے ساتھی کو گالیاں بکتے ہوئے انہیں وارننگ دے رہے تھے گزار
رو زدہ، دونوں بھی اسی طرح اسی سٹریچر پہ بے بسی سے بندھے پڑے ہوئے بولا
کیونکہ بابا صاحب ایسا سانپ ہے جو اپنے بچوں کا خون پی کر ہی اپنی زندگی کے
دن بڑھا رہا ہے۔

"سالے کا دماغ چل گیا ہے ___ مرنے سے پہلے اس کا دماغی توازن بگڑ
لگا ہے ___" عارف میاں نے اپنے ساتھی سے کہا اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنس
"اب چپ کر بڈھے ___ کیوں اپنی زندگی کے چند گھنٹوں کو مزید چھوٹا کر
ہے ___" اس کے ساتھی نے کہا۔
"اگر اب آواز نکالی تو حلق میں روئی دے کر منہ باندھ دوں گا ___" عارف
نے اس طرح سختی سے نفیس میاں کو ڈانٹا کہ ان کی گھگھی بندھ گئی۔
وہ سہم کر چپ چاپ لیٹ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے اچانک سانپ
سونگھ گیا ہو۔

پرویز بھائی کے حکم پہ وہ نفیس میاں کو "۵۹" پہ لے جا رہے تھے۔ پرویز
بھائی نے عارف میاں کو ہدایت کی تھی کہ آج رات ہی نفیس میاں کی خاطر مدارت کے
بعد اُن کی لاش ٹھکانے لگا دی جائے۔
اپنے ملزمان کی منتقلی کے لیے یہ لوگ یہی طریقہ استعمال کیا کرتے تھے۔

○

گل شیر خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ ناکے پہ مستعد تھا ___!
گو کہ اس علاقے میں پولیس کی گشتی گاڑیاں موجود تھیں۔ سڑک کے
چوکوں میں پولیس نے مورچہ بندیاں بھی کر رکھی تھیں۔
لیکن ___

اسے ان میں سے کسی پر بھی اعتبار نہیں رہا تھا۔
وہ جانتا تھا ان میں سے کسی کی بھی ہمت نہیں کہ لسانی تنظیم کی کسی ایمبولینس
کو روک کر اس کی تلاشی لے سکیں جبکہ انہیں بہر صورت یہ کام کرنا تھا۔
عارف میاں نے اپنے وسٹی ٹیلی فون پر موقع پاتے ہی اسے صورت حال سے
مطلع کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ لوگ نفیس میاں کو "۵۹" تک پہنچانے کے لیے
فلاں نمبر کی ایمبولینس کے ذریعے فلاں راستے سے گزریں گے۔
نفیس میاں کا زندہ رہنا ملک و قوم کے لیے ناگزیر تھا۔ اس کے پاس بابا صاحب
کے بہت سے راز تھے۔ کئی تخریب کاری کے منصوبوں میں وہ بابا صاحب کا دست راست
رہا تھا۔

یوں بھی تنظیم کے باغی گروپ کی سیاسی قوت بڑھانے کے لیے نفیس میاں
اہم تحفہ ثابت ہو سکتے تھے۔ ایسے بزرگ سیاستدان کا باغی گروپ میں شامل ہونا
تنظیم کی بنیادیں ہلا سکتا تھا۔
گل شیر خان نے اس منصوبے میں سوائے افسر اعلیٰ کے اور کسی کو رازدار نہیں
بنایا تھا۔

عارف میاں نے بڑی ہوشیاری سے موبائل فون کے ذریعے یہ اطلاع اس
تک پہنچائی تھی جسے اپنے نئے افسر اعلیٰ کی طرف سے خصوصی پشت پناہی حاصل تھی۔
گل شیر نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کا نیا افسر اعلیٰ جو حال ہی میں اعلیٰ سروسز کا امتحان
پاس کر کے آیا تھا ابھی تک بیوروکریسی کے گندے اثرات سے محفوظ تھا اور اسے
نئے افسر اعلیٰ کی صورت میں ڈیپارٹمنٹ کو ایک ہونہار آفیسر میسر آیا تھا۔
گل شیر کو بھی ایک محب وطن سپاہی مل گیا تھا۔
افسر اعلیٰ نے گل شیر سے ملاقات کرنے سے پہلے اس کی فائل پڑھ لی تھی اور

اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے اُس نے اور بھی بہت کچھ جان لیا تھا۔ شیر گل کی زبانی ماضی کے تمام واقعات سننے کے بعد اسے کہا تھا۔

"میری پہلی وابستگی اپنے ملک اور اس کی سلامتی سے ہے اور اس میں زندگی بھر کسی سودے بازی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جہاں میں نے محسوس کیا کہ میرے افسران کے مفادات میری اس کومٹمنٹ سے ٹکرا رہے ہیں تو میں استعفیٰ دے کر گھر چلا جاؤں گا ـــــ میرا تعلق زمیندار گھرانے سے ہے اور میں اپنے ملک کی سلامتی کے خلاف کسی سازش میں حصہ دار بننے سے ڑرزق کمانا زیادہ افضل جانتا ہوں۔"

اس مختصر سی بات نے شیر گل کے دل و دماغ کو مسحور کر لیا تھا اور یوں جانا جیسے اس کے سر سے منوں بوجھ اُتر گیا ہو۔ اس روز سے شیر دل کا بڑا ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا تھا۔

اُس نے اپنے افسرِ اعلیٰ کو نیند سے جگا کر عارف میاں کی طرف سے ملنے والی اس تازہ ترین اطلاع سے مطلع کیا۔ اور اپنا منصوبہ بتا کر اس پر عمل پیرا ہونے کی اجازت طلب کی تھی۔

مہربان اور محبِ وطن افسرِ اعلیٰ نے اُسے نہ صرف اجازت دی تھی بلکہ کہا تھا کہ رات کے جس پہر میں وہ چاہے اسے نیند سے جگا کر کوئی بھی مدد یا مشورہ طلب کر سکتا ہے۔

شیر گل نے اس سب کچھ کو تائیدِ غیبی جانا تھا۔

وہ اپنے محکمے کی جیپ اور مسلح گارڈ کے ساتھ اس ناکے پر موجود تھا جہاں سے موڑ کاٹ کر ایمبولینس کو آگے جانا تھا۔ یہاں موجود ریلوے لائن کے پھاٹک کو اُن لوگوں نے بند کر کے فرار کی ساری راہیں مسدود کر دی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی انہیں ایمبولینس کی چھت پر گھومتی لائٹ دکھائی دے گئی۔ سب لوگ مستعد ہو کر اپنی جگہ ڈٹ گئے۔

منصوبے کے مطابق اُن سے کچھ فاصلے پر موجود ایک ساتھی نے سرخ رنگ کی لالٹین سڑک پر رکھ کر ایمبولینس کو رُکنے کا سگنل دیا۔

ایمبولینس کے ڈرائیور نے اپنی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں پولیس کی وردی پہنے دو سپاہیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں ہنستے ہوئے ایمبولینس روک دی۔

O

وہ جانتا تھا کہ یہ معمول کی کارروائی ہے۔

"کیا بات ہے ـــــ بریک کیوں لگا رہے ہو ـــــ" عارف میاں نے جان بوجھ کر ایمبولینس کے پچھلے حصے سے ڈرائیور کو پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں عارف بھائی شاید کوئی نئے گدھے ہیں ـــــ سالوں کو شوق پورا کرنے دو ـــــ ہماری شکل پہ نظر پڑتے ہی معافی مانگ لیں گے۔"

ڈرائیور نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

جیسے ہی ایمبولینس سڑک کے ایک کونے پہ کھڑی جیپ سے بجلی کی سی پھرتی سے شیر دل اور اس کے ساتھی برآمد ہوئے۔

شیر دل نے ڈرائیور کو ایک لمحے کی مہلت دیے بغیر اُس کی کنپٹی پر پستول رکھ کر اُسے ایمبولینس سے باہر آنے کا حکم دیا۔

"کون ہو تم ـــــ کیا بات ہے ہم تنظیم کے رضاکار ہیں" ـــــ اچانک ٹوٹ پڑنے والی قیامت نے ڈرائیور کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے۔

"زیادہ بک بک نہ کرو اور باہر آؤ ـــــ" کہتے ہوئے شیر دل نے اُس کے کالر کو جھٹکا دے کر اُسے باہر پھینک دیا تھا۔

اگلے ہی لمحے اس کے ساتھیوں نے ایمبولینس کا دروازہ کھول کر اُن کو عارف میاں اور اس کے ساتھی کو ہاتھ کھڑے کروا کر باہر نکال لیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" —— شیر دل نے سٹریچر سے بندھے نفیس میاں کی طرف اشارہ کر کے

"مریض ہے" —— عارف میاں نے کہا۔

"بکواس کرتے ہیں یہ —— مجھے اغوا کر کے قتل کرنے کے لیے لے جا رہے تھے —— پکڑ لو ان درندوں کو۔ یہ بابا صاحب کے خونخوار ساتھی ہیں"

نفیس میاں کی زبان پوری قوت سے چل رہی تھی۔

"کھولو اسے ——" شیر دل نے عارف میاں اور اس کے ساتھی کو حکم دیا۔

"دیکھو تم لوگ ہمیں نہیں جانتے شاید اس شہر میں نئے آئے ہو —— تم مارے جاؤ گے۔ ہمارے پھڈے میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ پولیس چیف صاحب سے فون پر بات کروا دو۔ ورنہ تم سب نوکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

عارف میاں نے اپنی دانست میں اُنہیں ڈانٹ پلائی۔

ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے شیر دل نے اس کی اس بات کا جواب اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر کے دیا۔

تھپڑ مارنے کا انداز تو بڑا جارحانہ تھا لیکن عارف میاں کو بہت کم چوٹ محسوس ہوئی۔

"زیادہ بکواس کی تو زبان گدی سے کھینچ لوں گا" —— اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"تم بہت پچھتاؤ گے —— بابا صاحب تمہارے جسم سے ماس علیحدہ کروا دیتے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے۔"

عارف میاں کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔

"اسے باہر لے جاؤ۔ تم کھولو اسے" —— شیر دل نے اپنے ساتھیوں کو عارف میاں کو باہر ڈرائیور کے پاس لے جانے اور اس کے ساتھی کو نفیس میاں کی رسیاں کھولنے کا حکم دیا۔ اگلے ہی لمحے نفیس میاں آزاد تھے۔

شیر دل کا ایک ساتھی اُنہیں جیپ کی طرف لے گیا۔ عارف میاں اور اس کے دونوں ساتھی ہاتھ اوپر کیے ایک طرف کھڑے تھے۔ جب سڑک پر انہیں ایک ٹرک اس طرف آتا دکھائی دیا۔

"بھاگو ——" اچانک ہی عارف میاں چلّائے۔

اس کے ساتھ ہی عارف میاں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر وہ بھی اس کے تعاقب میں سڑک عبور کر گئے۔

منصوبے کے مطابق پہلے شیر گل اور اس کے ساتھی اُنہیں "رک جاؤ رک جاؤ" للکارتے رہے جب وہ بندوقوں کی رینج سے باہر ہو گئے تو انہوں نے ان کے تعاقب میں ہوائی فائرنگ شروع کر دی پھر اُن کا تعاقب بھی شروع ہو گیا۔

لیکن ——

رات کے اندھیرے میں عارف میاں اور اُن کے ساتھی سیکورٹی والوں کو جل دے کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔

○

بابا صاحب کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

چیل کے منہ سے کوئی شکار چھین کر لے جائے تو بھی اس کی وہ حالت نہ ہوتی جو حالت اس وقت بابا صاحب کی ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے اُنہیں اور بہت سے سانحوں کا سامنا تو رہا تھا۔

لیکن ——

یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک ایسا بکرا جسے ذبح کرنے کے لیے انہوں نے [illegible] پہ لٹا رکھا ہو اور تکبیر پڑھ کر اس پہ چھری پھیرنے کی تیاری کر رہے ہوں [illegible] اسے کوئی دوسرا چھین کر لے جائے۔

یہ حرکت جس نے بھی کی تھی اس کے متعلق بابا صاحب غلط فہمی کا شکار نہ رہے تھے۔ اس سیکورٹی ایجنسی کے افسر اعلیٰ کے اُن کے شہر میں تقرر [illegible] ہی اس کی حب الوطنی کی کہانیاں اُس کے خاندانی پس منظر سمیت بابا صاحب [illegible] پہنچ چکی تھیں۔

انہوں نے اپنی دانست میں اسے معمولی بات جانا تھا۔ اس شہر میں نجانے کتنے محب الوطن اس سے پہلے آئے تھے جو اب اُن کے ٹکڑوں پہ پلتے اور [illegible] کے اشاروں پہ بندروں کی طرح ناچ رہے تھے۔

انہوں نے تو یہی سوچا تھا کہ یہ افسر اعلیٰ کس باغ کی مولی ہے ان کے [illegible] اُن کی چوکھٹ پہ سجدہ ریز رہتے ہیں۔

لیکن ——

یہ شخص اچانک اُنہیں اس طرح دھچکا لگا دے گا؟

یہ تو بابا صاحب نے گمان بھی نہیں کیا تھا۔ ان کے شیطانی ذہن نے [illegible] کی کئی تاویلیں تلاش کی تھیں بالآخر ان کے شیطانی ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ ضرور یہ شخص اپنی اہمیت کا احساس دلانا چاہتا ہے کیونکہ اُس کی اس شہر میں [illegible] کے بعد سے انہوں نے اس کے ساتھ کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ رابطہ نہیں کیا تھا۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے اُنہوں نے فون اُٹھایا اور اپنی سیکرٹری کو حکم دیا [illegible] منی جان سے فوراً ملاقات کا اہتمام کیا جائے۔

دو گھنٹے بعد منی جان اُن کے سامنے بیٹھی تھی۔

انہیں بطورِ خاص اس کمرے میں بٹھایا گیا تھا جہاں بابا صاحب کے ساتھ ملنے والے کے متعلق اگر کسی کو غلطی سے بھی علم ہو جاتا تو اُس کی آنکھیں نکال کر اس کی زبان کاٹ دی جاتی تھی۔

اس شہر میں بمشکل چار پانچ ایسے لوگ تھے جو بابا صاحب کے ساتھ بطورِ خاص اس کمرے میں ملا کرتے تھے۔

"کیسی ہو منی جان!" —— بابا صاحب نے کمرے میں گھستے ہی اپنے ہونٹوں پہ بھوکے بچوں کی طرح زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی مہربانیوں کے صدقے جی رہے ہیں بابا صاحب!"

منی جان نے جو اس شہر کی سب سے بڑی طوائف تھی جواب میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

منی جان تھی تو طوائف لیکن بڑی بڑی شریف زادیاں اور شریف زادے اُس کا پانی بھرتے تھے۔ جس طرح سیاست میں بابا صاحب کو مقام حاصل تھا اسی طرح اپنے کاروبار میں منی جان کو رسائی حاصل تھی۔ بڑے بڑے افسر تو محض اس کا حوالہ [illegible] رام ہو جایا کرتے تھے۔ کئی وزراء اور شرفاء تو اس کے محض ایک دیدار [illegible] اس کے جائز ناجائز کام کرنے کے لیے ایک دوسرے پہ بازی لے جانے کے چکر میں رہتے تھے۔

کون سا ایسا سرکاری اور غیر سرکاری حلقہ تھا جہاں تک منی جان کو رسائی حاصل نہ تھی۔ غیر ملکی سفارت خانوں میں اُس کے خصوصی مراسم تھے۔ امیر زادوں [illegible] ہوئے بچے اُسے لاکھوں روپے رشوت دے کر غیر ممالک کے ویزے [illegible] تھے۔

لیکن ـــــــ

ایک بابا صاحب کی شخصیت ایسی تھی جس کے سامنے منی جان کو دم مارنے کی
مجال نہیں تھی۔ ایک دو مرتبہ اس نے اپنے طور پر اس شہر میں بابا صاحب کی لسانی
تنظیم کا جال توڑ کر اپنا لوہا منوانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن ـــــــ

اس کا حاصل سوائے ذلت، پشیمانی اور مستقل خوف کے اور کچھ نہیں تھا وہ جانتی
تھی اس شہر میں بابا صاحب کی اجازت کے بغیر ہوا بھی اپنا رُخ نہیں بدل سکتی بابا
صاحب کے ہر جائز ناجائز حکم پر وہ کاروں میں سجی پلاسٹک کی گڑیوں کی طرح سر ہلاتی
رہتی تھی۔

اس کی قوت اس شہر کے اعلیٰ خاندانوں کی وہ لڑکیاں تھیں جو کسی نہ کسی طرح
میں اس کے جال میں پھنس کر اب کٹھ پتلیوں کی طرح اس کے اشاروں پر ناچا کرتی
تھیں۔ اُن کی ہر جائز ناجائز خواہش منی جان پوری کرتی تھی اور منی جان کی خواہش
اُن کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی ـــــ!!

جس مگرمچھ کو رام کرنا ہوتا اس کی حیثیت کے مطابق منی جان اپنی فاحشاؤں کی
فوج سے کسی ایک فاحشہ کو اس افسر پر چھوڑ دیا کرتی تھی۔ آج تک اس نے ناکامی کا
منہ نہیں دیکھا تھا۔ اپنے اس بزنس میں وہ یکتائے روزگار تھی۔

اس شہر میں آنے والے کسی بھی سرکاری محکمے کے اعلیٰ ترین افسر سے تعلقات
قائم کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور اب تو اس نے بڑے سائنٹفک انداز
میں اپنا کام شروع کر رکھا تھا۔ وہ اس شہر میں آنے والے کسی بھی اعلیٰ افسر
اُس کی آمد کے چند دنوں کے اندر ہی اندر اپنی کسی فاحشہ کے ذریعے تعلقات قائم
لیا کرتی تھی پھر اس افسر سے متعلق گاہکوں کی تلاش میں لگ جاتی تھی۔

لیکن ـــــ

چند روز پہلے ہی اُسے زندگی کی سب سے اہم ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا تھا۔
اس نے سیکورٹی ایجنسی کے حال ہی میں چارج سنبھالنے والے افسرِ اعلیٰ پہ اپنی
بہترین لڑکی کے ذریعے جس کا تعلق اس شہر کے بہت بڑے خاندان سے تھا،
سنہرا جال پھینکا تو نہ صرف اُس لڑکی کو منہ پر طمانچہ کھانا پڑا بلکہ اس افسرِ اعلیٰ نے
ایک کراہی حد تک اس کا ناطقہ بند کر کے رکھ دیا تھا۔

منی جان نے بڑے ہاتھ پاؤں مارے اور خود سرکار دربار میں حاضری دے
کر اپنی پرانی اور موجودہ خدمات کی دہائی دیتے ہوئے انصاف چاہا۔

لیکن ـــــ

ہر جگہ اسے ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑا۔ ایک وزیر صاحب جس سے منی جان
کے ذاتی مراسم اس وقت سے قائم تھے جب وہ محض ایک ڈرگ سمگلر ہوا کرتے
تھے اور جن کے ذریعے اُس نے بڑے بڑے ناممکن کام ممکن کر دکھائے تھے جب
منی جان نے مدد کی اپیل کی اور اُنہیں بتایا کہ یہ اس کے لیے زندگی موت کا مسئلہ بن
گیا ہے۔ زندگی میں اس نوعیت کی ذلت تو اس نے اُن دنوں میں نہیں اُٹھائی تھی۔
جب وہ خود اس شہر کی عام سی جسم فروش عورت تھی اب تو اس کا مقام ہی
بڑا اونچا تھا۔

ساری رُوداد سُننے کے بعد وزیر موصوف نے فوراً مرکز سے رابطہ کیا اور
جب اس نوجوان افسر کا جغرافیہ معلوم کرے دوسری طرف اُسے جو کچھ کہا گیا
اُس کا اندازہ ٹیلی فون سُنتے ہوئے اُس کے چہرے سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔
منی جان کو اپنے قدموں تلے زمین سرکتی محسوس ہو رہی تھی۔

وزیر موصوف نے ٹیلی فون کریڈل پر رکھنے کے بعد سب سے پہلے اپنے میز کی

دراز میں رکھی گولیوں کی شیشی سے ایک گولی نکال کر زبان کے نیچے رکھی اور
قدرے مطمئن ہونے کے بعد کہا۔

"منی جان تم کہاں جا پھنسیں ــــ یہ معاملہ اپنے کیا بلکہ اس شہر میں کسی کا
کا نہیں۔ یہ نوجوان کوئی عام سا افسر نہیں ہے جانتی ہو یہ کس کا بیٹا ہے ؟

جواب میں جس شخصیت کا نام اس نے لیا اُسے سننے کے فوراً بعد منی جان کو
احساس ہو گیا کہ اُس نے غلطی سے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال دیا ہے اب اس کی
انگلیاں مکمل رہ جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہوگا۔

اس کے بعد سے اُس نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا تھا کہ آئندہ کبھی بھول کر
اس واقعے کو یاد بھی نہیں کرے گی۔ اب جو اچانک بابا صاحب نے کہا۔

"بھئی کون ہے یہ لونڈا ـــــ یہ سیکرٹ ایجنسی والا ـــــ تیا آیا ہے بڑھا
پُرزے نکال رہا ہے۔"

منی جان کو یوں لگا جیسے کسی نے اُس کے دل پہ زور سے گھونسا مارا ہو۔

"بابا صاحب! میں اس کے ہاتھ دیکھ چکی ہوں۔ منّی جان نے زندگی میں کبھی
ہار تسلیم نہیں کی لیکن یہ بڑی بلا ہے۔ اس کمبخت نے تو مجھے بھی نیچا کر دکھایا ہے
بابا صاحب میں آپ کی کنیز ہوں آج تک آپ کے کسی حکم کی تعمیل سے انکار نہیں
کیا آپ کے ایک اشارے پہ اپنی گردن کٹوا سکتی ہوں لیکن اس معاملے میں بے بس
مجبور ہوں۔"

اس نے اپنی بے بسی ظاہر کی ـــــ !!

بابا صاحب کو علم تھا کہ ان کے کسی حکم کے سامنے منّی جان کو دم مارنے کی
مجال نہیں۔ آج تک اس کے منہ سے انھوں نے "ناں" کا لفظ نہیں سنا تھا اب
جو منی جان بھی بے بسی کا اظہار کر رہی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اُن کا مقابلہ

ہے افسر اعلیٰ سے نہیں ہے۔

منی جان ـــ کیا یہ واقعی تم بول رہی ہو ـــ تم بھی ....." بابا صاحب نے
سے پوچھا۔

"ہاں بابا صاحب ـــــ !" کاش میں آپ کو بتا سکتی کہ ایک حادثے کی وجہ سے
میری ایک لڑکی اس سے ٹکرائی تو مجھے کن کن مشکلات سے گزرنا پڑا۔ بابا صاحب
آپ جانتے ہیں منی جان نے کبھی خود کو مجبور نہیں جانا ـــــ کبھی نہیں، لیکن حیرت
تو مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ اس ملک میں ..... یہاں تو کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔
ائے ....."

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"ٹھیک ہے منّی جان اب ہمیں خود ہی معاملات کو دیکھنا ہوگا" ـــــ بابا صاحب
سنجیدگی سے کہا۔

"بابا صاحب! اگر میری بات مانیں تو جتنی جلد ممکن ہے اُسے خلاص ہی کر دیا
ـــ جتنی جلدی ممکن ہو ـــــ"

منی جان کی تشویش کا اندازہ بابا صاحب کے لیے کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

"ارے چھوڑو منّی جان لعنت بھیجو دیکھ لیں گے اسے بھی تم سناؤ آج کل کوئی
نیا مال ہے یا نہیں۔"

بابا صاحب انسانی نفسیات کی کمزوریوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا
کہ موضوع پہ مزید بات کر کے منّی جان کو اپنی کمزوری کا احساس دلائے۔

"آپ حکم دیجئے بابا صاحب" ـــــ منّی جان نے آنکھ دبائی۔

"حکم کیا ـــــ بس آج ہی کوئی اچھا سا مال بھیج دو ناں"

یہ کہہ کر بابا صاحب کمرے سے باہر آ گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ آج

اُسے اتنی ہی بات کرنی تھی۔ منّی جان نے کھڑی ہو کر اُسے فرشی سلام کیا اور
کمرے سے باہر آ گئی۔

بابا صاحب اب کچھ اور سوچ رہے تھے ۔۔۔!!

تھوڑی دیر بعد ان کے آستانے پر پرویز بھائی اُن کے سامنے کھڑا تھا۔

"اُسے مار ڈالو ۔۔۔ ابھی سے مار ڈالو ۔۔۔ سانپ کا پھن اُٹھانے سے
پہلے ہی سر کچل دیا جائے تو ہی بہتر رہتا ہے اور یہ تو پھن اُٹھا ہی چکا ہے۔"

اس نے دیوانہ وار قہقہے لگانے شروع کر دیے۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر بابا صاحب ۔۔۔ اس کے متعلق ہمارے پاس بھی کوئی
اچھی رپورٹس نہیں ہیں۔"

پرویز بھائی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"لیکن اس بات کا خیال رہے کہ میں اس سلسلے میں سرکار کی طرف سے کسی قسم کی
جھک جھک کا سامنا نہیں کرنا چاہتا ۔۔۔ مجھے تمہاری بات بات پر وضاحت
پیش کرنا اچھا نہیں لگتا ۔۔۔"

بابا صاحب نے کہا۔

"آپ مطمئن رہیے بابا صاحب اس سلسلے میں ہم اپنے دوستوں کی مدد لیں گے
آخر انہیں کس دن کے لیے رکھا ہے ۔۔۔" پرویز بھائی نے کہا۔

"پرویز بھائی ذرا خیال سے ۔۔۔ میں کسی پھڈے میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

دونوں شیطان منصوبہ بندی کرتے رہے جس کے بعد انہوں نے اپنے
چار اور شیطان جمع کیے جس کے بعد بابا صاحب کی طرف سے پریس کے لیے بیان
جاری کیا گیا۔ اس بیان میں کہا گیا تھا کہ اُن کی ایک ایمبولینس پر مسلح حملہ آوروں
نے روک کر حملہ کیا۔ تنظیم کے رضاکار بمشکل اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہو

گئے۔ حملہ آوروں نے انہیں دھمکی دی ہے کہ وہ تنظیم کے میڈیکل یونٹ کی ایمبولینس
نہیں چلنے دیں گے۔

بابا صاحب نے حکومت سے اپیل کی تھی کہ ایسے سماج دشمن عناصر جو اُن کی
سماجی بہبود کی سرگرمیوں میں رکاوٹ کا باعث بن رہے ہیں اُن سے حکومت آہنی
ہاتھوں سے نمٹے اور تنظیم کی ویلفیئر سرگرمیوں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔

اس بیان میں کہیں بھی نفیس میاں کا ذکر نہیں تھا ۔۔۔!!

یہ بابا صاحب کی سیاسی زندگی کا پہلا دن تھا جس میں انہوں نے سیکورٹی
ایجنسیوں یا مخالف لسانی تنظیم پر کوئی الزام نہیں لگایا تھا۔

نفیس میاں کے متعلق بیان اُسی روز شام کو اُن کے گھر والوں کی طرف سے
جاری ہوا۔ اس پریس کانفرنس کا انعقاد بڑی ہنگامی بنیادوں پر کیا گیا تھا۔

پرویز بھائی نے خود فون کر کے اخبار نویسوں کو طلب کیا تھا۔

پریس کانفرنس میں مسز نفیس نے بھرائی ہوئی آواز میں اخبار نویسوں کو بتایا
کہ ان کے شوہر گزشتہ تین روز سے غائب ہیں اور آج اُن کی طرف سے پیغام ملا
ہے کہ انہیں اغوا کر لیا گیا ہے۔

"کیا اغوا کرنے والوں نے اپنی کوئی ۔۔۔ شناخت یا ڈیمانڈ بتائی ہے؟"
ایک اخبار نویس نے سوال کیا۔

"بدقسمتی تو یہی ہے کہ نفیس میاں کو ڈاکوؤں یا مخالفین نے نہیں بلکہ سیکورٹی
ایجنسی کے لوگوں نے اغوا کیا ہے" ۔۔۔ اس سوال کا جواب مسز نفیس کے بجائے
پرویز بھائی نے دیا تھا۔

مسز نفیس ڈبڈبائی آنکھوں سے ٹکر ٹکر کبھی اخبار نویسوں اور کبھی تنظیم کے
رہنماؤں کی طرف دیکھتی رہیں جو موت کے فرشتوں کی طرح ان کے سر پر مسلط تھے۔

انہیں آج صبح ہی بابا صاحب کی طرف سے حکم ملا تھا کہ ان کے لیے جس پریس کانفرنس
کا اہتمام کیا جا رہا ہے اس کا مقصد دراصل کیا ہے؟ اس کے ساتھ ہی
اور رخسانہ نے جو بطورِ خاص اُن سے ملنے آئے تھے ایک لکھا ہوا بیان اُنہیں تھماتے
ہوئے ہدایت کی کہ انہیں یہ بیان پریس کانفرنس میں پڑھنا ہے اور اخبار نویسوں کی
طرف سے اوّل تو کسی کی جرأت نہیں کہ اُن سے سوال ہی کرے۔ ایک آدھ سوال
جو ہو گا اس کا جواب انہیں دینا ہے وہ بھی اُنہیں سمجھا دیا گیا تھا۔

"مسز نفیس آپ خود سمجھدار خاتون ہیں۔ میں ایک عورت ہونے کے ناطے
کو یہی مشورہ دوں گی کہ فی الوقت آپ وہی کریں جس کی ہدایت تنظیم کی طرف سے
آپ کو ملے۔ اسی میں آپ کی بقا ہے۔ میں آپ کو بابا صاحب کی طرف سے یقین
دلاتی ہوں کہ اگر آپ نے بابا صاحب کے احکامات پر عمل کیا تو نفیس میاں جلد
بخیر و عافیت گھر واپس لوٹ آئیں گے۔ بصورتِ دیگر ہم اُن کی سلامتی کی ذمہ داری
نہیں لے سکتے۔"

مسز نفیس سیدھی سادی عورت ——— !

اُسے تو اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ اس کے ہونہار میاں نے کیا کیا گُل
کھلا رکھے ہیں۔ اپنے خاوند کی بُری عادتوں کا تجربہ اُسے شادی کے چند سال بعد
ہی ہو گیا تھا۔

وہ کوئی زیادہ پڑھی لکھی عورت نہیں تھی۔

لیکن ———

اپنے خاوند کے کرتوت اُس سے پوشیدہ نہیں تھے۔ اُسے بخوبی اندازہ
کہ جس لسانی تنظیم سے اس کے خاوند کا تعلق ہے۔ ماضی میں تو شاید وہ کوئی سیاسی
تنظیم رہی ہو لیکن اب وہ ایک مافیا کی شکل اختیار کر چکی ہے اور مافیا کے اپنے اصول

رہتے ہیں——— یہاں لوگ آتے تو اپنی مرضی سے ہیں لیکن جانا ان کی مرضی پر منحصر
نہیں ہوتا۔

اُسے ابھی تک اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کے خاوند کو کسی نے اغوا کیا
ہے لیکن یہ اندازہ ضرور تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ اب اُسے آنکھیں بند کر کے
اس وقت تک بابا صاحب کے احکامات پر عمل کرنا تھا جب تک کہ اُسے اپنے
خاوند کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی مزید ہدایت نہ مل جاتی کیونکہ فی الوقت یہی
لوگ اس کے لیے کچھ کر سکتے تھے۔

پریس کانفرنس میں کوئی ایسا سوال پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا جو لسانی
تنظیم کے بڑوں کی طبعِ نازک پر گراں گزرتا ہو۔

پریس کانفرنس ختم ہو گئی اور نفیس میاں کے گھر والوں کی حفاظت کے لیے
لسانی تنظیم کے رضاکاروں نے یہاں ڈیرے جما لیے۔

قدرت کے کھیل

سجوار شاہ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن آج اس کے دوستوں نے واقعی اُسے خوش کر دیا تھا۔ "را" کی طرف سے اُسے ایسے تحائف اکثر ملتے رہتے تھے۔

لیکن ——

اس سے پہلے وہ زندگی میں کبھی کسی عورت سے اتنا زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا جتنا اس سندری نے اُسے کیا تھا۔ سندری کا تعلق کس ملک سے تھا؟ کس شہر سے تھا؟ سجوار شاہ کو اس سے کوئی بحث نہیں تھی نہ ہی اُس نے کبھی کچھ پوچھنے یا جاننے کی کوشش کی۔ وہ زندگی کی ہر ساعت کو رنگین بنانا اور اس سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا خواہ اس کی کچھ ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔

جب کبھی ایسا خاص مہمان اس کے لیے لایا جاتا سجوار شاہ بطورِ خاص اپنی خصوصی حویلی میں جشنِ عیش و عشرت منعقد کیا کرتا تھا۔ یہ حویلی گوٹھ کے ایک کونے پہ قلعے کی صورت قائم تھی۔ جس کی دیواروں اور فصیلوں پہ ہر وقت مسلح پہریدار موجود رہتے تھے۔

سجوار شاہ کے خصوصی مہمانوں کے لیے ہی اس حویلی کے دروازے کھلتے تھے اور جب سجوار شاہ یہاں ہوتا تھا تو کسی کو حویلی کے نزدیک پھٹکنے کی بھی اجازت

نہ دی جاتی تھی۔

لیکن ——

اس روز عجیب حادثہ ہوا۔

منشی حویلی کے باہر والے حصے میں بیٹھا تھا جب پہریداروں نے اچانک ہی سہاول کی آمد کی اطلاع دی۔

"یہ کہاں آگیا ——؟" منشی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"سائیں! اس کے چار بندے بھی ساتھ ہیں اور وہ رکنے والا نہیں لگتا" پہریدار نے کہا۔

منشی کے لیے بڑی مصیبت آن پڑی تھی۔ ان حالات میں اس کے لیے سجوار شاہ سے سہاول ڈاکو کی ملاقات کروانا ناممکن تھا۔

لیکن ——

یہ بلا ٹلنے والی نہیں تھی۔

آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس طرح اچانک سہاول اُن سے ملنے آگیا ہو۔ ضرور کوئی خاص بات ہی ہو گی۔ اس نے سوچا لیکن وہ وڈیرے سجوار شاہ کو کس طرح اطلاع پہنچائے۔ اُس کی مصروفیات میں مخل ہونے کا مطلب بھی موت کو آواز دینا تھا۔ جبکہ سہاول کو انکار بھی ممکن نہیں تھا۔

منشی کے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ بن کر رہ گیا تھا۔

ابھی وہ اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے جب اچانک باہر والا دروازہ کھلا اور سہاول اپنے چار مسلح ساتھیوں سمیت اندر گھس آیا۔

"سلام سائیں سہاول —— کیسے ہو؟ بابا خیر تو ہے کیسے آئے ہو اچانک نہ کوئی خبر نہ کوئی اطلاع" —— منشی نے چرب زبانی سے خود کو سنبھالنا چاہا۔

"منشی صاحب بابا! وڈیرے سجاوار شاہ کو فوراً اطلاع دو میرا اس کا ملنا بہت ضروری ہے۔"

آج مہاول بدلے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"بابا مہاول! بیٹھو سائیں! آرام کرو۔ بندوں کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں صبح ملاقات بھی ہو جائے گی ـــــ" منشی نے چاہا کم از کم رات تو ٹال دے۔

"مجھے صبح واپس ڈیرے پر پہنچنا ہے ـــــ وہاں تمہارے باپ اکبر کی فوج آگئی ہے۔ وڈیرے شاہ صاحب کو بلاؤ ورنہ ہم خود ملتے ہیں۔"

مہاول کی آواز کے ساتھ ساتھ چہرے کے تاثرات بھی بدلنے لگے تھے۔

"بابا مہاول تم ہوش میں تو ہو ـــ کس سے بات کر رہے ہو کچھ پتہ ہے کیا ـــ؟"

منشی کے لیے اس کا یہ لہجہ ناقابل برداشت تھا۔

"میں تو ہوش میں ہوں ـــ البتہ تم نے اگر چند منٹ میں ملاقات نہ کرائی تو شاید تمہارے ہوش و حواس گم ہو جائیں۔"

مہاول نے یہ کہتے ہوئے اپنے کندھے سے لٹکتی کلاشنکوف کو ہاتھ میں تھام لیا تھا۔

منشی نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

ایک زمانہ دیکھا بھالا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے سامنے وہ ڈاکو کھڑا ہے جس نے محض ایک وڈیرے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے درجنوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ اس کے لیے انسانی جان کی قیمت کیا ہے؟ لیوں بھی آخر وہ حرام موت کیوں مرے؟ اگر اس کا کوئی لین دین تھا

بھی سجاوار شاہ کے ساتھ ہوگا۔ اس کے ساتھ تو نہیں ہے پھر وہ کیوں یہ بلا اپنے سر ڈال لے۔

"اچھا بابا ـــ ٹھیک ہے۔ میں بات کرتا ہوں وڈیرے سے۔ تم جانتے ہو اس وقت تو ویلا میں سائیں کسی سے نہیں ملتا ـــ بابا کوئی مصیبت آسکتی ہے۔"

منشی نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

"منشی کیوں اپنی جان سے ہاتھ دھونا چاہتا ہے ـــ پاگل ہو گیا ہے۔"

مہاول نے اب بندوق باقاعدہ اس کی طرف سیدھی کر لی تھی۔

"چلتا ہوں سائیں ـــ چلتا ہوں ـــ"

منشی بادل نخواستہ اُس کمرے کی طرف تو آگیا تھا جہاں سجاوار شاہ مصروف تھا لیکن اب دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت اُسے نہیں ہو رہی تھی۔

دل کڑا کر کے اُس نے بالآخر دروازہ کھٹکھٹا ہی دیا۔

کمرے میں موجود سجاوار شاہ نے دروازے پر آہٹ سن کر یوں محسوس کیا جیسے کسی نے اُن کے دماغ پر ہتھوڑا چلا دیا ہو۔

اُسے اپنے کانوں پر اس وقت تک یقین نہ آیا جب تک کہ تین چار مرتبہ منشی نے دروازہ نہیں کھٹکھٹا لیا۔

سجاوار شاہ غصے میں پاگل ہو کر پلنگ سے اُٹھا اور اسی حالت میں دروازہ کھول دیا۔ لڑکی سہم کر ایک کونے میں دبک گئی تھی۔

اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی منشی اس کے قدموں میں گر گیا۔

"سائیں! خدا کے لیے مجھے کچھ نہ کہنا۔ مہاول نے بندوق کی نوک پر مجھے یہاں بھیجا ہے۔ وہ باہر انتظار گاہ میں بیٹھا ہے اپنے بندوں کے ساتھ اس نے مجھے کہا ہے کہ اگر میں نے آپ کو اطلاع نہ دی تو مجھے گولی مار دے گا۔ سائیں!

اس کے تیور خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ آج تک میں نے اُسے اس حالت
میں نہیں دیکھا.....“

”بند کرو بک بک ——“ سجوار شاہ نے منشی کو اتنی زور سے ڈانٹا کہ منشی تو
ہی نہیں برآمدے کی چھت بھی کانپ اُٹھی۔

”کہاں ہے وہ کتّے کا پلا ——“ سجوار شاہ نے پوچھا۔

”سائیں! باہر کھڑا ہے۔ میں بھلا اُسے یہاں آنے کی اجازت دے سکتا ہوں“
منشی نے اپنے نمبر بنانے چاہے۔

”چلو ——“

منشی اور سجوار شاہ جب باہر والی بیٹھک میں پہنچے تو وڈیرے سجوار شاہ کا
غصہ ہرن ہو گیا یہاں مہاول اپنے چار ساتھیوں سمیت موجود تھا۔

”سلام سائیں ——“ مہاول نے اُسے سلام تو کیا تھا لیکن اس کے لہجے
لغاوت کی بو آرہی تھی۔

”کیا بات ہے بابا مہاول اتنی رات گئے کیا مصیبت آگئی تھی جو اس طرح بلا
اطلاع کے تم منہ اُٹھا کر چلے آئے ہو ——“ سجوار شاہ نے بہر حال اپنی اکڑ برقرار
رکھی۔

”سائیں بات ہی ایسی تھی —— یہ مجھ اکیلے کا مسئلہ نہیں اور جہاں تک
دے کر آنے کی بات ہے تو اب حالات بہت خراب ہو گئے ہیں چاروں طرف
پکی ملٹری بیٹھی ہے کوئی راستہ محفوظ نہیں رہا۔“

”اچھا! اچھا! بات کرو —— کیا بات ہے ——“ سجوار شاہ نے بے چارگی
سے ہاتھ اُٹھا کر اُسے روک دیا۔

”سائیں! یہ جو میرے ساتھی ہیں انہیں تو تم جانتے ہو ناں —— وڈیرہ سیفل نے

یہ جو بندے اغوا کر لائے تھے اب اُن کو لینے کے لیے اپنا قاصد بھیج دیا ہے۔
یہ لوگ دوسری گوٹھ کے ہیں۔ ان کے تین ساتھی اب تک مارے جا چکے ہیں۔
پچھلی بار انہوں نے وڈیرہ سیفل کے کہنے پر بندے اغوا کیے اور پھر انہیں
رکھا۔ آپ تو جانتے ہیں سائیں کہ ہم نے بندوں کی وجہ سے اب تک کتنے
بدلے ہیں لیکن اب وڈیرہ سیفل بغیر کچھ لیے دیے اپنے بندے واپس مانگ رہا
سائیں! یہ تو ظلم کی بات ہے اب اس نے دھمکی بھی دے دی ہے —— سائیں
خیال نہ ہوتا تو ہم اس کا جواب دینے کے بعد آپ سے رابطہ کرتے لیکن میرے
یہ لوگ ابھی تک رکے ہوئے ہیں۔“

جیسے جیسے مہاول بات کر رہا تھا وڈیرہ سجوار شاہ کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔
شیطانی ذہن اچانک ہی انگڑائی لے کر بیدار ہوا تھا۔ اُسے بھی وڈیرہ سیفل
غصہ تھا۔ حرام خود سارا مال اکیلا ہڑپ کر جاتا تھا اور بڑے شکار کی بھی
اس کے سامنے پھینک دیا کرتا تھا۔

سجوار شاہ سے زیادہ کسی وڈیرے کے ڈاکوؤں سے روابط نہیں تھے اور
کے بڑے بڑے ڈاکو اس کی مٹھی میں تھے۔ اسی کی وجہ سے وڈیرہ سیفل
کو لوٹ رہا تھا۔ ٹھیک ہے وہ علیحدگی کی تحریک کا سرغنہ تھا لیکن
اس کے ساتھ کتنے لوگ تھے؟ انگلیوں پر ان کی تعداد گنی جا سکتی
سارا سیاسی گورکھ دھندہ وڈیرہ سجوار شاہ کے کندھوں پر چل رہا
سجوار شاہ تھا جو اُن کے جلسوں کی رونق بڑھانے کے لیے اپنے مریدوں
کرتا تھا۔

——

شاہ ہی تھا جو ان کے دشمنوں کو خوفزدہ کرنے، ہنگامہ آرائی،

لوٹ مار قتل وغارت کے لیے اپنے تخریب کار دیا کرتا تھا۔

جب سب کچھ وہ کرتا ہے تو اُسے حصہ برابر کیوں نہیں ملتا؟

ٹھیک ہے ایک تیر سے دو شکار کرتا ہوں۔ اس نے سوچا۔ اُسے بیک
وڈیرہ سیفل اور مہاول دونوں سے نجات حاصل کرنا تھی۔ مہاول کی کوئی بڑی
رہی ہو لیکن اس کی یہ حرکت سجوار شاہ کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اُس نے
منشی کے سامنے جو زبان بولی تھی ایسی زبان سننے کی عادت سجوار شاہ خود کو
ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کی نقل کل کوئی اور بھی کر سکتا تھا۔

سجوار شاہ خود کو اس علاقے کا بلا شرکت غیرے مالک اور یہاں کے
کو اپنا غلام سمجھتا تھا۔ اس کے بزرگ بھی ان لوگوں سے غلاموں کا سا برتاؤ کر
چلے آ رہے تھے اب صدیوں کی یہ روایت وہ کیوں توڑے۔!

وہ فوراً ہی ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

○

"مہاول تم میرے ساتھ آؤ۔ ابھی اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیے۔
بندوں کو یہاں بٹھاؤ ——— منشی ان کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرو
بیچارے بہت تھک گئے ہیں۔"

اُس نے مہاول کو اشارہ کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

مہاول نے اپنے ساتھیوں کو آنکھ کے اشارے سے مستعد رہنے کی
کی اور سجوار شاہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"بیٹھو ——— !" سجوار شاہ نے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

مہاول بیٹھ گیا ——— !

یہ اس کی پہلی باقاعدہ بغاوت تھی۔

آج تک اس علاقے کے کسی مکین کو جرأت نہیں تھی کہ وڈیرے سجوار شاہ کے برابر
بیٹھے۔ وڈیرا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اُس نے اپنے پاس دھرے موبائل فون پر کوئی نمبر ملایا تھا ——— دوسری طرف
فون اٹھائے جانے پر اُس نے کہا۔

"وڈیرہ سیفل سائیں کو جگاؤ ——— میں سجوار شاہ بول رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وڈیرہ سیفل لائن پر تھا۔

سجوار شاہ نے اس سے کچھ باتیں کیں جن میں زیادہ حوالہ مہاول کا تھا اس
نے فون پر یہ نہیں بتایا کہ مہاول اس کے پاس بیٹھا ہے۔ دوسری طرف سے جو
بتایا گیا وہ سنتے ہوئے وڈیرہ سجوار شاہ کبھی کبھی مسکرانے لگتا تھا جس بات کا
مہاول کو نہ ہو سکا وہ فون پہ انگریزی میں ہونے والی گفتگو تھی۔ تھوڑی دیر
بعد اُس نے فون بند کر دیا۔

"مہاول بابا میری بات غور سے سن لو۔"

"حکم سائیں" ——— مہاول کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"بابا! یہ وڈیرہ سیفل کچھ زیادہ ہی اونچا اُڑنے لگا ہے۔ اس نے دو بار ٹیوبل
نمبر لے کر کھا لیا ہے اور اب ہم کو دھوکہ دے رہا ہے" ——— اس نے
آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"یہ تو غلط بات ہے سائیں" ———

"میں بھی تو یہی کہتا ہوں بابا" ——— سجوار شاہ بولا۔

"سائیں بابا! یہ معاملہ مجھ اکیلے کے بس کا نہیں ——— اس میں اور لوگ بھی..."

"بابا مہاول! تم چھوڑو ان باتوں کو اور میری بات غور سے سنو ——— ابھی یہ خیال
اپنے پاس رکھو ——— اور ہاں وڈیرہ سیفل کو اس غداری کا سبق ضرور سکھانا

ہے ۔بہاول وڈیرہ سیفل کو قتل کر دو۔"

اُس کی بات کے آخر میں بہاول کا چونک اُٹھنا بالکل فطری تھا۔

"مَیں سمجھا نہیں سائیں۔"

"تم نے کیا کوئی اور زبان بولنا شروع کر دی ہے ۔اس میں نہ سمجھنے وال
کوئی نہیں ۔چاروں یرغمالیوں کو ہمارے بندوں کی حفاظت میں دے دو۔ تم
وڈیرہ سیفل کے ٹھکانے تک ہم پہنچا دیں گے ۔تمہیں وہاں سے گوٹھ تک واپ
پہنچا جائیں گے۔

اور ہاں ــــ ایک لاکھ روپیہ تم ایڈوانس رکھ لو۔ یرغمالیوں کی رقم
سے آدھا آدھا کر لیں گے۔"

"ٹھیک ہے سائیں جیسا مرشد کا حکم ــ"

بہاول نے کچھ دیر بعد گردن ہلاتے ہوئے رضامندی ظاہر کر دی۔ و
یہاں آمد پہ جس طرح طیش زدہ دکھائی دے رہا تھا اب اتنا ہی تابعدار بنا ہوا

○

"غفنی ـــــ تم ادھر آؤ ـــــ"

بہاول اور اس کے ساتھیوں کی روانگی کے بعد سجوار شاہ نے غفنی کو
طلب کیا۔

"جی سائیں ـــ"

"بابا! کل صبح کے بعد میری فورس کمانڈر سے میٹنگ کا بندوبست کرو
اور کل رات کو کیا نام ہے اس کا وہ لڑکی ــــــ بہاول کی بیٹی ــــ
پہ پہنچا دینا اُس کی شادی کا قصہ بھی نمٹ ہی جائے تو اچھا ہے ۔بہاول
کو بہت فکر لگی رہتی ہے اس کی ـــ اسکی زندگی میں لڑکی کے ہاتھ پیلے ہو جائیں

بات ہے ـــ ہے ناں۔"

وڈیرہ سجوار شاہ کے ہونٹوں پہ وحشیانہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی اس کی
ان خون پینے والے درندوں کی سی ہو رہی تھیں جنہیں عرصے بعد تازہ خون میسر
ہو ـــ

اُس نے بہاول کو اس گستاخی کی سخت سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رات کا باقی حصہ وڈیرا سجوار شاہ نے سندری کے ساتھ معمول کے مطابق
آنے والے لمحات کے تصور سے لطف اندوز ہو رہا تھا ۔وڈیرہ سیفل
کی ساری کمان عملاً اُسے منتقل ہو جاتی اور اس علاقے میں کوئی ایسا ڈاکو نہیں
جو اس کے ساتھ کسی یرغمالی کی سودے بازی سے گریز کی جرأت کرتا۔

وڈیرہ سیفل ایک ہی وقت میں بھارتی انٹیلی جنس "را" اور مقامی یرغمالیوں کے
ورثا کو دونوں ہاتھوں سے نہیں لوٹ رہا تھا بلکہ ڈاکوؤں سے بھی باقاعدہ
وصول کر رہا تھا۔ اس کی موت کے بعد یہ سب کچھ سجوار شاہ کے اختیار میں ہوتا۔

صبح وہ دن چڑھے تک بدمستی کی نیند سوتا رہا۔

دن چڑھے جب وہ ناشتے کی میز پہ بیٹھا تھا تو غفنی کی طرف سے اُسے مقامی
کمانڈر کے ساتھ دوپہر کے بعد میٹنگ کی اطلاع مل گئی۔ سجوار شاہ کی پُرزور
درخواست پہ مقامی فورس کمانڈر نے اس کے ساتھ دوپہر کے کھانے میں شمولیت
پہ رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

اس علاقے میں امن و امان کی بحالی اور ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے اُسے
وڈیرہ سجوار شاہ کا تعاون درکار تھا۔

دوپہر کو جب فورس کمانڈر سجوار شاہ کے ڈیرے پہ پہنچا تو یہاں کے ماحول
سے خاصا متاثر کیا۔

جس بڑے ہال کمرے میں کھانے کی میز سجائی گئی تھی ۔ وہاں انواع و اقسام کے کھانوں کے علاوہ دیواروں پہ جا بجا قرآنی آیات بھی سجائی ہوئی تھیں۔ جن سے بظاہر سجوار شاہ کے مذہبی رجحان کی نشاندہی ہو رہی تھی ۔ منافقت میں اس کو کمال حاصل تھا وہ مقامی سیاست کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا اور وقتاً فوقتاً ہونے والی تبدیلیوں سے باخبر رہتا تھا ۔

”جناب والا! ہم تو سائیں اپنی جان مُلکی سلامتی کے لیے دینے کو تیار ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے ہر کام کا کریڈٹ وڈیرہ ہاشم لے جاتا ہے اور ہم سرکاری کاغذات میں دشمن ہی سمجھے جاتے ہیں ۔۔۔ سائیں ابھی ہم نے آپ کو دینے کے لیے دو تین بڑے سرپرائز رکھے ہیں ۔ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی ۔۔۔ سائیں! سیاول ڈاکو تک میرے بندوں نے رسائی حاصل کر لی ہے ۔ ابھی ہم اس کو کسی چکر سے باہر نکالنے کی کوشش کریں گے ۔۔۔ شیر کو شکار کچھار سے باہر نکال کر ہی کیا جاتا ہے ناں ۔۔۔ سائیں! بڑا خطرناک ڈاکو ہے ۔ دہشت پھیلا رکھی ہے اس نے سارے علاقے میں ۔ مجھے آپ کا تعاون درکار رہے گا ۔۔۔“

اس نے بالآخر فورس کمانڈر کو اعتماد میں لاتے ہوئے کہا ۔

”سجوار شاہ صاحب! اگر آپ ملک و قوم کے لیے امن و امان کی بحالی کے لیے اور ڈاکوؤں کے خاتمے کے لیے ہمارے ساتھ تعاون کریں گے تو ہمیں اپنا دوست ہی پائیں گے ۔ ہم یہاں قتل و غارت کے لیے نہیں بلکہ دہشت کی پیدا کردہ فضا کے خاتمے اور مقامی آبادی کو تحفظ دینے کے لیے آئے ہیں ۔ ہماری طرف سے ڈاکو کے لیے یہ آفر موجود ہے کہ اگر وہ غیر مشروط ہتھیار ڈال دے تو ہم اسے مارینگے نہیں بلکہ قانون کے حوالے کر دیں گے ۔ سجوار شاہ صاحب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ پانی اب سر سے اونچا ہو رہا ہے اور ہمیں آہنی ہاتھوں سے ڈاکوؤں سے نمٹنے کا حکم ملا ہے لیکن میں تمہیں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ کسی بے گناہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی اور ہم ہرگز نہیں چاہتے کہ ہمارے اور ڈاکوؤں کے مقابلے میں بے گناہ شہری مارے جائیں ۔ اگر تم ان ڈاکوؤں کو گرفتار کروا دیتے ہو تو میں ذاتی طور پر تمہاری سفارش حکومت سے کروں گا ۔“

فورس کمانڈر بڑا دھیمے مزاج کا نوجوان آفیسر تھا ۔ اُس نے سجوار شاہ کی پیشکش پر کسی جذباتی پن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا وہ قانون کی بالادستی قائم رکھنا چاہتا تھا ۔ انٹیلی جنس رپورٹوں کے مطابق سجوار شاہ بھی کوئی عام وڈیرہ نہیں تھا اور یہ بات فورس کمانڈر کو بھی سمجھ آ رہی تھی کہ سجوار شاہ ضرور اس چکر میں اپنا بھی کوئی مطلب نکالے گا ۔

”سائیں! ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ حکومت کو ہمارے متعلق جو غلط فہمیاں لگی ہیں وہ ختم ہو جائیں ۔ بابا! ہم اس علاقے کے مکیں ہیں اور اپنے علاقے کی فلاح و بہبود چاہتے ہیں ۔ اس کے لیے ہم اپنی حکومت سے تعاون کر رہے ہیں ۔“

”ٹھیک ہے ۔۔۔ سجوار شاہ ہم تمہارے ساتھ اس مسئلے پہ تعاون کریں گے ۔“ فورس کمانڈر باتوں سے زیادہ عمل میں یقین رکھتا تھا ۔

”سائیں! سیاول خطرناک آدمی ہے ۔ اس نے ہمارے ساتھ جرائم میں شرکت کے لیے رابطہ کیا ہے اور بڑی اچھی پیشکش بھی کی ہے ۔ اس ضمن میں ہم اس کو دھوکے سے بلائیں گے اور اپنا کام کریں گے ۔۔۔ جہاں اس نے فوج کا تعاون لیا ہے وہ خونخوار درندے کی طرح تباہی کا

دلبرتا بن جائے گا اور ہم بے گناہ لوگوں کو مروانا نہیں چاہتے ۔ مجھے اپنے بندوں پر
اعتماد ہے کہ وہ خود بہادل کو قابو کر لیں گے ۔ اگر زندہ نہ پکڑ سکے تو مار ہی
ڈالیں گے ۔ یوں بھی اس کے سر کی قیمت شاید ۵ لاکھ روپے سرکاری طور پر
ہم آپ سے رابطہ رکھیں گے اور ضرورت پڑنے پہ آپ کا تعاون حاصل کریں گے

"ٹھیک ہے "

فورس کمانڈر کو آم کھانے سے مطلب تھا گٹھلیاں گننے سے نہیں۔ بہادل
کا شمار اُن ڈاکوؤں میں ہوتا تھا جن کو مارنے کے خصوصی احکامات انہیں ملے
تھے۔ تھوڑی دیر بعد فورس کمانڈر رخصت ہو گئے۔

○

"غشی بابا! آج نکڑی کو پہنچا دینا ـــ"

وڈیرہ سائیں سجوار شاہ نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"بھلو سائیں ..... بھلو ....."

غشی اپنے سائیں کا حکم سمجھ گیا تھا۔ اس کا سائیں بہادل کو ذلت کی موت
مارنے پہ تل گیا تھا۔

اس رات جب ایک طرف وڈیرے سجوار شاہ کا ہرکارہ بہادل کو سیفل کے
قتل کا سگنل دینے جا رہا تھا وہاں، دوسری طرف غشی اپنے آدمیوں کے ساتھ
بہادل کی نوجوان بیٹی نکڑی کو اٹھا کر سجوار شاہ کے ڈیرے کی طرف لے جا
رہا تھا۔!

اسے یہی بتایا گیا تھا کہ اُسے اپنے باپ سے ملاقات کے لیے لے جایا
جا رہا ہے۔ اکثر وہ اسی طرح کبھی اپنی ماں کے ساتھ اور کبھی اکیلی اپنے
باپ سے ملنے جایا کرتی تھی۔ آج بھی وہ بے چاری یہی سمجھ رہی تھی کہ اُسے

باپ سے ملانے لے جایا جا رہا ہے۔ غشی اُسے حویلی میں پہنچا کر اب فون پہ
سجوار شاہ کو اطلاع دے رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ پہلے اس کے باپ سے نمٹ لوں پھر اس کے ساتھ جشن
مناؤں گا ـــ"

سجوار شاہ نے قہقہہ لگا کر فون بند کر دیا۔

بہادل کے ساتھ سجوار شاہ کے دو آدمی تھے اور جیپ نزدیکی گوٹھ کی
طرف جا رہی تھی جہاں سجوار شاہ نے وڈیرہ سیفل کو شراب و شباب کی ایک
خوبصورت محفل میں مدعو کیا تھا۔

ایسی شامیں یہ لوگ اکثر ایک دوسرے کے لیے منعقد کرتے رہتے تھے۔
وڈیرہ سیفل اسے معمول کی کارروائی سمجھ کر اپنے ایک باڈی گارڈ کے ساتھ
اس طرف آ رہا تھا جیسے ہی اس کی جیپ نے گوٹھ کی طرف جانے والی ذیلی
سڑک کا موڑ کاٹا ـــ جیپ کو زور سے دھچکا لگا۔ اچانک ہی ڈرائیور کے
سامنے ایک درخت کی بڑی سی شاخ آ گری تھی یہ درخت اس کچی سڑک کے
کنارے موجود تھا جس پہ بیٹھا ایک شخص بڑی دیر سے اس جیپ کے آگے
وہ شاخ گرانے کا منتظر بیٹھا تھا۔

جیسے ہی ڈرائیور نے سنبھل کر درخت کی طرف دیکھا اوپر بیٹھے شخص نے ان پہ
گولیوں کی برسات شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی بہادل اور اس کے دونوں ساتھیوں
نے اپنی بندوق سے شعلے اُگلنے شروع کیے اور چند منٹ ہی میں وڈیرہ سیفل
اپنے دونوں ساتھیوں سمیت خون میں نہا گیا۔

حملہ آور جس جیپ میں آئے تھے اب اس میں سوار ہو کر واپس جا رہے
تھے پندرہ بیس منٹ کے سفر کے بعد انہوں نے سڑک کے کنارے ایک ڈیرے

کے نزدیک جیپ رو کی اور بہاول سے یہاں اُترنے کو کہا۔

"یہ کون سی جگہ ہے ـــــ" بہاول نے حیرانگی سے پوچھا۔

"بس نیچے اترو ـــــ ابھی علم ہو جائے گا" ـــــ ڈرائیور نے اچانک اس کی طرف پستول تان لیا۔

بہاول نے چاہا کہ اپنی بندوق سنبھالے۔

لیکن ـــــ

اُس کی بندوق پہ سجوار شاہ کا دوسرا آدمی قابض تھا۔ بہاول چکرا کر رہ گیا۔

"دھوکہ" اُس کے کانوں اور دماغ میں ایک ہی لفظ بار بار گونج پیدا کرنے لگا تھا۔

"نیچے اُترو ـــــ" دونوں نے اُس کی طرف بندوقیں تان کر کہا۔

بہاول کے لیے فی الوقت اُن کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

وہ چُپ چاپ نیچے اتر آیا۔ وہ دونوں اُسے بندوق کی نوک پہ ڈیرے کے اندر لے گئے جہاں وڈیرہ سجوار شاہ اُس کا منتظر تھا۔

"سناؤ بہاول بابا کام ہو گیا ـــــ" اُس نے بندوق بر داروں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا بہاول ـــــ فوج علاقے میں آ گئی ہے۔ میں نے سوچا تم نے اگر مرنا ہی ہے تو کسی اور کے ہاتھوں کیوں مرو؟ ہمارے ہاتھوں لگائے ہوئے پودے کا پھل کوئی دوسرا کیوں کھائے۔ یہ تو ناانصافی ہوئی نا۔"

سجوار شاہ نے دیوانہ وار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"سجوار شاہ! تو کتّے کی موت مرے گا۔ میری بات یاد رکھنا اور یہاں تم حسرت ہی دل میں لے کر مر جاؤ گے کہ بہاول تم سے رحم کی بھیک مانگے گا۔

سجوار شاہ میں نے جس روز ہتھیار اُٹھائے تھے اُس روز سے ہی موت کو گلے لگائے پھر رہا ہوں۔ افسوس میں نے تجھ جیسے ذلیل انسان کو پہچاننے میں غلطی کی۔ تو نے ایک اور غلطی بھی کی ہے بہاول جو ناقابلِ معافی تھی۔ تو نے میرے ساتھ غداری کی....."

ابھی اُس کی بات نامکمل ہی تھی کہ بہاول نے چاہا کہ اچانک اس پہ چھلانگ لگا دے۔

لیکن ـــــ

اُس کے دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ سجوار شاہ کے ساتھی اس سے زیادہ ہوشیار تھے۔ چند سیکنڈ کے اندر درجنوں گولیاں اس کے جسم سے پار ہو گئیں۔

"تم لوگ جاؤ۔ یہاں صرف ڈرائیور اور منشی کو چھوڑ دو ـــــ" سجوار شاہ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

اُن لوگوں کی روانگی کے فوراً بعد ہی اُس نے فورس کمانڈر سے ٹیلی فون رابطہ کر کے انہیں یہاں آنے کے لیے کہا تھا۔

"سائیں ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا ملزم زندہ آپ کو نہ دے سکے حالانکہ جو کام اللہ نے کرنا تھا وہ ہم نے کر دیا۔"

اُس نے فون پہ ہی کہا۔

فورس کمانڈر کے وہاں پہنچنے تک مقامی پولیس کے نمائندے اور فوٹوگرافر وہاں آ گئے تھے۔ سجوار شاہ نے بڑی کامیابی سے سارا ڈرامہ سٹیج کیا تھا۔

فورس کمانڈر کو اس بات کی سمجھ تو آ گئی تھی کہ سجوار شاہ نے سب کچھ منصوبہ بند پروگرام کے تحت کیا ہے۔ پھر بھی اس کے لیے یہ بات کم از کم قابلِ اطمینان ضرور تھی کہ ایک شیطان کے ہاتھوں ہی سہی دوسرے شیطان کا

خاتمہ تو ہوا۔

اس رات سجوار شاہ نے بہاول کی بیٹی کو بے آبرو کر کے اپنی فتح کا جشن منایا
اس نے اپنی درندگی کی تسکین ہر پہلو سے کر لی تھی اور اب مطمئن ہو کر شراب کے
نشے میں دُھت بے خبری کی نیند سو رہا تھا ——!!

بہاول کی بیٹی دوسرے بستر پر اپنی بے بسی کے آنسو بہا رہی تھی جب اچانک
ہی اُس پر وحشت کا دورہ پڑا۔

کمرے کی دیوار پر سجی کلہاڑی اس نے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامی
اور شیطان کی صورت پر نظر دوڑائی۔

یہ وہ درندہ تھا جس کے لیے اس کے باپ نے اس علاقے کے لوگوں کی
زندگی جہنم بنا دی تھی۔ اُس کے ایک اشارے پر نکڑی کا باپ خون کے دریا بہا
دیا کرتا تھا۔ اس احسان فراموش وحشی نے آج اپنے محسن کی بیٹی کو بے آبرو کر
دیا تھا۔

اُس کے باپ کو مار ڈالا تھا اور بڑے تکبر سے اُسے یہ خبر بھی دے دی تھی
"سجوار شاہ! بہاول کی بیٹی اتنی مجبور نہیں ہوئی۔ زندہ تو میں نے اب
رہنا نہیں لیکن تو بھی زندہ نہیں بچے گا ——" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

اُس کے دل میں موجود ساری نفرت اس کے ہاتھوں میں قوت بن کر سمٹ
آئی تھی۔

اچانک ہی اُس نے کلہاڑا ہوا میں بلند کیا اور پوری قوت سے اس کا
پھل سجوار شاہ کی گردن میں اُتار دیا۔

خون فوارے کی طرح اس کی گردن سے یوں اُبلا جیسے ذبح ہونے والے
بکرے کی گردن پر چھری چلانے سے بہتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی نکڑی پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے چیختے چلاتے ہوئے
سجوار شاہ کے جسم پر کلہاڑی کے وار کرنے شروع کر دیے۔ یوں لگتا جیسے
اس کے جسم کا قیمہ ہی کر ڈالے گی —— جانے کب تک وہ اس کے مردہ جسم پر
کلہاڑا چلاتی رہی۔

نکڑی کا سانس پھولنے لگا تھا ——!

خون میں لت پت وحشی درندے پر نظر ڈال کر اس نے نفرت سے سجوار شاہ
کے جسم پر تھوک دیا اور اُسی حالت میں بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی۔ حویلی کے
...تک کوئی پہریدار اس کے راستے میں نہیں آیا۔ دروازے پر موجود پہریداروں
نے اس حالت میں دیکھا تو ایک لمحے کے لیے گھبرا گئے۔

بہاول ڈاکو کی بیٹی دروازے سے باہر نکل گئی۔

خوفزدہ پہرے دار جب تک سنبھلتے وہ دُور جا چکی تھی۔ عین اُن لمحات میں
...اور دوسرے ملازمین سجوار شاہ کی ناقابل شناخت لاش کے گرد گھیرا ڈالے
...تھے۔ بہاول کی بیٹی تیزی سے اُس گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی جس کا
...دُور سے آتا دکھائی دینے لگا تھا۔

اس نے حویلی سے ریلوے لائن تک کا ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ اسی
...عالم میں طے کیا تھا اور اب با وفا موت کو گلے لگانے جا رہی تھی۔

تیز رفتار گاڑی کے انجن نے چند سیکنڈ میں اُسے زندگی کے بوجھ سے
آزاد کر دیا۔

...فورس کے کمانڈر کو ساری کہانی سمجھ آ چکی تھی۔ کیونکہ وڈیرے سیفل
...کی خبر بھی اُسے رات ہی مل گئی تھی۔ اس نے کڑی سے کڑی ملا کر
...حل کر لیا تھا۔

اُس کا ایمان اِس بات پر مزید مستحکم ہو گیا تھا کہ خدا اِس ملک کی حفاظت کرے گا۔ دونوں غداروں کی موت مکافاتِ عمل ہی کا نتیجہ تھا اگر ان میں کوئی ایک بھی قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کے ہاتھوں مارا جاتا تو سندھ موومنٹ کے ورکرز کے جذباتی طوفان کا رُخ "را" پاکستانی فوج کی طرف موڑ دیتی اور ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

صبح کے اخبارات نے رات کو ہونے والی چار موتوں کی کہانی کو حقائق کے ساتھ بیان کر دیا... سندھ موومنٹ کے دو لیڈروں کا اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں مارے جانا یہاں کے سادہ لوح لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ خدا کے نام پر حاصل کردہ اِس مملکت کی حفاظت سے اُس کے حکمران تو غافل ہو سکتے ہیں قدرت کبھی غفلت نہیں برت سکتی۔

اور پھر.....

رخسانہ نے حسبِ سابق گرمجوشی سے اُس سے معانقہ کر کے عارف میاں کا استقبال کیا تھا۔ ایمبولینس کے باقی دونوں رضا کاروں نے بتایا تھا کہ وہ عارف میاں کی دلیری کی وجہ سے ہی جان بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں ورنہ وہ لوگ انہیں مار ڈالتے ۔۔۔!

"ایمبولینس مل گئی کیا۔۔۔" عارف میاں نے پہلا سوال کیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ حیرت کی بات ہے کہ ہماری اطلاعات کی حد تک کسی بھی سرکاری ایجنسی نے اِس کارروائی کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا ہے۔۔۔" رخسانہ نے وضاحت بتایا۔

"مس رخسانہ آپ تو جانتی ہیں کہ ایسی کارروائیوں کی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا۔ میرے خیال کے مطابق اب مرکزی حکومت میں موجود ہمارے ذرائع زیادہ قابلِ اعتماد نہیں رہے۔ میرے ساتھی بھی اس بات کی گواہی دیں گے۔ جب نفیس میاں کو اغوا کیا جا رہا تھا تو وہاں سے رینجرز کی گاڑی گزری لیکن اُن لوگوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ ہمارے راستے میں جانے کتنے ناکوں پہ رینجرز رہتی ہے اور خاص طور پہ جہاں سے نفیس میاں کو اغوا کیا گیا وہاں سے کسی مذہبی گروپ کا کوئی کارروائی کرنا ناممکن ہے۔ یہ سراسر سرکاری کارروائی تھی۔

اور سیکورٹی ایجنسی والوں نے کی ہے ۔۔۔ ان لوگوں کو ہمارے ساتھ خدا واسطے کا بیر
ہے ۔۔۔ اور ہاں آپ کو شاید علم رہا ہو کہ ذاکر بھائی والے کیس والا انسپکٹر جو
ہمارے ہاں "۹۵" سے بھاگ گیا تھا اس سیکورٹی ایجنسی میں افسر لگا ہوا ہے۔
اب آپ جان لیجیے کہ یہ لوگ ہمارے خلاف کیا نہیں کرتے ہوں گے ۔۔۔!!"

عارف میاں جانتے تھے کہ رخسانہ کے ذریعے جو بات "بابا صاحب" تک پہنچے
گی وہ زیادہ معتبر خیال کی جائے گی۔ وہ تنظیم کے تمام ذمہ داروں کے دلوں میں شکوک
وشبہات پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے سے برگشتہ کرنے اور آپس میں لڑانے
کی پالیسی پر عمل پیرا تھا اور اپنی تمام توانائیاں اُس نے اس کے لیے وقف کر
دی تھیں۔

"سب مارے جائیں گے ۔۔۔ بابا صاحب کے سب دشمن ایک ایک کر کے مارے
جائیں گے۔ یہ بے وقوف لوگ نہیں جانتے انہیں پُراسرار قوتوں کی مدد اور راہنمائی
حاصل ہے۔"

رخسانہ جب یہ اول جلول بک رہی تھی تو اس پر عجیب سی دیوانگی طاری تھی
عارف... بھی پورے جوش و خروش سے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

"ایک بات مجھے سمجھ نہیں آئی۔"

"کیا؟" عارف نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ظاہر ہے جن لوگوں نے نفیس میاں کو اغوا کیا ہے وہ پہلے سے اُس کی آمد
سے باخبر رہے ہوں گے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ نفیس میاں نے خود انہیں خود پر ٹوٹنے
والی قیامت سے مطلع کر کے مدد کی اپیل کی ہے۔ ضرور کسی اور نے یہ کام کیا ہے
جس کے بعد ان لوگوں نے نفیس میاں کو اغوا کیا ہو گا۔"

رخسانہ نے یہ بات گو کہ اُس کی طرف دیکھے بغیر کہی تھی لیکن ایک لمحے

...ی میاں کو اپنے دل کی دھڑکن بند ہوتے محسوس ہوئی۔ پھر وہ سنبھل گیا۔
...یر گل نے یقیناً اس مفروضے پر نظر رکھی ہو گی۔ اُسے یاد آ گیا کہ اس کا دست
...ی افیسر تھا۔

"پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا مس رخسانہ لیکن بعد میں حالات نے ثابت کر دیا
...والی اتفاقیہ تھی ۔۔۔" اس نے سنبھل کر کہا۔

"وہ کیسے؟" رخسانہ نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں کوئی بات
...بے خلافِ معمول دکھائی نہیں دی۔

"وہ یوں کہ اس روز شہر میں مختلف جگہ چار ایمبولینسوں کو روک کر اُن کی
...لی گئی۔ یہ تو حُسنِ اتفاق تھا کہ ہمارے والی ایمبولینس میں نفیس میاں موجود تھا
ان ایمبولینسوں میں کوئی ایسی بات نہیں تھی ورنہ وہاں بھی وہ کسی نہ کسی
...لیتے ۔۔۔ میں تو بڑے غور کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کارروائی
...عمل میں آئی ہے اور کسی طے شدہ منصوبے کا حصہ معلوم نہیں ہوتی ۔۔۔"

عارف میاں نے بظاہر رخسانہ کو مطمئن کر دیا تھا۔

لیکن ۔۔۔

رخسانہ کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے چند لمحوں کے
...گہری نظروں سے عارف میاں کا جائزہ لیا اور پھر اچانک اس کا موڈ
...مطابق رومانٹک ہو گیا۔

"تم ہوشیار ہو گئے ہو ۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے عارف میاں کو آنکھ ماری
...نے کر دیا ہے۔ ہمارا مشن ہی ایسا ہے کہ ایک ایک قدم پھونک
...کر رکھنا پڑتا ہے۔ آپ کو تو علم ہے کہ کسی کی معمولی سی غلطی سے بہت سے
نقصان پہنچنے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ میں تو اب اپنے ساتھ کسی مشن پر جانے

والوں کے متعلق پہلے پوری معلومات حاصل کرتا ہوں۔ میرا تو مشورہ ہے اگر آپ بابا
تک پہنچا سکیں تو تنظیم کے لیے بہت سود مند ہوگا چاہے کسی کو بُرا ہی کیوں نہ لگے لیکن
پہ متعلقہ عہدیداروں کی مکمل سکریننگ کی جائے اور یہ کام بلا استثنیٰ ہونا چاہیے اور
رو رعایت کے بغیر ـــــ میرے خیال سے اب یہ ناگزیر ہوتا جارہا ہے۔"

"میری جان! تمہارا مشورہ سر آنکھوں پہ لیکن باباصاحب کے سامنے کبھی ایسی
کی غلطی نہ کرنا۔ اُن کا موڈ بگڑنے لگے تو معمولی سی باتوں پر بگڑ جاتا ہے خصوصاً
اُس وقت جب کوئی اُنہیں مشورہ دینے کی کوشش کرے۔"

یہ بات رخسانہ نے مسکراتے ہوئے کہی تھی لیکن بات کی تہہ میں چھپی ہوئی
نصیحت کو عارف میاں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

"میرے خیال سے اُن کی یہ سوچ بالکل بجا ہے۔ رخسانہ صاحبہ ایک بابا
کی ذات ہی تو ہے جس کے دم قدم سے ہماری کمیونٹی کی آج اِس ملک میں پہچان
ہے۔ یہ تنظیم کا سارا ڈھانچہ اُن کی ذاتی سوچ کا مرہونِ منت ہے۔ آج ہم جس
مضبوط سیاسی عمارت میں بیٹھے ہیں اُس کی ایک ایک اینٹ کو باباصاحب نے
اپنی ذاتی محنت سے دیواروں میں چُنا تھا۔ کم از کم مجھے تو پوری تنظیم کیا بلکہ سارے
ملک میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آرہا جو اُنہیں مشورہ دے سکے ـــــ جو بات میں نے
کی ہے وہ خدانخواستہ مشورے والی بات نہیں وہ تو باباصاحب کے ایک ادنیٰ
سے جانثار کے ذاتی جذبات ہیں۔"

عارف میاں بھی پہلے سے دہلا ثابت ہو رہے تھے۔!

بات سے بات نکالنے کا فن اُس نے بخوبی سیکھ لیا تھا۔ وہ کم از کم
تنظیم سے متعلق ماہر نفسیات بن چکا تھا۔ اُسے علم ہو جاتا تھا کہ کس کارکن کے
دماغ میں کون سا کیڑا بیٹھا ہے اور اُسے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگانی ہے۔

حاصل ہو گیا تھا۔

رخسانہ کو آج تو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے عارف میاں اُس سے بڑے
صاحب کے عاشق اور جانثار ہیں اور اُن کی زندگی کا مقصد ہی شاید باباصاحب
پر وقت آنے پہ جان کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔

اُس نے عارف میاں کے لیے چائے اپنے ہاتھوں سے بنا کر پیش کی تھی اور
دونوں چائے کی پیالیاں ہونٹوں سے لگائے ایک دوسرے کو شہوت زدہ آنکھوں
سے دیکھ رہے تھے جب اچانک سامنے کا دروازہ کھلا اور بالو بھائی اندر آ گیا۔

بالو بھائی باباصاحب کا ذاتی باڈی گارڈ تھا اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی
دونوں ہڑبڑا کر اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"ارے بیٹھو بی بی! ہم بے چارے اس قابل کہاں ہیں اور ہاں کیا حال ہے
میاں جی تمہارے کام ہی سے آیا تھا۔"

اس نے عجیب سی نظروں سے عارف میاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"عزت بالو بھائی۔ ہم اُس قابل کہاں کہ آپ کی نظروں میں کوئی جا پا سکیں۔"

عارف میاں نے دل کے چور کو بظاہر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"بھئی آج کل تو ہر طرف تمہارے ہی چرچے ہیں میاں صاحبزادے۔ اب جس
دلیری سے دونوں لونڈوں کو سیکورٹی والوں کے نرغے سے بچا لائے ہو
مطلب ہے تو ہمارے نزدیک تمہاری حیثیت ہیرو کی سی ہو گئی ہے۔ یوں تو
ان کو کالیا سے بچا لانا ہی تمہارا بڑا عظیم کارنامہ ہے ـــــ بھئی بہت
بڑے شے نکلے ہو۔"

بالو بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں بالو بھائی۔ ہم تو باباصاحب کے ادنیٰ سے جانثار ہیں ـــــ اپنی

تو زندگی ہی بابا صاحب کے نام لگ گئی ہے ـــــ" عارف میاں نے بھی دانت نکالے

"اچھا یار میں اہم کام تو بھول ہی گیا تھا۔ بابا صاحب نے کہا تھا کہ

بی بی تم سے فوراً رابطہ کریں لیکن تم تو یہیں موجود ہو۔ میں انہیں مطلع کر کے

واپس آتا ہوں۔"

بابو بھائی اتنا کہہ کر واپس چلے گئے۔

"بڑے خوش قسمت ہو عارف میاں اب بابا صاحب نے تجھے بلانا

کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔"

رخسانہ نے بابو بھائی کے جانے کے بعد اس سے کہا۔

دونوں نے چائے ختم کر کے ابھی پیالیاں میز پہ رکھی ہی تھیں کہ دوبارہ

بابو بھائی اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ وہاں آ گیا۔

"دونوں کو بابا صاحب نے طلب فرمایا ہے ـــــ" اس کے حکم سنانے

انداز نے ایک مرتبہ تو عارف میاں کو ہلا کر رکھ دیا۔

"چلو بھئی! چلتے ہیں ـــــ"

رخسانہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ عارف میاں کے لیے سوائے اس کا ساتھ

کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

دونوں بابو بھائی اور اس کے ساتھی کے تعاقب میں چلتے جب بابا صاحب

کے کمرے میں پہنچے تو یہاں شیطانوں کی پوری منڈلی موجود تھی۔ پرویز بھائی

کے تین چار خونخوار درندوں کے ساتھ بابا صاحب کے نزدیک بیٹھا تھا۔

عارف میاں ایک لمحے کے لیے ٹھٹکے پھر سنبھل گئے۔ اس نے انکساری

انداز میں سب کو تعظیم دی اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

"دروازہ بند کر دو ـــــ"

بابا صاحب نے بابو بھائی سے کہا۔ جو دروازہ بند کر کے باہر پہرے پہ کھڑا ہو گیا۔

"کیسی ہو مس رخسانہ!" اچانک پرویز بھائی نے اپنا رخ اس کی طرف بدلا۔ یہ

اپنائیت بھی جو بابا صاحب کے سامنے اسے اتنی بے تکلفی سے بلا رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں ـــــ" اس نے پرویز بھائی کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ اس

جواب دینے کے انداز میں ناراضی کا عنصر نمایاں تھا۔

"ذرا اپنی گاڑی کی چابی تو دینا ـــــ" اس مرتبہ بابا صاحب نے خود اسے

مخاطب کیا شاید وہ اب پرویز بھائی کو موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

رخسانہ نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر اپنے پرس سے چابیاں نکال کر

بابا صاحب کو تھما دیں۔

"دراصل پرویز بھائی کو کچھ شک ہو گیا ہے۔ شاید انٹیلی جنس والوں نے

لگا کر چلایا ہے ـــــ ہم اپنے اطمینان کے لیے حفظ ما تقدم کے لیے کچھ تو کر ہی"

سکتے ہوئے بابا صاحب نے چابیوں کا گچھا اپنے پہلو میں بیٹھے پرویز بھائی

کو تھما دیا۔

"تم جاؤ اور مس رخسانہ کی گاڑی میں موجود انٹا فون اٹھا لاؤ۔"

پرویز بھائی نے اپنے ایک ساتھی کو چابیاں تھماتے ہوئے براہ راست عارف

میاں کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

عارف میاں کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا لیکن انہوں نے کمال ضبط سے

اپنے اوسان بحال رکھے ہوئے تھے۔

"بہت محتاط رہنا ہوگا تم لوگوں کو۔ یہ سیکورٹی والوں کا افسر اعلیٰ بڑا سخت

لگتا ہے اس سے بچنے کے لیے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا۔"

بابا صاحب نے ان سب کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

تھا تھوڑی دیر بعد رخسانہ کی گاڑی سے انشا فون لے آیا جو اس نے پرویز کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

پرویز بھائی نے سب کے سامنے ایک پیچ کس کی مدد سے فون کھول دیا اور سائیجیٹ جو عارف میاں نے اس میں نصب کیا تھا نکال کر بابا صاحب کے پھیلے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

عارف میاں کو اپنی نبضیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

انکشاف اور...

"یہ کیا ہے؟" — بابا صاحب نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اس فون پر ہونے والی تمام گفتگو انٹیلی جنس والوں کے علم میں ہوتی ہے۔ بابا صاحب! اور آپ جانتے ہیں کہ اس فون پر کس نوعیت کی بات چیت ہوتی ہو۔ رخسانہ سے عام ورکر تو بات کرنے کی ہمت ہی نہیں کر پاتا۔ اب آپ کو علم ہو گیا ہوگا کہ ہمارے راز کس طرح افشا ہو رہے ہیں اور کارروائی سے پہلے ہی پولیس ہمارے کارکنوں پر کس طرح گرفت حاصل کر لیتی ہے۔ بابا صاحب! ابھی اس ملک کی پولیس اس قابل نہیں ہوئی کہ وہ ہمارے ساتھیوں کو کارروائی کرنے سے پہلے پکڑ لے نہ ہی ہماری تربیت کا معیار اتنا گھٹیا ہے کہ ہم کام کرنے سے پہلے ہی ان کے ہتھے چڑھ جائیں — یہ تو کوئی گھر کا بھیدی ہے جو ہماری لنکا ڈھانے پر تلا ہوا ہے۔"

پرویز بھائی نے دوران گفتگو ایک مرتبہ بھی عارف میاں کی طرف نہیں دیکھا بالآخر اس بات سے اُسے کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے بڑی ہمت سے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا تھا۔

اچانک ہی ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا اس نے محسوس کر لیا تھا کہ پرویز بھائی اور رخسانہ ایک دوسرے کے لیے نیک جذبات

نہیں رکھتے جہاں پرویز بھائی کو اس بات کا غصہ رہتا تھا کہ رخسانہ نے بابا جی
کا قرب حاصل کر رکھا ہے اور ان کے فیصلوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ وہاں
رخسانہ کو یہ غم کھائے جاتا تھا کہ تنظیم کے نام پر آئے روز لاکھوں روپے
طاقت بڑے بڑے سیٹھوں سے حاصل کر کے پرویز بھائی اکیلا ہی ہڑپ کر
جاتا تھا اور ایک دو مرتبہ اس نے اشارے کنایے سے بابا صاحب کے کانوں
تک یہ شکایت پہنچانے کی کوشش بھی کی تھی بابا صاحب نے اس کا کچھ خاص اثر
قبول نہیں کیا تھا۔

کیا یہ شخص اتنا با اثر ہے کہ بابا صاحب بھی اس کے سامنے خود کو بے بس
محسوس کرنے لگا ہے؟

چند روز پہلے ہی اُس نے عارف میاں کے ساتھ دورانِ گفتگو یہ خدشہ
ظاہر کیا تھا ـــــ!

عارف میاں کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ پرویز بھائی نے اس کے اندازے
کے برعکس ابھی تک اُسے مشتبہ نہیں گردانا تھا۔ شاید اس نے یہ ڈرامہ تو رخسانہ
کو ذلیل کرنے کے لیے رچایا تھا۔

ان دونوں کو ہی آپس میں کیوں نہ ٹکرا دیا جائے۔

اس نے سوچا اور دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

"پرویز بھائی میں خود کو اس قابل تو نہیں سمجھتا کہ آپ سے کوئی سوال
کرنے کی ہمت کروں لیکن معاملہ چونکہ تنظیم کا ہے جس کی بقا کے لیے ہماری
جان بھی حاضر ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اس مسئلے کو ہم اپنی انا کا مسئلہ بنالیں لیکن
آپ سے پہلی بات تو یہی پوچھنا ہے کہ آپ کے علم میں یہ بات کب آئی؟"

اس نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے ہوا میں پہلا تیر چلایا۔

"دو تین روز پہلے ـــــ ہمارے ایک خصوصی سورس نے بتایا کہ انٹیلی جنس والے
ہماری بڑی اہم گفتگو ریکارڈ کر رہے ہیں ـــــ"

پرویز بھائی نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

عارف میاں کے لیے یہاں صرف اس بات کی اہمیت تھی کہ کہیں بابا صاحب
ان کی بات کا بُرا نہیں مانا اور اس نے بابا صاحب کے چہرے سے اس بات
کا اندازہ لگا لیا تھا کہ انہوں نے اس کی حرکت کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

"ظاہر ہے آپ نے دو تین روز میں جاننے کی کوشش کی ہو گی کہ ہمارے ہاں کس
کے ذریعے یہ راز باہر جا رہے ہیں؟"

اس نے اگلا سوال داغا۔

"ہاں اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انٹیلی جنس والوں نے ضرور مس رخسانہ کے
یہاں کوئی خفیہ آلہ نصب کر دیا ہے کیونکہ ہم لوگ اپنے ٹیلیفونوں کی اس نوعیت
بلکہ اپنے ذرائع سے مہینے میں ایک دو مرتبہ کرواتے رہتے ہیں کہ ہمارے فون
ٹیپ تو نہیں ہو رہے" ـــــ پرویز بھائی نے چڑ کر جواب دیا۔

"پرویز بھائی اگر آپ بُرا نہ مانیں اور میری نیت پر شک نہ کریں تو میں پھر
ایک بات پوچھوں گا کہ آپ نے مس رخسانہ پر ہی کیوں شک کیا؟ آپ نے مجھ پر
یا کسی اور پر شک کیوں نہ کیا ـــــ ہم لوگ بھی اپنے فون کبھی چیک نہیں کرواتے؟"

اس نے دیکھا تھا کہ اس سوال پر رخسانہ کے چہرے پر زندگی دوبارہ لوٹ
آئی۔

"میں بتاتی ہوں ـــــ کیونکہ پرویز بھائی ایک عرصے سے مجھے بابا صاحب کی
نظروں سے گرانے پر تُلے ہوئے تھے اور اپنے اس مقصد میں اُنہیں اب بھی کامیابی
حاصل نہیں ہو گی ـــــ"

اس کے اس سوال کا جواب پرویز بھائی کی بجائے رخسانہ نے دیا تھا۔
"پرویز بھائی اگر آپ میں ہمت ہے تو کھل کر مجھ پر الزام لگائیں تو پھر
ہی میں کوئی وضاحت کروں گی ــــ"
اُس نے پرویز بھائی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس کی طرف دیکھتے ہوئے
بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔
"دیکھئے بابا صاحب! یہ رخسانہ زیادتی کر رہی ہیں ــــ میں نے ان پر
کوئی الزام نہیں لگایا....."
"پرویز بھائی یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ مہربانی میرے فون پر آپ ہی [illegible]
اُس نے پرویز بھائی کی بات کاٹتے ہوئے دوبارہ طنزیہ لہجے میں کہا۔
اس بات کا علم سب ہی کو تھا کہ بابا صاحب کے سامنے اس قسم کی گفتگو
بے باکی سے صرف رخسانہ ہی کر سکتی ہے۔
پرویز بھائی کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا اس کا بس نہیں چلتا تھا
کہ وہ رخسانہ کا گلا ہی دبا دے۔
"بابا صاحب آپ دیکھ رہے ہیں اس نے میری....."
"بھئی تم لوگوں نے کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے ــــ تمہیں اس سنگینی کا احساس نہیں
ہو رہا جو بیوقوفوں کی طرح آپس میں اُلجھنے لگے ہو ــــ یہ وقت ان باتوں کا نہیں
پرویز بھائی ڈھونڈو اُسے ڈھونڈو جس نے یہ حرکت کی ہے اُس کا کھوج لگاؤ
زمین کی ساتویں تہہ میں بھی چھپا ہے تو اُسے باہر نکالو۔ میں خود اس کے جسم سے
چمڑی الگ کروں گا ــــ ہاں میں خود کروں گا ــــ اور ایک بات اور کان کھول
کر سن لو۔ مجھے دو تین روز میں اس بات کا علم ہو جائے گا کہ ہماری آستین میں کون
سانپ چھپا ہے پھر اس کے لیے سزا کا تعین بھی میں خود کروں گا ــــ پرویز بھائی

تنظیم کے تمام عہدیداروں کے فون چیک کراؤ ــــ فوراً ــــ آج شام سے
پہلے یہ کام ہو جانا چاہیئے۔ بہر صورت آج شام سے پہلے ــــ"
بابا صاحب نے خود مداخلت کر کے اس معاملے کو روکا۔ شاید وہ ان دونوں
کی دشمنی کو افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔
اُسے احساس تھا کہ پرویز بھائی اور رخسانہ آپس میں ٹکرا جائیں گے اُسے
بہر صورت ان دونوں کے درمیان دیوار بننا تھا تاکہ اس طوفان کو روکے رکھے۔
یہ دونوں آپس میں ٹکرا جاتے تو سب کچھ ملیامیٹ ہو جانے کا خطرہ موجود تھا!
بابا صاحب کو احساس تھا کہ سیکورٹی ایجنسی کا نیا چیف کتنا ہوشیار آدمی ہے۔
عین ممکن ہے اُس نے ان دونوں کو آپس میں لڑانے کے لیے یہ سازش تیار کی
پہلے رخسانہ کے فون میں گیجٹ فٹ کروایا پھر پرویز بھائی کے ذریعے اُسے
آگاہ بھی کروا دیا۔
بابا صاحب پہلے درجے کا مکار آدمی تھا ــــ!
اُسے غصہ آتا تھا لیکن وہ غصے میں اپنا نقصان کروانے کا قائل نہیں تھا۔
اُس نے جان لیا تھا کہ بڑے بھائی کی موت کے بعد سے کچھ لوگوں نے
پُرزے نکالنے شروع کیے تھے۔
عین ممکن تھا کہ مستقبل میں یہ لوگ اُن کی برابری کے دعویدار ہوتے۔
ممکن تھا کہ وہ تنظیم میں اپنی اہمیت منوانے کے چکر میں لُٹیا ہی ڈبو دیتے۔
یہ سب اس کے ہاتھوں کے تراشے صنم تھے۔
وہ انہیں اپنے برابر کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس
کی کامیابی کا راز ہی یہی تھا کہ اُس نے اپنا قد کاٹھ چالاکی اور چکر بازی سے
اونچا اٹھا لیا تھا کہ تنظیم کے باقی لوگ اس کے سامنے بونے نظر آئیں۔

اُسے اس بات کا پتہ تو لگانا ہی تھا کہ اُن کی صفوں میں کونسا غدار گھس آیا ہے۔

لیکن ——

اس کی کام کرنے کی بھی اپنی ترجیحات تھیں۔

سب سے پہلے اُسے اُن سیاسی بونوں کا خاتمہ کرنا تھا جو مستقبل میں اس کے لیے چیلنج بن سکتے۔

اُس نے نوٹ کیا تھا کہ نجی محافل میں بھی پرویز کی آواز اس کے سامنے کچھ زیادہ ہی بلند ہونے لگی تھی۔

اور ——

یہ کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ نہ اس کے لیے نہ تنظیم کے لیے۔

جہاں تک رخسانہ کا تعلق تھا دنیا کی کوئی طاقت اس کی وفاداریوں کو نہیں ہلا سکتی تھی نہ ہی کوئی اُسے رخسانہ سے گمراہ کر سکتا تھا۔

"اگر رخسانہ غدار بھی تو پھر تنظیم کو تباہ ہی ہو جانا چاہیے تھا۔" اس نے سوچا

اُس کا شیطانی ذہن بڑی تیزی سے چل رہا تھا جلد ہی وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

"میں خود دیکھوں گا اس معاملے کو —— رخسانہ تم بھی خیال رکھنا کہ دلاور اپنی آنکھیں کھلی رکھو —— کچھ بھی ممکن ہے —— اور ہاں پرویز بھائی تنظیم کے لیے ہیں ان کی عزت کم نا ہو گی سب کو ——"

اُس نے رخسانہ کی طرف گردن گھما کر کہا —— !

پرویز بھائی کی گردن اکڑ گئی ——

لیکن ——

رخسانہ باباصاحب کی رگ رگ سے واقف تھی۔ وہ اس فقرے کا مطلب جانتی تھی۔ باباصاحب نے اس کے راستے کا کانٹا صاف کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"جو حکم باباصاحب ——"

اس نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"پرویز بھائی تلاش جاری رہنی چاہیے۔ عارف میاں تم بھی آنکھیں اور کان کھلے رکھا کرو ——"

باباصاحب اب اُن سے مخاطب تھے۔

"ٹھیک ہے باباصاحب آئندہ آپ کو کبھی کوئی ایسی اطلاع نہیں ملے گی۔"

عارف میاں جن کے کلیجے پہ دھری چٹان، اچانک اپنی جگہ سے ہٹ گئی اب اطمینان سے بات کرنے کے لائق ہو گئے تھے۔

اس نے دل میں سنبھلنے تک کتنی مرتبہ خدا کا شکر ادا کیا تھا جس نے عارف میاں کو مکھن سے بال کی طرح آنے والے عذاب سے نکال کر الگ رکھ دیا تھا۔

یہ خدا کا فضل ہی تھا کہ پرویز بھائی کا خیال اُس کی طرف نہیں گیا۔ حالانکہ تنظیم کے لوگوں کو اس کے ساتھ رخسانہ کے اچانک بڑھ جانے والے تعلقات کا علم تھا اور سب اُس کے تئیں حسد بھی کرنے لگے تھے۔

تھوڑی دیر بعد شیطانوں کی یہ مجلس برخاست ہو گئی۔

پرویز بھائی بظاہر پھولے نہیں سما رہا تھا کہ اس کے سامنے باباصاحب نے رخسانہ کی بے عزتی کر دی تھی۔

اب اُسے یہ ثابت کرنا تھا کہ رخسانہ ہی دراصل انٹیلی جنس کی ایجنٹ بن کر تنظیم کا بیڑہ غرق کرنے پر تلی ہے اور یہی عزائم لے کر وہ یہاں سے جا رہا تھا۔

○

انسپکٹر فیروز اپنی گارڈز کے ساتھ مستند تھا۔

ان لوگوں کو چند ماہ پہلے ہی یہ خصوصی ذمہ داریاں تفویض کی گئی تھیں جس پر کم از کم وہ خوش نہیں تھے کیونکہ یہ خدمات بحری محافظ انجام دے سکتے تھے اور اس علاقے میں تو بطورِ خاص نیوی کی انٹیلی جنس ایجنسی سرگرم رہتی تھی لیکن ــــ

شاید سیکورٹی ڈبل کرنے کے لیے اُن کی ایجنسی کو بھی اس کام پر لگایا گیا تھا۔ کچھ عرصے سے یہ خبریں عام تھیں کہ ہمسایہ ممالک سے تخریب کاری کے لیے جو اسلحہ اس شہر میں لایا جا رہا ہے وہ اسی سمندری راستے سے آتا ہے اور ساحلی علاقے سے پھر شہر میں تقسیم کرنے کے لیے لے جایا جاتا ہے

یہ خبر بھی تھی کہ کچھ ملک دشمن عناصر اپنی شکاری لانچوں کے ذریعے دشمن کے ایجنٹ اور تنظیم کے تربیت یافتہ ورکروں کو جو بھارت سے واپس آتے تھے یہاں تک پہنچا دیتے تھے۔

مرکز کی طرف سے ایسی خبروں کا سختی سے نوٹس لیتے ہوئے یہ کارروائی کی گئی تھی اور اب نیوی کے علاوہ دوسری سیکورٹی ایجنسیوں کو بھی طویل ساحلی پٹی پر کڑی نظر رکھنے کی ہدایات جاری ہوئی تھیں۔

اس ساحلی علاقے میں ماہی گیروں کی بستیاں آباد تھیں اور وہ انہی سمندری راستوں سے گزر کر شکار کے لیے جاتے تھے۔

شام ڈھل چکی تھی۔

سمندر بظاہر پرسکون لیکن اپنے سینے میں ہزاروں طوفان سمیٹے ہوئے تھا۔ دُور دُور تک کسی لانچ کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید ماہی گیر

سمندر میں مچھلیاں پکڑنے چلے گئے تھے اور اب اُن کی واپسی صبح کے بعد ہونے والی تھی۔

چاند کی آخری تاریخوں کے سبب شام ڈھلتے ہی چاروں طرف اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور انسپکٹر فیروز جیپ میں اپنے چار مسلح جوانوں کے ساتھ ساحل کے ساتھ ساتھ گشت کر رہا تھا۔ اُن لوگوں نے جیپ ایک طرف کھڑی کر دی تھی اور آپ ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تاحدِ نگاہ سوائے پانی کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا یا پھر اندھیرے کی وہ طویل چادر جو لہروں کا حصہ بن جاتی تھی۔

"میرے خیال سے یہیں رُک جاتے ہیں۔ آج موسم کے تیور بھی اچھے دکھائی نہیں دے رہے۔ نذیر یار ذرا چائے کا ایک کپ تو بوتل سے نکال لا۔"

انسپکٹر فیروز نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے کہا جس نے "یس سر" کہہ کر جیپ ہی میں موجود فلاسک سے چائے کا ایک کپ نکال کر اپنے آفیسر کی طرف بڑھا دی۔ ابھی اُس نے دو تین گھونٹ چائے ہی پی تھی جب اچانک جیپ میں نصب وائرلیس ریڈیو میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی۔

اُس نے معمول کے مطابق ہی مائیک ہاتھ میں پکڑ کر آواز موصول کرنے والا بٹن دبایا تھا۔

لیکن ــــ

دوسری طرف سے آنے والی آواز سُن کر ایک مرتبہ تو اُس کے ہاتھوں سے چائے کا کپ گرتے گرتے رہ گیا۔

بڑے ملک صاحب تھے۔

ان کی ایجنسی کے مقامی افسرِ اعلیٰ ــــ آج تک اُس نے ڈھنگ سے ملک

صاحب کی شکل نہیں دیکھی تھی وہ براہِ راست اُس سے مخاطب تھے۔

"ایس پی صاحب ہیں خاموش ـــــ" اُس نے مائیک پہ ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

سب اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے تن گئے۔

"پیٹرول سیون! ہمارے ایک سورس نے تھوڑی دیر پہلے شمال کی سمت دو تین کلومیٹر کی دُوری پر مشتبہ نقل و حرکت نوٹ کی ہے۔ فوراً وہاں پہنچو اور حالات کا جائزہ لو۔ اور ہاں وہاں پہنچتے ہی مجھے رپورٹ کرو۔ میں خود لائن پر موجود رہوں گا۔ خبردار اگر کسی نے معمولی سی کوتاہی بھی کی ـــــ میں بالکل برداشت نہیں کروں گا۔ شاباش بڑی مستعدی سے۔ ہوشیاری سے۔ اگر ضرورت ہو تو فوراً مجھ سے رابطہ کرو اور جس قسم کی بھی مدد درکار ہو مجھے بتاؤ۔ اگر مزید فورس درکار ہے تو بھی میں نے دو جیپوں کو "سٹینڈ بائی" کر دیا ہے ـــــ او۔ کے۔ وش یو آل دا بیسٹ۔ گو آہیڈ ـــــ"

ملک اختر نے حکم دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

"کوئی خطرناک معاملہ ہے سر! ایس پی صاحب نے خود حکم دیا ہے تو ضرور کوئی اہم بات ہو گی ـــــ" اُس کے حوالدار نے کہا۔

"چوکس ہو جاؤ ـــــ یہی موقعہ ہوتا ہے اپنا آپ دکھانے کا۔ ہم لوگوں کو ایسے مواقع زندگی میں بار بار نہیں ملا کرتے ـــــ اپنی کارکردگی دکھانے کے ـــــ ہوشیاری سے بیٹھنا ـــــ اپنی گنیں چیک کر لو ـــــ ہمیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ـــــ ہم خود مجرموں کو پکڑ سکتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے ڈرائیور کو جیپ بڑھانے کا اشارہ دیا۔

اپنی روانگی کا سگنل اُس نے کنٹرول روم کو دے کر بتا دیا تھا کہ اُن کی گاڑی

روانہ ہو گئی ہے۔

کنٹرول روم میں اُس روز بطورِ خاص موجود ایس پی ملک اختر نے جب یہ سنا تو وہ زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔

اس روز اُس کے محکمے کے لوگ اپنے افسرِ اعلیٰ کی کارکردگی اور کام سے اس قدر لگن دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئے تھے۔

ملک اختر کی آمد اچانک، خلاف توقع اور چونکا دینے والی تھی۔

ملک اختر نے آتے ہی کنٹرول روم کا رُخ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ایک جیپ کو ہنگامی حالت میں مدد کی اپیل پہ روانہ ہونے کا سگنل دے دیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ایس پی ملک اختر کو ضرور اپنے خصوصی ذرائع سے کوئی اطلاع ملی تھی اور یہ اتنی اہم اطلاع تھی جس پر کارروائی کرنے کے لیے وہ خود یہاں آ گیا تھا۔

اب یہ خصوصی آپریشن اس کی کمان میں ہو رہا تھا۔۔۔!

جیپ کی روانگی کے تقریباً پانچ سات منٹ بعد اُس نے اپنے کمرے کا رُخ کیا اور ہدایت کے ساتھ کیا کہ دوسری طرف سے موصول ہونے والا ہر پیغام اُس تک پہنچایا جائے۔ اُس نے اپنے ماتحت عملے کے لیے "ریڈ الرٹ" کر دیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ لوگ اس وقت تک اپنے گھروں کو نہیں جا سکتے جب تک افسرِ اعلیٰ یہاں موجود تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اُس نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا پھر اپنی میز کے اوپر دھرے ٹیلیفونوں میں سے ایک اُٹھا کر اس پر ایک نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے کال ملنے پر اُس نے دُکان کے مالک سیٹھ صاحب سے آرڈر سے متعلق دریافت کیا کہ وہ سیل کو تیار ہوا ہے یا نہیں۔۔۔!

"سر اکل تک مل جائے گا۔"

دوسری طرف سے جواب ملا۔

"بھئی سیٹھ صاحب مجھے فوراً چاہیے۔ گو اہیڈ ۔"

اتنا کہہ کر اُس نے اس طرح فون بند کر دیا جیسے اُسے بروقت نہ تیار ہونے پر غصہ آگیا ہو۔

○

ملک اختر کا پیغام جس سیٹھ صاحب نے موصول کیا تھا یہ وہی ذات شریف تھے جو اُس سے بینا کشتی کے بھائی کے روپ میں ملے تھے۔

آج وہ لوگ ملک اختر سے حق نمک وصول نے جا رہے تھے۔ اس طرح وہ ان وفاداریوں کا امتحان بھی لے رہے تھے اور اس بات کا جائزہ بھی کہ ان تلوں کتنا تیل ہے؟

جیسے ہی ملک کی طرف سے "گو اہیڈ" کا سگنل موصول ہوا سیٹھ نے اپنے ذا سے ایک اور نمبر پہ یہی پیغام دے دیا۔ قریباً دس منٹ بعد چار مختلف ٹیلی فونوں سے باری باری یہ پیغام ایک دوسرے تک پہنچنے کے بعد بالآخر سمندر میں موجود لانچ تک پہنچ گیا جو ساحل سمندر سے قریباً چار پانچ کلو میٹر کی دوری پہ ڈالوں ذرا پانی میں انجن بند کیے کھڑی تھی۔ اس مضبوط لانچ کے کپتان کو جیسے ہی "گو اہیڈ" سگنل ملا اس نے انجن روم کو پیغام منتقل کر دیا۔

اچانک ہی لانچ کے طاقتور انجن جاگے اور وہ پانیوں پہ تیرتی ہوئی تیزی سے ساحل کی طرف بڑھنے لگی۔ اندھیرے کی چادر کو چیرتی لانچ کے صرف انجن ایسے تھے جن کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اتنے گہرے اندھیرے میں بھی اس کے عملے نے تمام لائٹیں آف کر دی تھیں۔

○

لسانی تنظیم کے ایک صوبائی وزیر کو "مرکز" کی طرف سے اپنے محکمے کی ایک سرکاری ویگن کو کسی بھی ہنگامی حکم پر روانگی کے لیے تیار رکھنے کی ہدایت دے دی گئی تھی اور ان کی ہدایت پر لسانی تنظیم ہی کے اسی محکمے میں ایک آفیسر نے اپنے بیٹے کی شادی کی درخواست دے کر محکمے سے ایک کے لیے ویگن مستعار مانگی تھی جو اُسے وزیر صاحب کا "چہیتا آفیسر" ہونے کے فوری طور پہ جاری ہو گئی۔

یہ آفیسر جو سرکاری ملازم تو برائے نام لیکن بابا صاحب کا غلام بطورِ خاص دوپہر ہی سے ویگن لے کر اپنے گھر کی طرف چل دیا تھا۔ اُس کا گھر ساحل سے کچھ فاصلے پہ ایک جدید رہائشی کالونی میں واقع تھا۔

اس کے گھر پہ پہلے ہی سے تنظیم کے تین نوجوان موجود تھے۔ گھر پہنچتے ہی اس نے ویگن کی چابی ان نوجوانوں کے سرغنہ کو تھما دی اور خود اطمینان سے لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔

شام ڈھلنے کے بعد جب اُسے اپنے "سیلولر فون" پر اگلی ہدایت ملی تو اُس نے لاؤنج میں موجود نوجوانوں تک وہ ہدایت "بابا صاحب کے حکم" کی صورت میں منتقل کر دی۔

اس حکم میں اس جگہ کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں سے اُنہیں "مال" موصول کر کے پرویز بھائی کے ہاں پہنچانا تھا۔

اس مال کی نوعیت کیا تھی؟

اسے کہاں سے لایا جا رہا تھا؟

لانے والے کون تھے؟

اُن کے ذہنوں میں اس طرح کے سوالات ہی پیدا نہیں ہوتے تھے۔
تربیت ہی اس بات کی دی گئی تھی کہ جو حکم ملے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے
اس پر عمل کرنا ہے خواہ اس راستے میں موت ہی آجائے۔

یہ تینوں بھارتی انٹیلی جنس کے مختلف کیمپوں میں تربیت حاصل کر چکے
تھے اور کسی بھی طرح کے ہنگامی حالات سے نمٹنے کا تجربہ بھی رکھتے تھے۔ تنظیم کی طرف
سے ان لوگوں کو نہایت اہم مشن پر ہی روانہ کیا جاتا تھا اور انہیں عام کارکنوں
سے بھی دور ہی رہنے کی ہدایت کی جاتی تھی۔

ان لوگوں کو صرف "کوڈ" بتایا گیا تھا۔۔۔!

"یہ کوڈ" وہ سوال کے جواب میں بتاتے جو مال لانے والوں پر اُن کی
"شناخت" "آشکار" کرتا جس کے بعد بند پیٹیوں میں موجود "مال" اُن کی ویگن
میں لوڈ کرایا جاتا اور وہ ویگن کو مال سمیت پہ دیز بھائی کے پہلے سے طے کردہ
اڈے پر پہنچا کر اپنی راہ لیتے۔

اس سلسلے میں تنظیم کے مجرمانہ ذہن اتنی احتیاط کرتے تھے کہ ان تینوں میں
سے کسی کو دوسرے کے صحیح نام کا بھی علم نہیں تھا۔

ان تینوں کا تعلق اس صوبے کے تین مختلف شہروں سے تھا اور انہیں
خصوصی مشن کے لیے بطورِ خاص اکٹھا کیا جاتا تھا۔ انہیں سختی سے اس بات کی
ہدایت کی جاتی تھی کہ اپنی شناخت سے ایک دوسرے کو باخبر نہ ہونے دیں۔
وہ خود بھی جانتے تھے کہ رازداری ہی میں اُن کی بقا کا راز مضمر ہے
انہوں نے ابھی تک ایک دوسرے کو سوائے اپنے جعلی ناموں کے اور
کچھ نہیں بتایا تھا اور اب وہ ساحل سمندر کے کنارے اس مقام تک پہنچ گئے تھے
جہاں رُک کر انہیں مال کا انتظار کرنا تھا۔

انہیں وہاں پہنچے بمشکل چند منٹ ہی گزرے تھے جب سمندر کی طرف
لانچ کے انجن کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اُن میں سے ایک نے
پاس موجود نائٹ ویژن (رات کے اندھیرے میں دیکھنے والی دوربین) سے
کی طرف دیکھا اور مطمئن ہو کر گردن ہلا دی۔

اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارے سے چوکس رہنے
ایت کر دی تھی۔ اُس کے دونوں ساتھیوں کے پاس "براؤننگ پسٹل" موجود
انہوں نے پسٹل فائرنگ پوزیشن میں کیے اور اُن ٹیلوں کی اوٹ میں
یشنیں سنبھال لیں جن کے ایک طرف انہوں نے اپنی ویگن کو چھپایا تھا۔
شاید یہ جگہ تنظیم نے بطورِ خاص ایسے کاموں کے لیے مختص کی تھی، کیونکہ
سمندر کے کنارے موجود پتھریلی پہاڑیوں میں ویگن کو چھپانے کے لیے خاص جگہ
تھی۔ اور اچانک کوئی مصیبت آجانے کی صورت میں یہاں چھپ کر دفاع کرنا
حد تک ممکن تھا۔

اُن کا تیسرا ساتھی ساحل کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔

لانچ کے انجنوں کی آواز اب بڑھنے لگی تھی پھر اندھیرے میں وہ سمندر
نے پر ایک ہیولے کی طرح نمایاں ہونے لگی۔

ساحل سمندر پر موجود نوجوانوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ سے تین
رنگوں کی روشنیاں وقفے وقفے سے جلا کر آنے والوں کو اپنی موجودگی اور
نے کا سگنل دیا اور خود ایک ٹیلے کے پیچھے پسٹل تھام کر بیٹھ گیا۔
لانچ آہستہ آہستہ اس جگہ پہنچ رہی تھی۔
اب اُسے لانچ کے اگلے حصے میں کھڑا وہ شخص بھی دکھائی دینے لگا تھا جو
رح ٹارچ سے مختلف رنگوں کی روشنیاں منعکس کر رہا تھا۔

لانچ کے انجن بند ہو گئے تھے اور وہ کنارے سے آ لگی تھی۔ تین چار سائے بڑی تیزی سے لانچ سے چھلانگیں لگا کر باہر آئے اور تیرتے ہوئے کنارے پر پہنچ گئے۔

لانچ وہیں لنگر انداز ہو گئی۔

ویگن والا نوجوان اب ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان سب نے ایک دوسرے کی طرف پستول تان رکھے تھے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک انہوں نے آپس میں "کوڈ ورڈز" کا تبادلہ کرنے کے بعد اس بات کا اطمینان نہیں کر لیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔

ایک دوسرے کی شناخت سے مطمئن ہونے کے بعد اس کے دونوں ساتھی بھی ایک مخصوص اشارے پر وہاں پہنچ گئے۔

اب ان سب لوگوں نے مل کر لانچ سے لکڑی کی بڑی بڑی مضبوط پیٹیاں اتارنی اور ویگن میں منتقل کرنی شروع کر دیں۔ بمشکل پندرہ منٹ میں انہوں نے لانچ پر موجود پیٹیاں جن میں انتہائی خطرناک آتشیں اسلحہ اور تخریب کاری کا سامان بند تھا ویگن میں منتقل کر دیں اور اپنی اپنی راہ لی۔

ویگن اپنی منزل کی طرف گامزن تھی جبکہ لانچ دوبارہ کھلے سمندر میں واپس جا رہی تھی اس میں سوار لسانی تنظیم کے دہشت گردوں نے اب لانچ کی بتیاں بھی روشن کر لی تھیں اور بڑے بڑے مچھلی پکڑنے کے جال بھی اس پر پھیلا دیئے تھے۔ اس لانچ پر پہلے ہی سے شکار کردہ مچھلیاں موجود تھیں اور اب بادی النظر میں بھی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ماہی گیروں کی لانچ ہے جو سمندر سے مچھلیاں شکار کرنے کے بعد اب رات گئے اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے ہیں۔

دوسری طرف ویگن اسلحے سمیت ساحل سمندر پر موجود ایک اولڈ ٹاؤن آباد

ایک بنگلے میں پہنچ گئی تھی۔ جہاں لسانی تنظیم کے غنڈے اس کے منتظر تھے انہوں نے پلک جھپکتے مال وصول کر لیا۔

ویگن میں سوار دو دہشت گرد یہاں اتر گئے جبکہ تیسرا ویگن اس سرکاری کوٹھی کی طرف لے گیا جہاں سے اس نے ویگن وصول کی تھی۔ سرکاری آفیسر پہلے سے ان کی بحفاظت واپسی کا منتظر تھا۔ اس نے ویگن دیکھ کر سکھ کا لمبا سانس لیا اور اپنے گھر کے لاؤنج میں ویگن کھڑی کر لی۔

تیسرے دہشت گرد کو اس نے ایک کار کی چابی تھما دی تھی جس پر سفر کر کے یہاں تک آیا تھا اور اب اسی پر سفر کرتا اطمینان سے واپس جا رہا تھا۔ اس کے باقی دونوں ساتھی بھی اسی طرح الگ الگ گاڑیوں میں اپنے محفوظ ٹھکانوں پر پہنچ گئے تھے۔ تینوں کو اس کام کا خطیر معاوضہ پہلے ہی سے مل چکا تھا۔ ان کے محفوظ ٹھکانوں پر شراب اور شباب "بونس" کی صورت میں الگ سے ان کے لیے فراہم کر دیا گیا تھا۔

آستین کے سانپ

انسپکٹر فیروز نے ایس پی صاحب کی بتائی ہوئی بستی سے کچھ فاصلے پر ک
اپنی جیپ کھڑی کر کے اُس کی لائٹس آف کر دی تھیں اور اب وہ جیپ سے
اُتر کر رات کے اندھیرے میں دیکھنے والی طاقتور دُور بین کے ذریعے صورتِ حال
کا جائزہ لے رہا تھا ۔۔۔!!

اچانک ہی اس کی نظریں وہاں سے کچھ فاصلے پر موجود ایک لانچ پر فوکس
ہو گئیں ۔

یہ لانچ اُسے مشتبہ دکھائی دے رہی تھی ۔۔۔!!

عموماً رات کے اس پہر اس علاقے سے کوئی لانچ نہ تو کہیں آتی تھی اور
نہ ہی کہیں جاتی تھی ۔

"ضرور دال میں کچھ کالا ہے" ۔۔۔ اُس نے اپنے ساتھی کے کان میں سرگوشی کی

"سر! انہیں پکڑتے ہیں" ۔۔۔ اُس کے نائب نے کہا ۔

"نہیں ۔۔۔ ذرا ٹھہرو ۔۔۔ میں پہلے "ریکی" کر کے دیکھ لوں ۔ میرا سگنل ملنے
پر ہی تم کارروائی کرنا"

انسپکٹر فیروز نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا ۔

"آل رائٹ سر ۔۔۔!"

اس کے ساتھی اب جیپ سے باہر آ کر اپنی اپنی گنیں سیدھی کرنے لگے تھے ۔
انسپکٹر فیروز نے حسبِ ہدایت پہلے اپنی گاڑی کے وائرلیس ریڈیو سے ایس پی
کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ پہلے "ریکی" کر کے صورتِ حال
کا جائزہ لینے جا رہا ہے ۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ اُن لوگوں کے پاس اسلحہ زیادہ تعداد
میں ہو اور لینے کے دینے پڑ جائیں لہٰذا بھی اُن کی تربیت کا تقاضا یہی تھا
کہ ان کی طاقت کا اندازہ کرنے کے بعد ہی ان کے خلاف مناسب کارروائی
کی جائے ۔

"ویل ڈن ۔۔۔ شاباش جوان ۔ پہلے تم "ریکی" کرو اور مجھے رپورٹ دو کہ
ان کی نوعیت کیا ہے ۔۔۔ اگر صورتِ حال خراب ہو تو میں اس علاقے میں
تمام "سیکورٹی" سے مدد کی درخواست کرتا ہوں ۔۔۔ دیکھو آفیسر میرے لیے
تم اور دوسرے جوانوں کی جان بہت قیمتی ہے ۔۔۔ اپنی جان کو بلاوجہ
خطرے میں مت ڈالنا ۔ ناؤ گو آہیڈ ۔۔۔ میں تمہارے اگلے پیغام کا منتظر ہوں"
یہ کہہ کر اُس نے وائرلیس کا رابطہ ختم کیا اور اسی طرح اپنے کمرے میں
چلا گیا ۔

ایک مرتبہ پھر اس نے فون کر کے اپنے کسی "دوست" کی خیریت دریافت
کرنے کے بعد فوراً "کسی" ماہرِ امراض سے مشورے" کا سبق دے کر فون بند کر کے
ڈرائنگ روم میں آ گیا ۔

[...] تنظیم کے بھارتی انٹیلی جنس کے تربیت یافتہ تخریب کاروں نے
[...] بڑی ہوشیاری سے سٹیج کیا تھا ۔

[...] لوگوں نے ملک اختر سے صرف ایک ہی مرتبہ اس نوعیت کی "وطن
دشمنی" کروائی تھی کہ اسی ایک مہم کی کامیابی پر اکتفا کر کے بیٹھ رہتے ۔ انہوں

نے کچھ ایسا تاثر پیدا کرنا تھا کہ یہ ڈرامہ کا روپ دھار لے اور ملک اختر
اپنے وطن سے غداری کی تہمت اٹھا اپنے محکمے والوں کی نظر میں معتبر بھی ٹھہرے
یہ لانچ یہاں اسی مقصد کے لیے رکھی گئی تھی۔

جیسے ہی ملک اختر کی طرف سے یہ فون ملا دوسرے ہی لمحے لانچ پر
دہشت گردوں کو "فرار اور فائرنگ" کا پیغام دے دیا تھا۔

انسپکٹر فیروز ابھی کچھ دور ہی تھا جب اُس نے لانچ کے انجن سٹارٹ
کی آواز سُنی۔ اب کچھ کرنے کا لمحہ تھا ـــــ وہ سوچنے میں وقت ضائع نہیں کر
چاہتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ واپس اپنے ساتھیوں کی طرف بھاگا اور
جیپ میں بیٹھنے کا حکم دیا۔

"سر! انہیں شاید شک ہو گیا ہے۔ ہم انہیں للکارنے جا رہے ہیں۔"
اُس نے وائرلیس پر ایس پی صاحب کو پیغام دیا۔

"شاباش جانے نہ پائیں۔ پکڑو انہیں۔ میں مدد روانہ کرتا ہوں ـــــ خود
آ رہا ہوں ـــــ" آؤٹ "

ملک اختر نے رابطہ منقطع کیا اور فوراً اپنے جوانوں کو آپریشن کا سگنل
کر تیزی سے اپنا پستول سنبھالتا باہر لپکا۔

اُس کے ماتحت اپنے افسرِ اعلیٰ کی اس فرض شناسی پر دل ہی دل میں
معترف ہو رہے تھے کہ وہ کسی کی مدد حاصل کرنے کے بجائے خود اپنے جوانوں
کی مدد کے لیے جا رہا تھا۔ پہلے سے تیار دونوں جیپیں برق رفتاری سے
سمندر کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ ملک اختر نے جیپ میں بیٹھتے ہی وائرلیس
ذریعے ساحل سمندر کے اس حصے میں سرگرم عمل سیکورٹی ایجنسیوں سے اپنے
کی مدد کا پیغام بھی نشر کر دیا تھا۔

نے جواب میں بتایا گیا کہ آدھے گھنٹے سے پہلے اُن کے لیے مدد پہنچنا ممکن نہیں
علاقے میں اس نوعیت کی کوئی واردات آج تک نہیں ہوئی تھی اور حسنِ اتفاق
کوئی مدد بھی میسر نہیں تھی۔

انسپکٹر فیروز نے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اپنے ساتھیوں کو لانچ سواروں
کا حکم دیا تھا۔ وہ لوگ اپنی جیپ بڑی برق رفتاری سے بھگاتے ہوئے
جا رہے تھے۔

ـــــ

اُن کے لانچ کے نزدیک پہنچنے تک لانچ ان کی دسترس سے باہر ہو گئی تھی۔
نے ساحل سمندر کی طرف بھاگتے ہوئے اس پر اپنی رائفل سے گولیاں برسائیں
لانچ سواروں نے بھی ساحل کی طرف گولیوں کی بارش کر دی۔

جب تک اس کے ساتھی ملک اختر کی مدد کو پہنچتے لانچ گولیوں کی رینج سے
اب وہ سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جس جگہ لانچ
وہاں ڈبوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان ڈبوں میں غیر ملکی سستی اشیاء
ساماں، ٹرانسسٹر ریڈیو وغیرہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔

ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے تخریب کاروں نے جان بوجھ کر
ہزار روپے کی اشیاء چھوڑ دی تھیں۔

اثنا میں ایس پی صاحب بھی موقعۂ واردات پر پہنچ گئے تھے۔ خدا جانے کس
والوں کو اس واقعے کی خبر کر دی تھی۔ کیونکہ ان کی آمد کے قریباً ایک گھنٹہ
لوگ بھی اپنے کیمروں سمیت وہاں موجود تھے۔

○

دوران مختلف ایجنسیوں کے اعلیٰ افسران اور ذمہ داروں کی آمد کا سلسلہ

بھی شروع ہو گیا تھا۔ ملک اختر نے اخبار نویسوں کو گردن پھُلا کر لمبی اس کارروائی
کی تفصیلات بتائیں اور اگلے روز اخبارات میں اس کی پریس کانفرنس کرتے ہوئے
تصاویر کے ساتھ یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ سمندری راستے سے غیر ملکی اشیاء کی سمگلنگ
کرنے والی ایک لانچ پر اس کے جوانوں نے انتہائی خفیہ ذرائع سے ملنے والی اطلاع
پر چھاپہ مارا اور ہزاروں روپے مالیت کا غیر ملکی سامان قبضے میں لے لیا۔

لیکن ——

سمگلر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

خس کم جہاں پاک ——

سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی بچ گئی۔

اُس سے اگلے روز جب ملک اختر کے دروازے پر دستک ہوئی تو مینا کشی
اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ وہاں موجود تھی۔

نوٹوں سے بھرا بریف کیس اور سامان عیش و عشرت اس کے پہلو میں موجود تھا۔
ملک اختر کو اس کے ضمیر کی اتنی زیادہ قیمت چکا دی گئی تھی جس کا وہ تصور بھی
نہ کر سکے۔ اگر اُس کے نزدیک بظاہر اتنے معمولی سے کام کی اتنی زیادہ قیمت تھی
تو وہ ہزار مرتبہ ایسا گھناؤنا اور ملک دشمن کارنامہ انجام دینے کو تیار تھا۔

اس رات مینا کشی نے ملک اختر پر عیش و نشاط کے ایسے ایسے بند دروازے
وا کیے کہ اُسے مبہوت کر کے رکھ دیا۔

وہ "را" کی تربیت یافتہ داشتہ تھی۔

اُسے بتایا گیا تھا کہ مرد کی سب سے بڑی کمزوری بہر حال عورت ہی ہے
اور ایک عورت کی حیثیت میں وہ مرد کو کس کس ادا سے مات دے سکتی تھی۔
یہی وہ خصوصی گیان تھا جو اُسے بہم پہنچایا گیا۔

بے حیائی اور جنسی بے راہروی سے متعلق کوئی بھی ایسا گھٹیا تصور جو ملک اختر
کے ذہن میں رہا ہوگا مینا کشی اسے حقیقت کا رنگ دے چکی تھی۔

صبح جب وہ اپنے آفس کی طرف جا رہا تھا اس کے دل و دماغ پر مینا کشی
چھائی ہوئی تھی۔

○

گل شیر کو جب افسر اعلیٰ کی طرف سے اس نوعیت کی پرائیوٹ ملاقات
کا پیغام ملا تو ایک مرتبہ اس کا ماتھا ٹھنکا۔

لیکن ——

اُسے اطمینان تھا کہ کم از کم اس کی جواب طلبی کا کوئی جواز موجود نہیں۔ افسر
اعلیٰ نے جو حال ہی میں یہاں آئے تھے اب تک جو کام کیے تھے انہوں نے گل شیر
کی نظروں میں ان کے لیے بہت عزت پیدا کر لی تھی۔ یہ آفیسر نوجوان بلا کا ذہین تھا۔
اس نے چند ہفتوں ہی میں لسانی تنظیم کو پسپا کر کے رکھ دیا تھا اور اس کی وطن دشمن
سرگرمیوں کے راستے میں آہنی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

آخر اُسے ہی کیوں اس خصوصی ملاقات کے لیے طلب کیا گیا ہے؟

اس سوال نے اُسے پریشان کر دیا تھا اور کوئی ڈھنگ کا جواب اُسے سوجھ نہیں
رہا تھا۔ بالآخر اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔
وقت مقررہ پر اس ہوٹل میں پہنچ گیا جس کا ایک کمرہ افسر اعلیٰ نے اس خصوصی
ملاقات کے لیے ہی شاید بک کروایا تھا۔

افسر اعلیٰ صاحب اُس کے استقبال کے لیے کمرے میں موجود تھے۔
انہوں نے گل شیر کے آتے ہی اس کے لیے چائے منگوائی اور اس سے پہلے معمول
کی گفتگو کرنے کے بعد دو روز پہلے ملک اختر کی ایجنسی کی طرف سے انجام پانے

والے" کارنامے" پر بات شروع کر دی۔

"تمہارے خیال میں کیا واقعہ یہی تھا جو بتایا جا رہا ہے ؟"

افسرِ اعلیٰ کے اچانک سوال نے اُسے چونکا دیا۔

"مَیں سمجھا نہیں سر!"۔۔۔ وہ اس کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"دیکھو گل شیر خان میری اطلاعات کے مطابق تم میرے ماتحتوں میں سب سے زیادہ محبِ وطن ہو۔ ملک کے جو حالات ہیں جس طرح کی بیرونی مداخلت ہو رہی ہے اور جس طرح غداروں کو سیاسی داؤ پیچ لگا کر حُبّ الوطنی کا لبادہ اوڑھا یا جا رہا ہے تم سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ ان حالات میں گو کہ ہماری تربیت کا تقاضا یہی ہے کہ کان لپیٹ کر خاموش ہو کر بیٹھ جائیں اور تماشہ دیکھتے رہیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے چائے کا گھونٹ حلق میں انڈیلا اور گل شیر خان کے چہرے پر نظر دوڑا کر اندازہ کر لیا کہ انہوں نے صحیح آدمی کا انتخاب کیا ہے۔

"مَیں نے اپنے ذرائع سے اس بات کا پتہ لگایا ہے کہ جس علاقے میں یہ واردات ہوئی وہاں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس لانچ سے سمگلنگ کا سامان اتارا جا رہا تھا تو اُسے وصول کرنے والے بھی تو ہونے چاہئیں۔ حیرت کی بات ہے کہ سمگلر لانچ سے مال اُتار کر سمندر کنارے جمع کرتے رہے تاکہ پولیس آئے اور اسے اُٹھا کر لے جائے۔ اس مال کو وصول کرنے کے لیے کوئی وہاں کیوں نہیں آیا؟ اور یہ بات تو کوئی عقل کا اندھا بھی جانتا ہے کہ جب تک دوسری پارٹی نہ آ جائے یہ لوگ پاگل تو نہیں تھے کہ مال اتارنا شروع کر دیتے۔۔۔ انتہائی کوشش کے باوجود مجھے ابھی تک دوسری کسی پارٹی کی موجودگی کا ثبوت نہیں مل سکا نہ ہی اس بات کا علم ہو سکا کہ یہ مال آخر کس کے لیے لایا جا رہا تھا۔ جہاں تک مَیں نے سوچ بچار کی اس کے بعد مَیں تو اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ یہ کوئی دھوکے کی چال تھی

...موک سکرین کی آڑ میں کوئی اور گھناؤنا کھیل کھیلا گیا ہے۔ کال سے سگریٹ اور ...سکے ڈبوں کے لیے وہ لوگ اپنی جان کیوں جوکھوں میں ڈالیں گے۔۔۔ مجھے ...یوں لگتا ہے جیسے ملک اختر کی ایجنسی کے لوگوں کو غلط اطلاع دے کر وہاں ...ہٹا یا گیا تاکہ میدان خالی ہو اور وہاں کوئی کارروائی کی جائے جس کے بعد۔۔"

فقرہ اُدھورا چھوڑ کر اُس نے ایک مرتبہ پھر گل شیر کے چہرے پر نظریں ٹکا دیں۔

"سر! میں آپ کی بات کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں۔ مَیں نے اس علاقے میں کچھ ...ڈیوٹی کی ہے اور مَیں جانتا ہوں کہ کم از کم اس پوائنٹ پر اس سے پہلے ...کوئی واقعہ پیش نہیں آیا نہ ہی کوئی لانچ نیوی کی آنکھوں سے بچ کر اس ...نے میں داخل ہو سکتی ہے۔۔۔ لیکن حالات کا مکمل علم نہ ہونے کے سبب ...میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔"

اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

اپنے ذہن میں یہ مفروضہ قائم کر لینے کے بعد کہ یہ کسی سازش کا حصہ ہے ...نے اس لائن پہ سوچنا شروع کیا کہ اس سموک سکرین کی آڑ میں آخر کون سا ...کھیلا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دو رپورٹیں بڑی اہم ہیں۔۔۔ یہ واقعہ ...تاریخ کو پیش آیا اور ۱۰ تاریخ کو ہماری یونیورسٹی کے ذریعے نے اطلاع ...کہ لسانی تنظیم کے طلبا ونگ کے پاس خطرناک اسلحے کی نئی کھیپ پہنچ گئی ہے۔ ...تاریخ کی رات کو ریگل سینما کے باہر سفید کار سے ہونے والی فائرنگ میں جو ...اسلحہ استعمال ہُوا وہ پہلی مرتبہ متعارف کروایا گیا ہے۔ گولیوں کے خالی خول جو ...نے اکٹھے کیے وہ تمام بھارت کے ساختہ ہیں کیونکہ اس نوعیت کی گولیاں ہمارے ...ملک کوئی نہیں بناتا۔۔۔ جس کے بعد مَیں نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ ...۱۸ تاریخ کی رات کو اسلحے کی تازہ کھیپ سمندر کے راستے یہاں پہنچانے

کے لیے اُن لوگوں نے ملک اختر کے آدمیوں کو وہاں سے ہٹا دیا اور میدان خالی کروانے کے بعد اپنا کام کر گزرے۔"

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

○

گل شیر حیرت سے اپنے افسرِ اعلیٰ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسے ذہین اور محبِ وطن لوگ بھی اس ملک میں موجود ہیں ـــــ اُس نے دل ہی دل میں نجانے کتنی مرتبہ اپنے افسرِ اعلیٰ کو داد دی۔

"دوسری رپورٹ جو بظاہر تو اس معاملے سے الگ نظر آتی تھی لیکن جب میں نے کڑی سے کڑی ملا کر زنجیر بنانی شروع کی تو اس رپورٹ نے بھی میرے خدشات کی تصدیق کر دی۔ انسپکٹر چوہدری پرویز بھائی پہ کام کر رہا ہے۔ اس نے پیرز کی ساحل سمندر والی کوٹھی جس میں اس کی داشتہ رہتی ہے اور بظاہر یہ کوٹھی بھی اُس نے اپنی داشتہ کی ماں کے نام پہ خریدی ہوئی ہے میں رات کے دوسرے پہر سرکاری محکمے کی ایک ویگن کو داخل ہوتے اور کچھ دیر بعد وہاں سے نکلتے بھی دیکھا۔ یہ ویگن لسانی تنظیم کے وزیر صاحب کے محکمے کی تھی جن کے متعلق ہم سب جانتے ہیں کہ وہ اپنے محکمے کی کم اور لسانی تنظیم کی زیادہ خدمت کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ ایک لمبے عرصے سے جاری ہے ـــــ انسپکٹر چوہدری کی رپورٹ کا سب سے اہم حصہ یہ ہے کہ اس کوٹھی سے اس نے ویگن کی روانگی کے کچھ دیر بعد مٹھو میاں کو بھی ایک کار میں جاتے دیکھا ـــــ جبکہ حیدر آباد سے اس کی یہاں آمد کو بالکل خفیہ رکھا گیا تھا اور وہ راتوں رات حیدر آباد واپس بھی پہنچ گیا۔ اس رپورٹ کے مطابق مٹھو میاں بھیس اور نام بدل کر اس شہر میں آیا تھا کیونکہ رات کو حیدر آباد جانے والی جتنی گاڑیاں چیک ہوتی ہیں اُن میں اس نام کا کوئی

موجود نہیں تھا۔ انسپکٹر چوہدری چونکہ حیدر آباد پوسٹنگ پر رہا ہے اور مٹھو میاں کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اس کی نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتیں ـــــ اس کا مطلب یہی ہے کہ دال میں ضرور کالا ہے۔"

گل شیر خان کو بھی اب اچھی خاصی سمجھ آنے لگی تھی۔

واقعی بڑی خطرناک سازش تھی جس کی آڑ میں یہ گھناؤنا کھیل رچایا گیا۔

"اب واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے کے بعد میرے ذہن نے یہ مفروضہ قائم کیا ہے جسے میں بہت حد تک صحیح بھی جاننے لگا ہوں کہ دراصل سمگلروں کی لانچ "دھوکے کی چال" بنایا گیا اور اس چکر میں اسلحہ کی کھیپ لسانی تنظیم نے حاصل کر لی ہے اب تمہارا ذہن کیا کہتا ہے کہ اس سارے کھیل میں مرکزی کردار کس نے ادا کیا۔"

افسرِ اعلیٰ نے اپنی بات مکمل کر کے اچانک سوال کر کے اُسے بوکھلا دیا۔

"سر! میرے خیال سے اس شخص کا کردار سب سے زیادہ اہم اور مشتبہ ہے جس نے کچھ دیر کے لیے گشتی پارٹی کو اپنی جگہ سے ہٹایا اور اس کا دھیان لانچ کی طرف منتقل کر دیا۔"

اس نے ایک نتیجے پہ پہنچتے ہوئے کہا۔

"شاباش جوان! شاباش! اور تم جانتے ہو وہ شخص کون تھا۔"

"نہیں سر! میں کیا جان سکتا ہوں۔"

"وہ ملک اختر ایس پی ہے۔ جس نے خلافِ توقع، خلافِ عادت اور خلافِ معمول اچانک کارکردگی دکھانے کا ڈرامہ رچایا اور اس سارے آپریشن کے دوران اُسی کے حکم پہ انسپکٹر فیروز نے اپنی جگہ چھوڑی۔"

"میرے خدایا...!"

بے اختیار گل شیر خان کے منہ سے نکلا۔

"صرف دو دنوں کی انکوائری نے مجھے بتایا ہے کہ یہ شخص پہلے درجے کا شرابی اور عیاش ہے۔ اس کا باپ بھی کوئی نیک نام افسر نہیں اور اس شہر میں جس تیزی سے اس نے دولت کے انبار لگائے ہیں اُس نے تو مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

بالآخر افسرِ اعلیٰ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"آپ کی سوچ بالکل درست ہے جناب۔"

گل شیر نے نعرہ تحسین بلند کیا۔

"میرے نزدیک تم سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہو ــــ اپنے سورس کو ایکٹو کر دو اور پتہ لگاؤ کہ ملک اختر سے تنظیم کے کن لوگوں کا ملنا جلنا ہے اور تم خود اُس کی شام کے بعد کی سرگرمیوں پر نظر رکھو۔ مجھے ان لڑکیوں کی فہرست چاہیے جو اس سے اکثر ملتی ہیں۔ میرا دل کہتا ہے اگر وہ تنظیم کے جال میں پھنس چکا ہے تو یہ جال انہی لڑکیوں کے ذریعے اس پر پھینکا گیا ہوگا۔ میں جانتا ہوں وہ عورتوں کے معاملے میں بہت کمزور واقع ہُوا ہے ــــ"

افسرِ اعلیٰ نے اس پہ ساری بات کھول دی۔

"ٹھیک ہے سر!"

"اور ہاں اب سب سے اہم بات بھی سُن لو۔ فی الوقت تم جو بھی کرو گے وہ "آف دی ریکارڈ" ہے کیونکہ اس طرح کسی سرکاری افسر کی ہم اپنی حیثیت میں سرگرمیاں چیک نہیں کر سکتے اس کے لیے ہمیں ہیڈ کوارٹر سے اجازت لینی ہوتی ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی مرحلے پر یہ بات ہاتھ سے نکل جائے ــــ گل شیر خان ذاتی حیثیت میں تم مجھے ہمیشہ اپنے بھائیوں کی طرح پاؤ گے۔ اگر ہم نے وطن دشمنوں کے

ن کا مداوائی کرنے کے لیے اربابِ بست وکشاد کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تو یہی رکھو کہ اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ گل شیر خان ہمیں پاکستان کی حفاظت کرنی ہے اس کے دشمنوں کو نیست و نابود کرنا ہے کسی بھی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر۔ ہمارا ایمان ہے اور میں اس پر مرتے دم تک قائم رہوں گا۔ میں کسی ملک دشمن کو محض اس لیے حبّ الوطنی کا سرٹیفکیٹ نہیں دے سکتا کہ مصلحت اس کا تقاضا کرتی ہے۔"

انھوں نے دل کی بات زبان پہ لاتے ہوئے کہا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ گل شیر کو اپنی طرح کے ایک پاکستانی آفیسر سے واسطہ پڑا تھا۔ اس کے جذبات کا عجیب عالم تھا۔

"سر! آپ مجھے کبھی پیچھے نہیں پائیں گے۔ اس راستے میں اگر موت بھی آ جائے تو میرے نزدیک یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔"

"میرے خیال سے اس موضوع پہ اور گفتگو کرنا تو مناسب نہیں ہوگا ــــ خدا حافظ ــــ"

انھوں نے گل شیر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"خدا حافظ سر!"

گل شیر نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے دبایا اور جس طرح خاموشی سے یہاں آیا تھا اسی طرح چُپ چاپ واپس لوٹ گیا۔

اس کی ذمہ داریوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ افسرِ اعلیٰ نے اس پہ اعتماد کر کے اس کا حوصلہ کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

○

پرویز بھائی کی اس طرح آمد کوئی پہلی مرتبہ تو نہیں ہوئی تھی۔

لیکن ——

آج جس طرح اچانک وہ اس کے کمرے میں گھسا تھا یہ حرکت وزیر صاحب کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ سب کی نظروں سے چھپ کر اس ریسٹ ہاؤس [illegible] دینے کے لیے آئے تھے۔ انہیں اس بات کی امید نہیں تھی کہ پرویز بھائی یہاں بھی منہ اُٹھائے چلا آئے گا۔"

اس نے وزیر صاحب کے ایک محافظ کو جس نے پرویز بھائی کو روکنے کی کوشش کی تھی تھپڑ رسید کر دیا تھا۔

یہ محافظ کوئی معمولی سا غنڈہ نہیں تھا۔

تنظیم کا خاص آدمی تھا۔ ایسے لوگوں کو بطورِ خاص لسانی تنظیم کے حکومتی عہدیداروں کی حفاظتی ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں۔ اس طرح ایک طرف تو وہ سرکار کی خدمت کر رہے تھے دوسری طرف وہ اپنے "باس" کے ایک ایک پل کی خبر "باباصاحب" کو دیتے تھے اس طرح اُنہیں ہر وقت اس بات کا احساس رہتا تھا کہ وہ سرکار کے نہیں دراصل باباصاحب کے نوکر ہیں۔

یہ محافظ چاہتا تو پرویز بھائی کو اس سے کئی گنا زیادہ قوت سے اس تھپڑ کا جواب دے سکتا تھا۔

لیکن ——

وہ مجبور تھا ——

وہ پرویز بھائی کی اہمیت سے واقف تھا۔ تنظیم کے اندر کے معاملات اتنے پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ جانتا تھا کہ بنے بھائی کی موت کے بعد سے پرویز بھائی اتنا اونچا اُڑنے لگا ہے کہ اب باباصاحب بھی اس کے پر نہیں کاٹ سکتے تھے۔ پھر اس کی کیا مجال تھی کہ خواہ مخواہ کسی کے پھڈے میں ٹانگ اُڑاتا۔

پرویز بھائی جب اچانک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وزیر صاحب الت میں نہیں تھے کہ کسی کا سامنا کر سکیں۔

وہ جس فاحشہ کے ساتھ رنگ رلیاں منانے میں مصروف تھے وہ اس شہر کی کوئی لی عورت نہیں تھی سرکار دربار میں اچھے خاصے اثر و رسوخ کی مالک تھی یہ ین ناقابلِ برداشت تھی۔

جہاں ایک طرف وزیر صاحب کا دماغ غصہ ضبط کرتے ہوئے پھٹنے کو تھا وہاں دوسری طرف اُن کی ساتھی کی منہ سے بے اختیار مغلظات کا ان اُبل پڑا۔

پرویز بھائی نے سب سے پہلے اُس کا دماغ درست کرنے کا فیصلہ کیا اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ایک زوردار تھپڑ اتنی طاقت سے اس کے پر جڑا کہ بے چاری سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائی۔

بے بسی، غصے اور احساسِ شرمندگی کے ساتھ اس نے روتے ہوئے اپنے بے سنبھالے اور وزیر صاحب کے منہ پر تھوک کر چل دی۔

وزیر صاحب نے دروازے تک اس کی منت سماجت کر کے منانے کی ش کی لیکن اس نے وزیر صاحب کو بے تحاشا گالیاں دینا شروع کر دیں ان راہ لی۔

"پرویز بھائی! آپ کو اس طرح نہیں آنا چاہیے تھا۔"

وزیر نے روہانسی آواز سے کہا۔

"ابے بھڑوے۔ جب تو کوئی کام نہیں کر سکتا تو ہاں کرنے کو کس نے تھا۔ تم نے میری بے عزتی کروا دی۔ تمہارے ہوتے ہوئے تمہارے ملکے ایک ڈائریکٹر کی یہ ہمت ــــ جانتے ہو ڈرگ کی جس فیکٹری پر چھاپہ

پڑا ہے اس میں تمہارا کتنا حصہ ہے۔ ابے ٹٹ پونجیے جب لاکھوں روپے سے
بھرے بریف کیس سنبھالتا ہے تو ان کی فکر بھی کیا کر جو تیرے لیے کما کر لاتے ہیں۔

پرویز بھائی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"دیکھو پرویز بھائی ہر شخص کی برداشت کی بہرحال ایک حد ہوتی ہے۔"

"اگر اپنی خیریت چاہتا ہے تو کل صبح ہونے تک مجھے وہ ڈرائیور اس شہر
میں دکھائی نہیں دینا چاہیے ـــ سمجھے تم ـــ"

یہ کہہ کر پرویز بھائی اس کا جواب سنے بغیر غصے سے اسے دھکا دے
کر باہر نکل گیا۔

بے چارہ وزیر منہ کے بل زمین پر گرا۔

وہ تو خیریت گزری کہ فرش پر موٹے قالین بچھے تھے اور اسے زیادہ چوٹ
نہیں آئی۔ ورنہ شاید اس کی ہڈی پسلی ہی برابر ہو جاتی۔

پرویز بھائی کے باہر نکلتے ہی اس کا باڈی گارڈ اندر گھس آیا۔ اسے اندازہ
ہو چکا تھا کہ اس کے "باس" کے ساتھ کیا گزری ہو گی۔

"سر! یہ زیادتی کی انتہا ہے۔"

اس نے بے بسی سے کہا۔

"میں ابھی بات کرتا ہوں بابا صاحب سے ـــ ابھی چلو ـــ اسی وقت چلو
بابا صاحب کے پاس۔ آج یہ فیصلہ ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ اب ہم دونوں میں سے
ایک رہے گا۔ یا میں یا وہ۔"

غصے کے مارے وزیر صاحب کے منہ سے کوئی ڈھنگ کی بات ہی نہیں
نکل پا رہی تھی۔

"فوراً گاڑی تیار کرو۔"

جیسے ہی باڈی گارڈ کو "باس" کا حکم ملا وہ تیزی سے باہر نکلا اور وزیر
صاحب کے لیے گاڑی تیار کرنے کا حکم ماتحت عملے کو سنا دیا۔

باڈی گارڈ کے لیے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

وہ نہ جانے کب سے اس بات کا منتظر تھا۔ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ
بھی لے سکتا تھا۔

انتقام

بابا صاحب کے لیے وزیرہ کی آمد بڑی بابرکت ثابت ہوئی۔ وہ تو خود جانے کب سے پرویز بھائی پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے اب تو معاملہ ہی حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"میں تمہاری بات سمجھتا ہوں شمس میاں۔ پرویز بھائی کا دماغ کچھ زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے۔ اس کا علاج ناگزیر ہو گیا ہے ـــــ تم ایسا کرو مار ڈالو ـــــ مار دو سالے کتے کے پلّے کو ـــــ ہماری بلّی اور ہمیں کو میاؤں ـــ کل ذرا شوٹنگ کرواؤ ناں شہر میں ـــــ اس چکر میں اس سالے کو بھی مروا دینا ـــ پہنچا دو اسے بھی بڑے بھائی کے پاس ـــ سالا ـــــ"

بابا صاحب کا خونخوار قہقہہ بلند ہوا ـــ!

"ایسا ہی ہو گا بابا صاحب ـــ آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی۔"

وزیرہ کے منحوس چہرے پر سفاک مسکراہٹ جاگی۔

"اور ہاں ـــ یہ کام ذرا بالا بالا ہی کرنا ہو گا ـــ جتنے کم لوگوں کو علم ہو اتنا ہی فائدہ ہے ـــــ سمجھ گئے ناں ـــ"

بابا صاحب نے وزیرہ کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

"سمجھ گیا بابا صاحب! خوب سمجھ گیا ـــــ"

وزیرہ کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔

"اب تم جاؤ ـــ اور جاتے جاتے رخسانہ کو اندر بھیج دینا ـــ"

بابا صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے کہا۔

یہ ان کی خاص ادا تھی جس کا مطلب ہوتا تھا اب وہ کوئی بات نہیں سنیں گے۔

وزیر صاحب نے آگے بڑھ کر اُن کے گھٹنے چھوئے اور اُلٹے قدموں لوٹ گئے۔ انہوں نے ملحقہ کمرے میں رخسانہ تک بابا صاحب کا حکم پہنچا دیا تھا۔

"جی ـــ" رخسانہ نے اندر داخل ہوتے ہی دریافت کیا۔

"ارے اِدھر آؤ ناں ـــــ بہت ناراض لگتی ہو ـــ بھئی کہہ دیا ہے تمہارے بڑے بھائی کا بندوبست ـــــ اِدھر آؤ ناں میری جان"

بابا جان نے اُسے پہلو میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس کے بعد اُن پر ہوس کاری کا دورہ پڑ گیا۔

بابا صاحب عجیب ذہنی مریض تھے۔ جب اُن کے سر پر خون سوار ہوتا وہ درندگی کا مظاہرہ کرنے کی عجیب وغریب صورتیں نکالتے تھے۔

رخسانہ کو بابا صاحب کی کمزوری کا مکمل ادراک تھا۔ وہ بابا صاحب سے انتقام لینے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتی تھی۔ یہ وہی تھی جس نے بابا صاحب کو جنسیت کی دلدل میں اتنا گہرا اُتار دیا تھا کہ اب وہ ہوس کے مارے ننھے منے بچوں کی تنظیم کی ہر قابلِ قبول شکل کی حامل ور کمہ سپہ حلوائی کی دکان اور نانا جی کی فاتحہ کے مصداق چل پڑتے تھے۔

گزشتہ چند مہینوں سے تو انہوں نے اپنی اس جنسی درندگی کو تسکین بہم پہنچانے کے لیے منشیات کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔ اپنے ڈاکٹرز کی اس ہدایت کے

باوجود کران سونے چاندی کے کشتوں سے اُن کے گُردے بھی فیل ہو سکتے ہیں۔ وہ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ایسا کوئی کُشتہ کھانے سے باز نہیں آتے تھے۔

اس چکّر میں انہیں دو مرتبہ ہسپتال کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔ اور اب وہ گُردوں کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔

لیکن ——

اُن کی ہوس رانیاں روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔

اخبارات کے ذریعے یہی خبریں آ رہی تھیں کہ کام کی زیادتی اور مسلسل ذہنی دباؤ نے باباصاحب کے گُردوں کو بھی اثر انداز کرنا شروع کر دیا ہے اور ان کے معتقدین کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

لسانی تنظیم کے معصوم اور گمراہ کارکن جنہیں باباصاحب نے اپنی لچھے دار گفتگو سے اندھا کر رکھا تھا وہ ساون کے اندھوں کی طرح باباصاحب کی ہر سیاہی کو سبز ہی دیکھتے اور سمجھتے تھے —— باباصاحب نے بڑی مکاری سے اُن کی بھولی بھالی آنکھوں پر ایسا چشمہ پہنا دیا تھا جس سے اُنہیں باباصاحب کی درندگی میں بھی انسانیت نظر آتی تھی۔

○

وزیرصاحب کے سامنے شراب کا جام دھرا تھا۔ انہوں نے اپنے اسی باڈی گارڈ کو طلب کیا جس کے منہ پر پرویز نے تھپّڑ رسید کیا تھا۔

" بندوخان —— میں نے کہا تھا ناں کہ اس پرویز کے بچے کا بندوبست کر دو گا —— کر دیا —— باباصاحب کا حکم مل گیا ہے —— باباصاحب کے حکم پر تم اُسے کُتّے کی موت مار ڈالو "

وزیرصاحب نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہم تو باباصاحب کے کُتّے ہیں مالک اور آپ کے بھی غلام ہیں "

بندوخان نے بے شرمی سے دانت نکالے۔

"بس —— بے جاؤ اور تازہ دم ہو کر جانا —— کل ہم ذرا شہر میں آتش بازی کروا دیں اِس درمیان اپنا کام کر گزرنا۔ اور ہاں زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں پسند کرتا باباصاحب —— سمجھ گئے ناں "

وزیرصاحب نے آنکھ دبائی۔

"بالکل سمجھ گیا مالک۔"

اس نے وزیرصاحب کی طرف سے ملنے والی وہسکی کی بوتل تھام لی۔

"یہ ابتدائی اخراجات رکھ لو "

وزیرصاحب نے اتنا کہتے ہوئے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی طرف پھینک دی۔

"جیتے رہو مالک —— خدا کرے آپ چیف منسٹر بن جائیں "

اُدھر باڈی گارڈ نے نوٹوں کی گڈی چوم کر جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ابے گدھے —— پرائم منسٹر کہو —— پرائم منسٹر " وزیرصاحب کو نشہ ہونے لگا —— " اور ہاں ہمارے آرام کا بندوبست کرو —— خبردار اگر صبح ہونے سے پہلے کوئی بھی اس طرف پھٹکا تو۔"

"ایسا ہی ہوگا مالک " —— ایسا ہی ہوگا۔"

بندوخان نے دوسرے کمرے میں جا کر مُنی بائی کا نمبر ملایا اور اپنے باس کے آرام کا فوراً بندوبست کرنے کی ہدایت کی۔

"آدھے گھنٹے میں لڑکی پہنچ جائے گی " —— مُنی بائی نے ایڈریس سمجھتے ہوئے کہا۔

"اتنی دیر مُنی بائی —— " بندوخان کو بن پئے ہی نشہ ہونے لگا تھا۔

"زیادہ جلدی ہے تو اپنے گھر سے بھیج دے نا کسی کو " —— مُنی بائی نے بیزاری سے

طوالفضیری کے انداز میں اُسے گالی دے کر فون بند کر دیا۔

○

وہ دن شہر نگاراں کے لیے قیامت کا دن تھا۔

دوپہر کو یونیورسٹی میں ہونے والے ایک جلسے میں معمولی سی بدنظمی پر ہنگامے
کا آغاز ہوا اور جلد ہی اُس نے آدھے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

یونیورسٹی کے ہوسٹلوں کے باہر موجود سرکاری عملے پر فائرنگ شروع کر دی
گئی۔ دوسری طرف سے بھی جوابی فائرنگ ہونے لگی جس کی زد میں آکر تین بے گناہ
طالب علم مارے گئے۔

ان تینوں "بے گناہوں" کا تعلق مخالف لسانی تنظیم سے تھا جنہیں لسانی تنظیم کے
طلبا ونگ کے غنڈوں نے دو تین روز سے اپنی ناجائز حراست میں رکھا ہوا تھا۔

ان وحشیوں نے درسگاہوں کو عقوبت خانوں میں تبدیل کر دیا تھا اور ہوسٹل کے
کمروں میں اپنے مخالفین کو لا کر اُن پر وحشیانہ تشدد ڈھاتے تھے۔

ان تینوں طالب علموں کو انہوں نے یونیورسٹی کی حدود سے ہی اغوا کیا اور
اپنے ہوسٹل میں رکھ کر ان پر اپنی درندگی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ ان بے چاروں کا
گناہ صرف یہ تھا کہ یہ تینوں دوسرے شہروں سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے
خود کو صرف طالب علم سمجھا تھا۔

وہ یونیورسٹی کی گندی سیاست میں شامل نہیں ہوتے تھے جس کی کم از کم
سزا یہی تھی کہ ان پر مخالف کا لیبل چپکا کر انہیں مار ڈالا جائے۔

کسی نے یہ نہ دیکھا کہ بظاہر پولیس فائرنگ سے ہلاک ہونے والے ان طالب علموں
کے جسموں پر وحشیانہ تشدد کے نشانات موجود تھے۔

کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ پولیس نے انہیں گولی مارنے سے پہلے

اور ان کے جسموں کو گرم استری سے کس طرح داغا۔

اگر انہیں پولیس نے ہی گولیاں ماری تھیں تو ان کے جسموں میں سوراخ
بنے کیسے تھے۔

لسانی تنظیم کے طالب علموں کا لبادہ اپنے چہروں پر اوڑھے ہوئے درندوں
نے اپنے باپا صاحب کی تربیت کے مطابق ظالمانہ اقدامات کیے اور مظلومیت کا
ڈرامہ بھی رچا دیا۔

انہیں اس بات کا علم تھا کہ اخبارات میں ایک لفظ بھی ان کی مرضی کے خلاف
شائع نہیں ہو سکتا۔

کس کی جرأت تھی کہ اُن کی اس انسانیت سوز اور بہیمانہ کارروائی کا پول کھولے۔
انہوں نے یہی تو کام کیا تھا کہ سب سے پہلے پریس پر اپنی گرفت مضبوط کی تھی۔
اور اس شہر سے چھپنے والے ہر قابل ذکر اخبار و رسالے کے مالکوں کو اس بات کا
یقین دلا دیا تھا کہ وہ اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے —— البتہ اگر تنظیم کے لوگ چاہیں تو
ان کا جینا دوبھر کر دیں۔

اور —— انہوں نے ایسا کر کے بھی دکھایا۔

یونیورسٹی سے جیسے ہی ہنگامے کا سگنل ملا —— لسانی تنظیم کے تربیت یافتہ
غنڈے اپنے پہلے سے طے شدہ ٹارگٹ پر چل پڑے۔

انہوں نے بے گناہوں کو گھروں سے نکال کر گولیاں ماریں۔

اُن کا مال اسباب لوٹا۔

اُن کی آنکھوں کے سامنے ان کی عزتوں کا نیلام کیا۔

اُن کے گھروں کو آگ لگائی اور اپنی راہ لی۔

شہر کے بھرے پرے بازاروں میں اچانک سفید رنگ کی کاریں نمودار ہوئیں

جن میں بیٹھے غنڈوں نے کاروں کی کھڑکیوں سے کلاشنکوفیں باہر نکالیں اور بے گناہ اور بے خبر لوگوں پر موت کے دہانے کھول دیے۔

ہر طرف ایک قہر برپا تھا۔

کسی کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ہوا کیا ہے؟

جس کا جدھر منہ اُٹھا اُس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ ان بھاگنے والوں میں پولیس کے وہ بوکھلائے ہوئے سپاہی بھی شامل تھے جنہیں ڈنڈے ہاتھوں میں تھما کر شہر کے مختلف چوراہوں میں کھڑا کیا گیا تھا۔

وہ ان ڈنڈوں سے جدید اسلحے کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے؟

پرویز بھائی کو اس بات کا تو علم تھا کہ آج انہوں نے چند روز پہلے آنے والے اسلحے کی آزمائش نہتے شہریوں پہ گولیاں برسا کر کرنی تھی۔

لیکن ــــ

بارود کو چنگاری دکھلانے والا اس کے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟

یہ بات جہاں اس کے لیے پریشان کن تھی وہاں الارمنگ بھی تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی اُس سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے تو بابا صاحب کو بھی احساس دلا رکھا تھا کہ تخریب کاری میں اُن کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا اور لسانی تنظیم کے غنڈہ ونگ کی سرداری اسی کو زیب دیتا ہے اور یہی اس کی بقا کا راز بھی تھا۔

اگر وہ اپنی دہشت گردی کا تاثر قائم نہ رکھتا تو جس طرح گزشتہ ایک سال سے اُس نے بتے بھائی کے بعد پر پرزے نکالے تھے اور بعض جگہ تنظیم کو خاطر میں لائے بغیر اپنے بل بوتے پر ہی غنڈہ ٹیکس کی وصولی شروع کر دی تھی یہ تو

ب کے اقتدارِ اعلیٰ میں کھلم کھلا مداخلت تھی۔ خدا جانے اب تک بابا صاحب برداشت کیسے کیا تھا؟

نایداُنہیں اپنے غیر ملکی دوستوں سے اس کی اجازت نہ مل رہی ہو؟

ن ہے انہوں نے پرویز بھائی کو ابھی تک اسی لیے ڈھیل دے رکھی تھی۔

ے نزدیک پرویز بھائی ضرورت سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکا تھا اور ہر ضرورت پوری کر رہا ہو "را" کو لسانی تنظیم سے زیادہ اپنے کرائے کے خیریت عزیز تھی۔

ت کچھ بھی رہی ہو پرویز بھائی کو یہ پریشانی ضرور لاحق ہو گئی تھی کہ آخر بابا صاحب نے نئے اسلحے کی نمائش کے لیے اس کے بجائے کسی اور کو لیوں سونپ دی کہ لسانی تنظیم کا کوئی ایسا ضابطہ نہیں تھا جس کے ویز بھائی کی چودھراہٹ مستقل ہو گئی ہو۔

ہا ــــ

ماحب کو یہ کیا سوجھی؟

نے پہلے یہی چاہا کہ بابا صاحب سے براہِ راست بات کرے پھر کچھ پ ہو رہا۔ اس طرح تو وہ خواہ مخواہ دوسروں کو اہمیت دلا دے گا۔

ار اپنے طور پر اس سؤر کا پتہ لگایا جائے جو اُس کی جگہ بڑ کرنے ہے؟

نے سوچا اور "۵۹" پر ایک نمبر گھما دیا۔

نے "۵۹" پر اپنے خصوصی دہشت گرد ونگ سے رابطہ کر کے آج کے نصیل جاننا چاہی۔

ز بھائی! وہ سالا شمسو (وزیر صاحب) اس مرتبہ ہم پر بازی لے گیا۔"

اس کے لونڈوں نے یونیورسٹی سے ابتدا کی تھی۔ پرویز بھائی یہ دوسرا ہاتھ دکھ لیے
اس لیے لڑکے بہت غصے میں ہیں۔"

دوسری طرف سے جواب ملا۔

"ابھی کچھ نہیں کرنا۔ میں مرکز پہنچتا ہوں تم لونڈوں کو اکٹھا کرو ـــ اور ہاں یہ بڑا اہم مسئلہ ہے سمجھ گئے ناں۔ ذرا سوچ سمجھ کر اور اپنے اعتماد کے بندوں کو ہی بلانا ـــ میں اس تھسو کے بچے کا ٹنٹا ہی ختم کردوں گا ـــ اس کی یہ ہمت" ـــ اس نے اتنا کہہ کر غصے سے فون بند کر دیا۔

"گاڑی تیار کرو ـــ"

O

جیسے ہی اس کے منہ سے نکلا دو مسلح باڈی گارڈ پہلے سے تیار گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے پچھلی نشست سنبھالی تھی اور پرویز بھائی اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھے پستول کو چیک کر کے دیکھا۔ پستول لوڈ تھا۔ آج اس کے ساتھیوں نے پہلی مرتبہ پرویز بھائی کو اتنا مضطرب دیکھا تھا۔ عام حالات میں وہ ایسی باتوں کو کبھی خاطر میں نہیں لایا کرتا تھا۔

جس علاقے میں پرویز بھائی رہائش پذیر تھا وہ خاصا ماڈرن اور شہر سے الگ تھلگ علاقہ تھا۔ عموماً اس طرف فسادات نہیں ہوتے تھے یا پھر یہ لسانی تنظیم کی پالیسی تھی کہ وہ اُن علاقوں میں جہاں سے اُسے غنڈہ ٹیکس کی صورت میں بڑی بڑی رقمیں ملا کرتی تھی فسادات نہیں کرواتے تھے۔ اس طرح وہاں کے امیر کبیر رہائشیوں کو یہ تاثر دیا جاتا تھا کہ یہ اُن کی پُرامن زندگی بسر کرنے کی فیس ہے جو لسانی تنظیم اُن سے وقتاً فوقتاً وصول کرتی رہتی ہے۔

پرویز بھائی کے گھر میں تین چار مسلح محافظ ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اس تب بھی جب کہ وہ گھر سے باہر جا رہا تھا اس کے گھر پر لسانی تنظیم کے دہشت گرد [illegible] کے تین نوجوان جدید اسلحے سے لیس موجود تھے۔

اونچی اونچی دیواروں سے بنا یہ جدید بنگلہ جس کی دیواروں پر کانٹے دار تار اور رات کو اُن میں بجلی دوڑا دی جاتی تھی۔ کسی قلعے کا منظر پیش کرتا تھا۔ اس کا آہنی دروازہ اتنا مضبوط تھا کہ عام بندوق کی گولی بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ یہ دروازہ عموماً بند رہا کرتا تھا۔ سوائے پرویز بھائی کے ذاتی محافظوں کی گاڑیوں کے اور کسی گاڑی کے لیے بھی یہ دروازہ نہیں کھولا جاتا تھا۔ اس کے مہمانوں کی گاڑیاں اس بنگلے سے ملحق کھلے پلاٹ میں پارک کی جاتی تھیں۔ اس پلاٹ کے مالک کو ڈرا دھمکا کر پرویز بھائی کے غنڈے ساتھیوں نے اُس سے اونے پونے داموں یہ پلاٹ خرید لیا تھا۔

محض اس خطرے کے پیش نظر کہ مبادا کسی گاڑی میں ہی کوئی بم نصب نہ کر دیا گیا ہو۔ اس کے محافظ کسی گاڑی کو اندر نہیں آنے دیتے تھے۔

پرویز بھائی خود جس ملاقاتی کمرے میں اپنے مہمانوں سے ملا کرتا تھا اس کے دروازے میں وہ ایکسرے مشین نصب تھی جو ساتھ والے کمرے میں رکھی ایک ٹی وی پر اندر داخل ہونے والے کا سارا کچا چٹھا بیان کر دیتی تھی۔

یہ سارا حفاظتی نظام اُسے "را" نے نصب کروا کر دیا تھا۔

"را" نے اس ملک میں اپنے سب سے مضبوط ایجنٹ کی حفاظت سے کبھی آنکھیں نہیں ہٹائی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ "مرکز" کی طرف عازم سفر تھا۔

بندو بھائی کے لیے پرویز کے گھر کا کوئی کونہ ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ اس نے بھی دو سال یہاں ڈیوٹی دی تھی اور اکثر کسی نہ کسی کام سے اُس کا آنا جانا بھی یہاں لگا رہتا تھا۔ اس نے وزیر صاحب کے حکم کی تعمیل بہر صورت کرنی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اُسے اپنے دل کے ارمان پورے کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ آج تو پرویز نے اُسے تھپڑ مارا تھا اس سے پہلے جب وہ اس کے گھر ڈیوٹی کرتا معمولی بات پر گالی گلوچ کرنا اور بے عزتی کر دینا پرویز کا معمول تھا۔

بندو بھائی نے تنظیم کے لیے کم قربانیاں نہیں دی تھیں۔

اُس کا شمار ایک لحاظ سے تنظیم کے بانیوں میں ہوتا تھا۔ وہ بڑے بھائی کے گروپ کا آدمی تھا جس کی پرویز سے گاڑھی چھنتی تھی اور بڑے بھائی کی زندگی میں پرویز نے کبھی جرأت نہیں کی تھی کہ اُس کے سامنے اونچی آواز سے بول بھی سکے۔

بندو بھائی نے مخالف لسانی تنظیم کی جڑیں اکھاڑنے کے لیے بابا صاحب کے حکم پر بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔ اُسے تو اب اپنے ہاتھوں مرنے والے لوگوں کی گنتی بھی بھول گئی تھی۔

بابا صاحب اور بڑے بھائی کے احکامات پر اُس نے آنکھیں بند کر کے عمل کیا تھا۔ اس نے پرویز بھائی کی بھی بہت خدمت کی تھی۔

لیکن ـــ

نجانے کیوں اُس کا دماغ خراب ہو گیا اور اُس نے بات بات پر بندو بھائی کی بے عزتی کرنی شروع کر دی تھی اور اس کے مقابلے میں کل کے لونڈوں کو اہمیت دینے لگا تھا۔ جب شمس میاں وزیر منتخب ہونے تو پرویز بھائی نے اس سے جان چھڑانے کے لیے اُسے شمس میاں کو سونپ دیا۔

بندو خان نے بھی انہی کیمپوں میں تربیت حاصل کی تھی جنہیں پرویز کے باپ

بے تھے۔ وہ بھی ٹھنڈے دماغ کا قائل تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ وزیر صاحب نے اگر اس کو یہ ذمہ داری سونپی ہے تو کچھ جان کر ہی سونپی ہو گی اور اس میں یقیناً بابا صاحب کی مرضی بھی شامل رہی ہو گی۔

وہ پرویز بھائی کا شکار کھلے میدان میں کھیلنا چاہتا تھا۔

اس کے لیے ضروری تھا کہ بھیڑیا اپنی کچھار سے باہر نکلے۔

بندو خان نے اپنے ایک ساتھی کو "واکی ٹاکی" کے ساتھ پرویز بھائی کے گھر کے سامنے ایسی جگہ چھپا کر بٹھایا تھا جہاں سے وہ بہت کچھ آسانی سے نوٹ کر سکتا تھا خود وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ سرکاری کار میں اس راستے پر گھات لگائے کھڑا تھا جو اس کالونی سے "مرکز" کی طرف جانے والی سڑک کو جاتا تھا۔

شام ڈھلنے لگی تھی۔ انہیں یہاں کھڑے قریباً ایک گھنٹہ ہونے کو آ رہا تھا۔ اور درمیان محض اس خطرے کے پیش نظر کہیں کسی کو کار پر شک نہ گزرے اس نے خواہ مخواہ آبادی کے ارد گرد کئی چکر لگا لیے تھے۔

لیکن ـــ

بڑی ہوشیاری سے "واکی ٹاکی" کی رینج سے گاڑی کو باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔

اس وقت بھی وہ دوسری سڑک کا چکر کاٹ کر واپس آئے تھے جب اس کے ساتھی کے ہاتھ میں پکڑے "واکی ٹاکی" پر سگنل موصول ہوا۔

"گاڑی میں باہر آ رہا ہے۔ ڈرائیور اور دو محافظ ہیں ـــ اگلی نشست پر خود ہے۔"

مختصر پیغام ملا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"تم اُس طرف جاؤ اور تم اِس طرف ـــ" بندو خان نے اپنے دونوں ساتھیوں کو پہلے سے منتخب کردہ ٹھکانوں کی طرف روانہ کر دیا۔

خود وہ کار میں بیٹھا رہا۔

پرویز بھائی کا ڈرائیور آنے والی قیامت سے قطعی بے خبر معمول کے مطابق کار چلاتا اسی طرف آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں ہو گی کہ کوئی اُن پر بھی حملے کی جرأت کر سکتا ہے۔

جیسے ہی وہ اس مخصوص مقام پر پہنچا جہاں سپیڈ بریکر کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم کرنا پڑتی تھی۔ اچانک ہی اُن پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ سب سے پہلے حملہ آوروں نے بطورِ خاص گاڑی کے ٹائروں کو نشانہ بنایا تھا تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔

پرویز بھائی کا ہاتھ بمشکل ڈیش بورڈ تک پہنچا تھا جب سامنے والی کھڑکی کو توڑتی تین چار گولیاں یکے بعد دیگرے اس کے دماغ میں اُتر گئیں اور وہ ڈرائیور کے بازوؤں پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

دونوں باڈی گارڈز نے دروازے کھول کر باہر چھلانگیں لگائی تھیں لیکن وہ بھی کچھ کرنے کی حسرت ہی دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اُن پر بہت نزدیک سے فائرنگ کی گئی تھی۔

بندو خان بڑا ماہر نشانے باز تھا۔ اس نے پرویز بھائی کے کسی ساتھی کو زندہ بچ نکلنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کہانی کو سنانے کے لیے بھی کوئی کردار زندہ بچ سکے۔ اس طرح بابا صاحب یا وزیر صاحب کو اپنی مرضی سے کچھ بھی بیان دینے کی آزادی میسر ہو جاتی اور وہ جس طرف چاہتے اپنی زبانوں کا رُخ پھیر لیتے۔

پرویز بھائی اپنے تینوں ساتھیوں سمیت موت کی آغوش میں سو گیا تھا۔ پھر تصدیق کرنے کے لیے کہ اُن میں سے کسی میں زندگی کی کوئی رمق باقی تو نہیں رہ گئی۔ بندو خان اور اس کے ساتھیوں نے اُن کے سروں پر پہنچ کر

احتیاطاً بھی ان کے جسموں سے تین تین چار چار گولیاں پار کر دی تھیں۔

پرویز کی موت کی تو بندو بھائی نے بطورِ خاص گاڑی کا دروازہ کھول کر بھی تھی پھر مطمئن ہو کر بند کر دیا۔

اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس لوٹتے ہوئے اس نے اچانک ہی رکنے کا اشارہ کیا اور بھاگ کر اپنی گاڑی میں رکھا پٹرول کا کین اُٹھا لایا۔

"گاڑی پر پٹرول چھڑکا دو۔ بے چارے کی لاش بے یار و مددگار کیوں رہے۔ اس کا "انتم سنسکار" بھی اپنے ہاتھوں ہی سے کر دوں تو بہتر ہو گا۔"

اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

اس کے ایک ساتھی نے گاڑی پر پٹرول کا چھڑکاؤ شروع کیا۔

"تم ان دونوں بے چاروں کو بھی گاڑی کے نزدیک گھسیٹ لاؤ۔ اپنے مالک کے ساتھ جہنم واصل ہوں گے تو ان کے درجات مزید بلند ہو جائیں گے۔"

دوسرے ساتھی اور اپنی گاڑی کے ڈرائیور کو بندو خان نے حکم دیا۔ وہ دونوں کام میں جت گئے۔

جیسے ہی وہ اپنی بندوقیں زمین پر رکھ کر کام میں مصروف ہوئے بندو بھائی کے ہاتھ کی آٹومیٹک بندوق نے انگارے اُگلنے شروع کر دیے اور پل جھپکتے میں وہ تینوں پرویز بھائی کے ساتھیوں کے ساتھ ہی مارے گئے۔

اس نے تینوں کی بندوقیں اُن کے نزدیک پھینکیں اور پھر دور ہٹ کر پٹرول پر جلتی تیلی پھینک دی۔ اب وہ مطمئن ہو کر واپس جا رہا تھا۔

اس کے عقب میں سات لاشیں جل رہی تھیں۔

اس نے قاتل اور مقتول دونوں کو اکٹھے جلا کر اپنی دانست میں اس واقعے کے ثبوت ہی ختم کر دیے تھے۔

جال

گل شیر خان نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ اختر ملک اپنی حفاظت سے
غافل نہیں رہتا۔ اس نے اپنی دانست میں اپنے گرد حفاظت کا ایسا جال بُن
تھا کہ اگر شک پڑنے پر اُن کے خلاف نگرانی بھی شروع ہو تو وہ باخبر ہو جا

لیکن ... !

ایک بات گل شیر نے بطورِ خاص نوٹ کی تھی کہ ملک اختر نے کسی کو ا
پرائیویٹ لائف میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دی تھی۔ خصوصاً شہر کے ج
ماڈرن اور انتہائی مہنگے علاقے میں اُس نے فلیٹ لے رکھا تھا وہاں اُس
فلیٹ پر سوائے ایک بیرے اور ایک چوکیدار کے اور کوئی نہیں رہتا تھا۔
چوکیدار اُس نے محکمے کی طرف سے نہیں، بلکہ اپنے طور پر رکھا ہوا تھا اور
سابق فوجی دکھائی دیتا تھا۔

اس علاقے میں جو سمندر کنارے اس شہر کا سب سے مہنگا علاقہ تھا
فلیٹس بنائے گئے تھے وہ جدید ترین لگژری فلیٹس کہلاتے تھے۔ ایک دوسر
سے الگ تھلگ، محفوظ اور زندگی کی تمام ضروریات سے آراستہ۔ جنہیں فلیٹ ک
تو غلط تھا البتہ اپارٹمنٹس ضرور کہے جا سکتے تھے۔

گل شیر خان نے ملک اختر کے تعاقب میں اپنی شناخت کے خطرے کو نظر

ا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے فی الوقت اپنا ڈیرہ اُس کے گھر کے سامنے
جانے کی ٹھانی تھی۔

ملک اختر کے گھر کے سامنے والی سڑک سے کچھ فاصلے پر پھر سمندری ساحل
ع ہو جاتا تھا۔

ساحل کا یہ حصہ کچھ غیر آباد سا تھا کیونکہ اس طرف سہولیات موجود نہیں تھیں
یے عام لوگ تو اُدھر کا رُخ ہی نہیں کرتے تھے البتہ کبھی کبھی فلموں والے اس
، شوٹنگ کے لیے آجاتے تھے یا پھر کوئی شوقین مزاج یا تنہائی پسند یہاں سمندر
ے پتھریلی چٹانوں پر بیٹھ کر پتھروں سے سر پٹختی لہروں کو دیکھتا رہتا تھا۔
گل شیر نے فی الوقت ایک طاقتور دوربین کے ساتھ ایسی ہی ایک پتھریلی چٹان
پر ڈیرہ جما رکھا تھا۔

وہ اپنے ساتھ کچھ کتابیں اور ایک فائل سی پکڑ کر اس طرح کا تاثر پیدا کر
تا جیسے وہ فلسفے کا کوئی طالب علم ہو اور یہاں اُس کی آمد کا مقصد کوئی بڑا ہی
مقالہ تحریر کرنا ہے اگر وہ بھیس بدل کر نہ بیٹھتا تو بھی اس بات کا سوال
نہ اُٹھتا تھا کہ کوئی اس کی حرکات کا نوٹس لے گا۔ کیونکہ ان خوبصورت
بنگلوں کے مکینوں کے پاس کسی کی کسی بھی حرکت کا نوٹس لینے کے لیے وقت
ہیں تھا۔

یہاں شہر کے وی آئی پیز رہتے تھے اس لیے دن میں ایک دو مرتبہ اور
رات شام ڈھلے یا رات دیر گئے ایک آدھ چکر اس طرف کا پولیس کی کوئی
جیپ لگایا کرتی تھی۔ یا پھر اس سڑک سے کبھی کبھی ایک آدھ گھنٹہ بعد کوئی
کار یا ویگن گزرتی تھی اور بس۔

دو دن سے گل شیر خان کا یہ معمول تھا کہ وہ صبح ملک اختر کے دفتر جانے سے

پہلے اور شام کو دفتر سے آنے کے بعد دیر گئے تک یہاں بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی
دُور بین کے شیشے رات کے اندھیرے میں بھی دن کے اُجالے کی طرح سارے
منظر دیکھ لینے کی طاقت رکھتے تھے۔

ان دو دنوں میں تو اُس نے کوئی خلافِ معمول بات نوٹ نہیں کی تھی سوائے
اُن دو تین عورتوں کے جو اُس کے ساتھ ہی آتی اور چلی جاتی تھیں یا پھر اس سے
ملنے والے کچھ پرائیویٹ مہمان جن میں سے ہر ایک کی نگرانی کرنا اُس کے لیے
ممکن ہی نہیں تھا۔

آج اُسے تیسرا دن تھا اور کسی چھٹی حس کے تابع وہ معمول سے کچھ پہلے ہی اپنی
جگہ آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل معمول کے مطابق پتھروں کی اوٹ میں
اس طرح پارک کر رکھی تھی کہ اس پر کسی کی نظر پڑنا ممکن نہیں تھا۔

آج پہلی مرتبہ اس نے اپنے اعلیٰ افسر سے درخواست کر کے ایک کار بھی نگرانی
کے لیے منگوائی تھی جسے اُس کا ایک ماتحت اور انتہائی قابلِ اعتماد ساتھی چلا رہا
تھا۔ گل شیر خان کی ہدایت پر کار اس نے آبادی کے دوسرے کونے میں پارک کی
تھی اور اس کی کسی ہدایت پر ہی اُسے یہاں سے کسی طرف موو کرنا تھا۔

○

سورج گل شیر خان کے عقب میں سمندر کے پانیوں پر اپنی سرخیاں بکھیرتا
مغرب کی طرف عازمِ سفر تھا۔

یہ منظر اتنا دلفریب ہوتا کہ وہ اکثر اس میں کھو جاتا۔ اُسے سمندر کی لہروں
پر کپکپاتی سورج کی روشنیاں بہت بھاتی تھیں۔ خصوصاً جب آخری لمحات میں
سورج آگ کے گولے کا روپ دھار لیتا اور سارا منظر سرخی مائل ہو جاتا تو
گل شیر خان کو اپنے وجود میں ایک بے نام سی طمانیت اترتی محسوس ہوتی۔ ان لمحات

ئی مرتبہ اُس کا دل چاہا کہ عارفہ اُس کے ساتھ بیٹھی ہو اور وہ دونوں مل کر
منظر سے محظوظ ہوں۔

لیکن ——

یہ سب کچھ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

اُس نے عارفہ سے متعدد ملاقاتیں کی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے
نظروں ہی نظروں میں متعدد مرتبہ اپنا حالِ دل بیان کیا تھا۔ دونوں نے
رتبہ ذو معنی فقروں سے ایک دوسرے تک اپنا احوال پہنچایا تھا۔ اس کے
ود انہوں نے اپنے درمیان ایک حدِ فاصل قائم رکھی تھی۔ دونوں کی
ش تھی کہ وہ ایک دوسرے سے سوائے محبت کے اور کسی موضوع پر بات
کریں۔

لیکن ——

دونوں کبھی کھل کر اس موضوع پر بات نہیں کر سکے تھے۔ اگلے ہی
جب عارفہ اس سے ملنے آئی تھی بڑی خوش دکھائی دے رہی تھی۔

"پرویز کو کسی نے مار ڈالا ——"

اُس نے اپنی دانست میں گل شیر تک بڑی اہم خبر پہنچائی تھی۔

"ہاں میں نے بھی اخبار میں پڑھا ہے" ——

اُس نے مختصر سا جواب دیا تھا۔

"بڑی بے رحمی سے قتل کیا ہے۔ کسی نے اُس کے ساتھیوں کو پرویز
قتل کر کے اُن کی لاشیں بھی جلا ڈالیں —— شاید اُن جیسا ہی کوئی
ہوگا ——"

عارفہ نے اس کی آنکھوں میں اس طرح جھانکا جیسے اپنے اس فقرے کا

ردِعمل جاننا چاہتی ہو۔

"یہ وحشی لوگ ہیں عارفہ ——— ان کی دوستیاں اپنے مخصوص مفادات کے تابع ہوتی ہیں ——— تم یہ سمجھ لو جیسے جنگل میں وحشی درندے ایک دوسرے سے مل کر زندگی گزارتے ہیں اور موقعہ ملنے پر ایک دوسرے کو مار ڈالتے ہیں بالکل یہی حالت ہے ان لوگوں کی ——— جہاں ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں یہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں ——— پرویز اور اس کے ساتھیوں کو کسی اور نے نہیں ——— میرا اندازہ ہے کہ باباصاحب نے خود ہی مروایا ہوگا ———"

"آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی ———"

عارفہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میرا دل بھی یہی کہتا تھا کہ یہ حرکت باباصاحب ہی کی ہے ——— [illegible] ہیں بھی یہ لوگ یہی کچھ کرتے ہیں۔ موقعہ ملنے پر ایک دوسرے کو گولی سے اڑا دینا اُن کے لیے بچوں کا کھیل ہے۔ شاید اسی طرح قدرت ان موذیوں کے ہاتھوں سے ہی ان کو اپنے اپنے بھیانک انجام تک پہنچاتی ہو گی۔

"گل شیر میرا دل کہتا ہے یہ لوگ اسی طرح ایک دوسرے کے ہاتھوں ہی مارے جائیں گے۔ شاید اب ہمارے حکمرانوں کی بے حسی کو دیکھ کر قدرت نے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔"

عارفہ نے اپنے دل کی بات لبوں پر لاتے ہوئے کہا تھا۔

"عجیب اتفاق ہے ہم جب بھی ملتے ہیں اسی موضوع پر باتیں کرتے رہتے ہیں حالانکہ اور بھی کئی موضوعات ہیں ———"

آج پہلی مرتبہ گل شیر نے اُسے کہہ ہی دیا۔

"ہاں ——— میں بھی یہ محسوس کرتی ہوں لیکن ....."

اس سے آگے اُس نے کچھ کہنے کی بجائے مسکرا کر گردن جھکا لی۔

شاید وہ گل شیر کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ کیونکہ اس کے چہرے کی سنولاہٹ میں حیا کی سُرخی بھی اُمڈ آئی تھی اور اس کے دونوں گال اس طرح تمتمانے لگے تھے جیسے اُس کے رخساروں پر شفق کی ساری سُرخی اُمڈ آئی ہو۔

"عارفہ! ہم بھی کیا لوگ ہیں ——— اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بھی [illegible]تے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ہم ایک دوسرے کے جذبات سے آگاہ ہوتے ہیں۔"

"اصل مسئلہ تو ابلاغ کا ہے ناں ——— جب آگہی ہو تو زبان کو زحمت دینا بزدلی ہے۔"

عارفہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

"ویسے آپ اہل زبان ہیں یہی تو خوبی ہے۔ بات کہنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔"

گل شیر نے کہا۔

"اور بات بنانا آپ سے ———"

عارفہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

دونوں چند گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے حسبِ سابق ماضی اور حال کے حوالے سے بہت سی باتیں کیں۔

لیکن ———

اس ملاقات میں بھی اپنے مستقبل کے حوالے سے کوئی بات چاہنے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے نہ کہہ سکے۔

○

اپنی آنکھوں سے دُور ہیں لگا کہ اُس نے دُور ہی سے ملک اختر کی کار پر

نظریں جمائی تھیں۔ حسب سابق اُس کی کار میں اگلی سیٹ پر ہی ایک لڑکی بیٹھی تھی
گل شیر کے لیے اس کے ساتھ کسی لڑکی کی موجودگی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی
کیونکہ ملک اختر کی عیاش طبیعت سے بخوبی آگاہ تھا۔

لیکن ——

جیسے ہی کار اُس کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑی ہوئی اور گل شیر نے اس
لڑکی پر فوکس کیا تو اچانک وہ چونک پڑا۔

کون ہے یہ ؟ کون ہے یہ ؟

اس کے ذہن میں تکرار ہونے لگی۔

اچانک اُسے یاد آگیا یہ تو وہی ہے جس کی تلاش میں اُس نے اس شہر
کا کونہ کونہ چھان مارا تھا جس کی تصویر کو اُس نے اپنے ذہن میں یوں اُتار لیا
تھا کہ اب کوئی بار بار کھرچنے پر بھی نہ مٹا پاتا۔

یہ میناکشی تھی۔

میناکشی کی اچانک دریافت نے اُس کے دل کی دھڑکن تیز کر دی تھی۔
اُس نے میناکشی پر ذہن کے شیشوں کو اس وقت تک فوکس کیے رکھا جب
تک کہ کار گیٹ میں داخل نہیں ہو گئی۔

میناکشی کی اُس کے ساتھ موجودگی کے بعد ملک اختر کے خلاف کوئی ثبوت
تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جس طرح کی رپورٹ اُس سے متعلق مل رہی
تھی اور حال ہی میں اس نے جس چالبازی اور ہوشیاری سے لسانی تنظیم کے
تازہ اسلحے کی کھیپ اُن تک پہنچنے میں مدد دی تھی۔ اس کے بعد ملک اختر کے
ہاں میناکشی کا پایا جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ میناکشی کی اصلیت سے
آگاہ ہے۔

اگر میناکشی نے اُسے یہ نہیں بتایا کہ وہ "را" کی ایجنٹ ہے تو بھی اُسے یہ
علم ہو گا کہ میناکشی کا تعلق کسی خطرناک گروہ سے ہے۔ گل شیر کو علم تھا کہ
کے لوگ اپنے شکار کو عموماً اپنی اصلیت بتائے بغیر اپنا اُلو سیدھا کرتے رہتے
کیونکہ دنیا کی ہر انٹیلی جنس ایجنسی کی طرح اُنہیں بھی آم کھانے سے مطلب
ہے گٹھلیاں گننے سے نہیں۔

عین ممکن تھا کہ میناکشی نے اسے اپنا کوئی اسلامی نام بتایا ہو۔

یقیناً اس نے اپنا رشتہ لسانی تنظیم کے کسی عہدیدار سے قائم کیا ہو گا۔ اس
ن کا بھی امکان تھا کہ اُس نے یہاں اپنے کچھ بہن بھائی یا اپنی کوئی فیملی بھی
اختر کو دکھا دی ہو۔ اس سب کچھ کے باوجود ملک اختر کو یہ علم رہا ہو گا کہ
ناکشی کا تعلق کسی مجرموں کے گروہ سے ہے اور اگر وہ اس کے ساتھ گھوم رہا ہے
ک آفیسر ہونے کے ناطے وہ بھی اس گناہ میں برابر کا شریک ہے۔

خوشی اور کامیابی کے ملے جلے احساس سے شیر گل خان اپنی موٹر سائیکل کی
ف جا رہا تھا جس کے دائیں ہاتھ نصب بکسے کے ڈبے میں دستی ٹیلی فون رکھا
ا اور بڑے موٹر سائیکل کی بیٹری سے اس کا کنکشن ہونے کی وجہ سے اُس میں
دگی بیدار رہتی تھی۔

اس نے بمشکل اپنی انگلیوں کی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے اپنے افسرِ اعلیٰ
رابطہ کیا تھا۔

یہ وہ خصوصی نمبر تھا جو افسرِ اعلیٰ کے چند جانثار ساتھیوں تک محدود تھا اور
ں پر وہ ہر وقت موجود رہتے تھے۔

" سر ! "

اس نے رابطہ ملتے ہی جذبات سے بے قابو آواز میں کہا۔

"سر! بڑی کامیابی ہوئی ہے ــــ مینا کشی مل گئی ــــ ملک اختر اسے اپنے ساتھ لایا ہے۔"

"ویل ڈن ــــ ویل ڈن مائی بوائے ــــ ونڈرفل ــــ"

افسرِ اعلیٰ نے اسے شاباش دیتے ہوئے کہا۔

گل شیر خان نے افسرِ اعلیٰ کو بتایا تھا کہ اب مینا کشی یہاں سے صبح واپس جائے گی اور اس کا بھی وہی طریقہ ہوگا جو دوسری عورتوں کا ہوتا ہے، جنہیں ملک اختر رات بھر عیاشی کرنے کے بعد صبح پرائیویٹ کار سے واپس بھیجتا ہے، یا پھر اُنہیں کوئی لینے آتا ہے۔ وہ خود کبھی ان کے ساتھ واپسی کا سفر نہیں کرتا۔

اس نے افسرِ اعلیٰ سے درخواست کی تھی کہ کم از کم چار گاڑیاں اُس کا تعاقب کر کے اس کا ٹھکانہ معلوم کر لیں۔

یہ کام وہ لوگ ایک گاڑی سے بھی لے سکتے تھے لیکن گل شیر خان کی خواہش تھی کہ اس کامیابی کو معمولی سی غلطی کی وجہ سے نقصان نہ پہنچے کہیں ان لوگوں کو تعاقب کا شک ہو گیا تو وہ بہت محتاط ہو جائیں گے۔

"تم بے فکر ہو جاؤ ــــ یہیں ڈٹے رہو ــــ میں آصف کو تمہاری مدد کے لیے بھیج رہا ہوں ــــ تھوڑی دیر تم آرام کر لو ــــ صبح پھر ڈیوٹی سنبھال لینا۔"

افسرِ اعلیٰ نے کہا۔

"نو سر! آپ مطمئن رہیں۔ اس کھیل میں کم سے کم لوگ ہی شامل ہوں تو بہتر ہے میں ساری رات یہیں گذاروں گا۔ آپ باقی بندوبست کر دیں۔"

وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

"او۔کے ــــ او۔کے ــــ جیسے تم کہہ رہے ہو ویسے ہی ہوگا۔ خدا حافظ۔"

افسرِ اعلیٰ کو اپنے ماتحت کے جذبات اور کام کی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ملک اختر کے اپارٹمنٹ کے چاروں طرف انٹیلی جنس کی بیس مستعد اہلکار گل شیر خان کی کسی بھی ہدایت کے منتظر بیٹھے تھے۔

گل شیر خان نے ابھی تک اپنی آنکھوں سے دوربین لگا رکھی تھی۔ اس نے اختر کے گھر کی چھت کو فوکس کیا ہوا تھا۔ اُسے علم تھا کہ چھت پر رکھی ہوئی وہ کرسیوں پر بیٹھ کر ہی ملک اختر اور اس کی داشتائیں شغلِ مے نوشی کرنے کے بعد وہ لوگ نیچے چلے جایا کرتے تھے۔

اس کے اندازے کے مطابق قریباً پندرہ بیس منٹ بعد اُس نے دونوں کو آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے دیکھ لیا۔

اب مینا کشی کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے موجود تھی ــــ!

اس نے وہی لباس پہن رکھا تھا جس کی توقع گل شیر خان کو تھی۔ ملک اختر جیسے مریض کو پھانسنے کے لیے ایسا ہی پھندا لگایا جا سکتا تھا۔

دونوں وہاں بیٹھے مے نوشی کرتے رہے۔ اس درمیان انہوں نے بیہودہ بھی شروع کر دی تھیں۔ جس کے بعد اپنی آتشِ شوق بجھانے دونوں چلے گئے تھے ــــ!

گل شیر اپنی جگہ ڈٹا رہا ــــ!

اس نے اپنے ساتھ رکھے "واکی ٹاکی" پر کار میں موجود اپنے ساتھی سے پینے کی کچھ چیزیں منگوالی تھیں اور اب سڑک کنارے کھڑا اس کا تھا۔

"واکی ٹاکی" ــــ پر سگنل اُسے مل چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اُسے کار اپنی طرف آتی دکھائی دی جس میں موجود ساتھی نے گاڑی روک کر اس کا بونٹ اس طرح اوپر اٹھا لیا تھا،

جیسے اچانک اس میں کوئی نقص آ گیا ہو۔

گل شیر خان لاپرواہی سے چلتا اس کے نزدیک پہنچ رہا تھا جب اُس کار
نے اگلی سیٹ پہ رکھا ایک شاپنگ بیگ باہر رکھ دیا جو گل شیر نے چلتے چلتے ہی
اُٹھا لیا اور اس سے بغیر کوئی بات کیے واپس اپنے مورچے کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس بیگ میں اس کیلئے ایک لنچ بکس، چائے کا تھرموس اور ایک کاغذ پر
لکھا ہوا پیغام تھا کہ اُس کی ہدایت کے مطابق گاڑیاں پہنچ چکی ہیں اور اسے کس
طرح اُنہیں سگنل دینا ہے۔

گل شیر خاں ایک قدرے آرام دہ جگہ پہ پتھریلی چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ
گیا تھا جب اُسے دُور سے کسی کار کی روشنیاں ملک اختر کے گھر کی طرف لپکتی
دکھائی دیں۔

ایک مرتبہ پھر وہ چوکنّا ہو کر بیٹھ گیا۔

اپنے گلے میں لٹکتی دُوربین اُس نے آنکھوں سے لگا لی تھی۔

اندھیرا اب دن کے اُجالے پہ مکمل غالب آ چکا تھا اور دُور دُور تک سوائے
سمندر کی لہروں کے شور کے اور کچھ سُنائی نہیں دیتا تھا۔

لیکن ——

اس دُوربین کی مدد سے باہر کا منظر دن کے اُجالے کی طرح روشن تھا۔
بڑی مرسڈیز کار تھی جو گیٹ پہ آ کر رُکی اور اس میں سے ایک شخص باہر نکلا جس
نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔

ایک مرتبہ پھر وہ چوکنّا ہو کر بیٹھ گیا۔

یہ گل شیر کے لیے دوسرا "سرپرائز" تھا۔

گھنٹی بجانے والا جبار تھا ——

"۵۹۰" کا موجودہ انچارج ——

پرویز کی موت کے بعد ان لوگوں کو اُمید تھی کہ اس کی ذمہ داریاں جبّار کو
سونپی جائیں گی۔

اور ایسا ہی ہُوا ——

جبّار کے ساتھیوں کی شکلیں گاڑی میں بیٹھے ہونے کی وجہ سے نمایاں نہیں تھیں۔
یہ بھی کوئی اچھے لوگ نہیں تھے۔ یقیناً یہ بھی اُس قبیل کے لوگ ہوں گے۔
نے سوچا۔

گیٹ کھُل گیا تھا، گاڑی اندر چلی گئی اور گل شیر خان قدرے مطمئن ہو کر
چائے پینے لگا۔

قریباً دو ڈھائی گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔

سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس دوران بمشکل ایک مرتبہ پولیس
گشتی جیپ نے اِدھر کا چکر لگایا تھا۔

رات کے قریباً بارہ بجنے والے تھے جب ایک مرتبہ پھر دروازہ کھُلا جس
مرسڈیز اپنے سواروں سمیت واپس برآمد ہوئی۔ گل شیر خان نے اچھی طرح
اطمینان کر لیا تھا کہ اس کار میں میناکشی سوار نہیں ہے۔

اُس نے اپنے بائیں ہاتھ رکھے "واکی ٹاکی" پر اپنے ساتھیوں کو مرسڈیز
رنگ اور پوزیشن سے آگاہ کرنے کے بعد اس کے تعاقب کی ہدایت
پھر اپنی جگہ ڈٹ کر بیٹھ گیا۔

وہ زندگی میں پہلی مرتبہ رات جاگ کر نہیں گزار رہا تھا۔ ایسی سینکڑوں
راتیں اس نے اس سے پہلے گزاری تھیں۔ اپنی نوکری میں بھی اور اس سے
جب وہ کالج لائف میں سکاؤٹ تھا تو "کیمپ فائر" میں اکثر شمولیت

کیا کرتا تھا۔

صبح کب ہوئی اور رات کب گزر گئی۔

گل شیر خان کو احساس ہی نہ ہو سکا۔ اس کے ساتھی نے شاید اس کی تنہائی کا احساس کرتے ہوئے اس کے لیے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ اور دو تین کیسٹ بھی ساتھ ہی رکھ دیے تھے تاکہ اس کی دلچسپی کا کوئی سامان تو وہاں موجود ہو۔

لیکن ——

گل شیر خان نے ایک کیسٹ بمشکل سنا تھا جب اس کی طبیعت اُکتا گئی اور اس نے سمندر کے سینے پر بہت دُور اندھیرے میں رینگتے اُن جہازوں اور سٹیمروں پر نظریں جمالیں جو یہاں سے معمول کے مطابق گزر رہے تھے۔

○

صبح کی نماز اس نے وہیں بوتل میں بچے تھوڑے سے پانی سے وضو کر کے ادا کی اور پھر چوکنا ہو کر بیٹھ رہا۔

اختر ملک کی روانگی کا وقت ہو رہا تھا ——

وہ حسبِ معمول اکیلا اپنی کار چلاتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کا تعاقب فضول تھا کیونکہ گل شیر خان جانتا تھا کہ وہ یہاں سے سیدھا اپنے آفس ہی کی طرف جائے گا۔

لیکن ——

وہ نہیں جانتا تھا کہ آج سے اس کے زوال کی مہر اس کی بدکرداری کے سبب اس پر ثبت ہو گئی ہے اور اس کے افسرِ اعلیٰ نے راتوں رات ہائی کمان سے رابطہ کر کے اختر ملک کے فون "بگ" کرنے کی اجازت طلب کر لی تھی۔

آئی ایس آئی کے آہنی شکنجے نے غدارِ وطن ملک اختر کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اب اس کا فرار ناممکن ہو چکا تھا۔

اس کی روانگی کے قریباً پندرہ بیس منٹ بعد اس نے ایک نیلے رنگ کی ٹیوٹا وہاں رُکتے دیکھی یقیناً وہ مینا کشی کو لینے آئی تھی۔ ڈرائیور نے جو اکیلا ہی گاڑی تک لایا تھا کار سے نکل کر گھنٹی بجائی۔ اندر موجود چوکیدار نے جھانک کر دیکھا اور گردن ہلاتا اندر چلا گیا۔

اس کے ساتھ ہی گل شیر خان نے "واکی ٹاکی" پر اپنے ساتھیوں کو کار سے آشنا کر کے اگلی ہدایات دے دی تھیں اور اب اپنے موٹر سائیکل کی طرف جا رہا تھا۔

دھکیلتا ہوا وہ سڑک تک لے آیا تھا۔

اسی سی کے موٹر سائیکل کا سلف دباتے ہی انجن سٹارٹ ہو گیا۔

مینا کشی حسبِ سابق بڑے اطمینان سے مٹکتی ہوئی باہر نکلی۔ چوکیدار نے "بیگم" کو سیلوٹ کیا اور اُس نے اپنے بیگ سے سو کا نوٹ نکال کر اس کے پھیلے ہاتھ پر رکھ دیا۔

لیکن ——

اُسے احساس نہ ہو سکا کہ اس کوٹھی سے کچھ فاصلے پر رُکی ایک کار کے پیچھے ایک نوجوان نے بڑے طاقتور لینز کے ذریعے اس کی باقاعدہ فلم بندی شروع کی تھی۔ اس کی مصروفیات اور ملک اختر کے ساتھ مشغولیات کو اب اُن لوگوں سیٹلائیٹ کے فیتے پر منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔

بیک وقت تین کاریں اور گل شیر خان اپنی موٹر سائیکل پر اس کا تعاقب کر رہے اُن لوگوں نے مینا کشی کی کار کو اس طرح گھیرے میں لے رکھا تھا کہ اس کو شبہ کا تنکہ ہی نہیں گزر سکتا تھا۔ کبھی ایک کار اس کے آگے ہو جاتی اور پیچھے پھر تینوں اپنی جگہیں بدل لیتے۔ جبکہ سڑک کے ایک کنارے سے گل شیر کی موٹر سائیکل بھی اُن کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔

جیسے ہی وہ لوگ معروف شاہراہ پر داخل ہوئے دو کاریں ایک طرف مڑ گئیں لیکن ان کی جگہ لینے کے لیے دوسری دو کاریں وہاں آ گئی تھیں۔ ایک مرحلے پر پھر تیسری کار بھی ایک طرف مڑ گئی اور اس کی جگہ ایک موٹر سائیکل سوار نے لے لی۔

افسرِ اعلیٰ نے گل شیر خان کے کہنے پر مینا کشی کے لیے شک کی معمولی گنجائش بھی باقی نہیں چھوڑی تھی۔

اس سفر کا اختتام شہر کے دوسرے کونے میں موجود ایک خواتین کے ہوسٹل پر ہوا۔

یہ ہوسٹل ترقی پسند خواتین کی ایک مقامی انجمن چلا رہی تھی جس کی کرتا دھرتا تین چار بڑی بڑی بیگمات تھیں جن کے متعلق اس شہر کے شرفا کو کسی طرح کی کوئی غلط فہمی نہیں تھی اور ان کے "پارٹ ٹائم مشاغل" سے اکثر باخبر لوگ مکمل باخبر تھے۔

اس ہوسٹل میں عموماً ستم رسیدہ معاشرے کی ستائی ہوئی خواتین یا پھر وہ عورتیں جن کا اس دنیا میں کوئی نہ ہو، پناہ لیا کرتی تھیں۔

مینا کشی نے بھی یقیناً ان میں سے کسی ایک کا روپ دھارا ہو گا۔

نیلے رنگ کی کار نے اسے ہوسٹل کے گیٹ کے سامنے اتارا تھا۔ گیٹ پر بڑی بڑی مونچھوں والے چوکیدار نے جو شکل ہی سے کوئی دلال لگتا تھا۔ اُسے دیکھ کر اپنے استقبالیہ دانت نکالے تو مینا کشی نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر بھی پچاس کا ایک نوٹ رکھ دیا اور لاپروائی سے مٹکتی ہوئی اندر چلی گئی۔

○

کاروں نے ہوسٹل کے مختلف کونوں میں پوزیشنیں سنبھال لی تھیں فی الوقت انہیں گل شیر خان کے فیصلے کا انتظار تھا۔

مینا کشی کو اس مرتبہ بھی احساس نہ ہو سکا کہ نہ صرف طاقتور لینز والے ایک

کیمرے نے اس کی کار کے اترنے سے اندر جانے تک کی درجنوں تصاویر اتار لیں بلکہ دوسرے کیمرے نے اس کی باقاعدہ فلمبندی بھی کر لی تھی۔

گل شیر خان کے اشارے پر اُن کا ایک ساتھی اس نیلی کار سے چپک گیا جس کے ذریعے مینا کشی یہاں تک آئی تھی۔ اس کی نظروں سے غائب ہونے کے بعد گل شیر خان ٹہلتا ہوا گیٹ کے سامنے پہنچ گیا اُس نے آنکھ کے اشارے سے چوکیدار کو ایک طرف بلایا تھا۔

چوکیدار اس کے اندازے کے مطابق خاصا تجربہ کار دکھائی دیتا تھا وہ بڑے اطمینان سے اس طرف آ گیا۔

"کیا بات ہے ــــ؟"

اس نے بظاہر بڑے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"یار ــــ کیوں ناراض ہوتے ہو ــــ ہم بھی یاروں کے یار ہیں ــــ"

یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک نوٹ بٹوے سے نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیا۔ چوکیدار نے نوٹ کی شکل دیکھی اور پگھل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ صاحب یہاں کیوں آتے ہیں۔

"بڑا زبردست مال ہے ــــ"

اُس نے لوفروں کی طرح آنکھ دبائی۔

"کون سا بابو جی ــــ"

چوکیدار نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"یار ــــ تم نے ابھی تک ہمیں بتایا ہی نہیں۔ کوئی اچھا سودا کروا دو۔ اپنا سیٹھ کروڑ پتی آدمی ہے۔ ایک آدھ سودے سے ہی اندازہ ہو جائے گا۔"

گل شیر خان نے اندازہ کر لیا تھا کہ جو لوگ اس ہوسٹل سے لڑکیوں کو لے کر

جانتے ہیں اس چوکیدار کی مٹھی یقیناً گرم کرتے ہوں گے اور اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ کون کس کے ساتھ جاتا ہے۔

"بابو جی — آپ پروین بی بی کی بات تو نہیں کر رہے جو ابھی ابھی باہر گئی ہیں —"

چوکیدار نے پوچھا۔

"ہاں یار — بس میرے سیٹھ کا دل آگیا ہے اس پہ۔ ذرا بات تو کروا دو ہماری —"

گل شیر خان بولا۔

"ناں بابو ناں — معاف کرنا۔ کوئی اور خدمت ہو تو بتاؤ۔ میں بہت اچھا بندوبست کر دوں گا — دو تین اور بیبیاں ہیں۔ بڑی ماڈرن ہیں۔ خوش ہو جاؤ گے تم انہیں دیکھ کر —"

چوکیدار نے جواب دیا۔

"یار اسے کیا ہے۔ بھئی تم بیبیوں سے نہ گھبراؤ اپنا سیٹھ کوئی معمولی آدمی نہیں — میں نے کہا ناں۔ تمہاری لائف بنا دے گا۔"

گل شیر خان نے اس کی طرف دیکھ کر لوفروں کی طرح آنکھ دبائی۔

"بابو جی — ہم بھی یاروں کے یار ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن پروین بی بی کسی بڑے سرکاری افسر کے ساتھ سیٹ ہے وہ کسی کو لفٹ نہیں کرواتی۔ میرے ساتھی نے ایک مرتبہ کوشش کی تھی اس کی نوکری سے چھٹی ہو گئی۔"

چوکیدار نے مجبوری ظاہر کی۔

"کون سا سالا ایسا سرکاری افسر آگیا —"

گل شیر خان نے جانتے بوجھتے اسے کریدنے کے انداز میں پوچھا۔

"صاحب ہمیں اس کے نام کا تو علم نہیں۔ بڑا اسمارٹ سا نوجوان ہے بڑی قیمتی گاڑی پہ آتا ہے۔"

چوکیدار نے اسے گاڑی کا رنگ اور نوجوان کا حلیہ بتاتے ہوئے کہا۔ جو حلیہ اس نے بیان کیا وہ ملک اختر ہی کا تھا۔

"یار تم نے بڑا مایوس کیا — اپنا سیٹھ سالا کوئی بات نہیں مانے گا۔ اچھا ایک کام کرو۔ کسی طرح اس افسر کا پتہ لگا دو۔ ہمارا سیٹھ خود ہی کوئی چکر چلا لے گا۔ بے فکر رہنا۔ تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا اور تمہارا کمیشن تمہیں ملتا رہے گا۔ ایک مرتبہ میرے سیٹھ کا دل ایک ایکٹریس پہ آگیا تھا۔ اس نے اپنی ایک قیمتی کار اور کوٹھی اسے دے کر اس کے عاشق سے توڑ لیا تھا۔ اس کی کیا مجال ہے۔ یار تم یہ رکھو اور اس کا پتہ لگانا — باقی کام میرا سیٹھ کرے گا۔"

اس نے سو روپے کا ایک اور نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

چوکیدار کی تو آنکھیں پھٹنے کو آرہی تھیں۔ اتنا "دیالو" اور مہربان گاہک تو اسے آج تک نہیں ملا تھا۔ ضرور یہ کسی بہت بڑے آدمی کا ملازم ہے۔

"دوسرے تیسرے دن دوپہر ۲ بجے کے بعد وہ آتا ہے اس طرف اور دونوں اکٹھے لنچ وغیرہ کرنے جاتے ہیں۔ آج بھی ادھر ہی گئی ہوگی۔ اب شاید وہ کل آئے گا۔ میں آپ کو بتا دوں گا — آپ کل ایک ڈیڑھ بجے آجانا۔"

چوکیدار نے کنکھیوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے — خدا حافظ —"

گل شیر خان نے اس سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور واپس لوٹ آیا۔ اس نے اپنے ساتھی کو جسے مینا کشی کی شناخت ہو گئی تھی اس کی مستقل نگرانی پر لگا کر

دارولہ

یہاں سے وہ سیدھا اپنے آفس آیا تھا جہاں اُس کی آمد کی اطلاع ملتے ہی افسرِ اعلیٰ نے اُسے اپنے پاس بلا لیا تھا۔

"شاباش جوان۔ تمہارے لیے خوشخبری موجود ہے۔ تمہارا عہدہ بڑھا دیا گیا ہے — ڈبل ڈن مبارک باد —"

افسرِ اعلیٰ اُس کی کارکردگی سے بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

گل شیر خان نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چوکیدار کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرتے ہوئے اُن سے درخواست کی تھی کہ کسی لیڈی آفیسر کو اُس ہوسٹل میں داخلہ دلوا کر مینا کشی کی نگرانی پر فوراً مامور کر دیا جائے۔

"میرے ذہن میں پہلے سے یہ بات موجود ہے۔ تم بے فکر ہو جاؤ اب اُسے دُنیا کی کوئی طاقت ہماری نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتی — یہی تو ہے جس کے ذریعے ہمیں سانپ کے بل کے اندر گھس کر اسے باہر نکالنا ہے —"

افسرِ اعلیٰ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

دونوں اگلا لائحہ عمل طے کرتے رہے۔ اُس نے عارف میاں کی مدد لینے کے خصوصی اختیارات حاصل کر لیے تھے۔ افسرِ اعلیٰ کے دل میں اس نے عارف میاں کے لیے خاصا احترام پیدا کر دیا تھا۔ اور انہوں نے وعدہ کر لیا تھا کہ اس کی خدمات کا وقت آنے پر ضرور مول چکائیں گے اور اُس پر قانونی گرفت نہیں ہونے دیں گے۔

گل شیر نے تھوڑی دیر بعد وہاں سے رخصت لے لی اور گھر آرام کرنے چلا گیا۔

شکنجہ

شام گئے تک وہ گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔

اُس کی آنکھ کھلی تو سرہانے رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس کے ماتحت نے اسے اطلاع دے دی تھی کہ اب تک تین مرتبہ اُس کے لیے عارف میاں کا فون آ چکا ہے۔ عارف میاں کے اصل نام سے اس کا کوئی ساتھی آگاہ نہیں تھا۔ اور وہ اپنے کوڈ نام کے ساتھ بات کیا کرتا تھا۔ گل شیر خان نے خصوصی ہدایت کی تھی کہ وہ کبھی فون پر اصل نام نہ لے۔ اُس نے جان بوجھ کر عارف میاں کو اپنے گھر کا فون نمبر نہیں دیا تھا۔ عین ممکن تھا کبھی لسانی تنظیم کو اس پر شک ہو جاتا اور وہ لوگ عارف میاں کی نگرانی شروع کر دیتے۔

لیکن ——

ایسا بندوبست موجود تھا کہ عارف میاں کا پیغام ملنے کے چند منٹ بعد ہی وہ اس سے رابطہ کر سکتا تھا۔ آج اس کے ماتحت نے شاید اس لیے اُسے دیر سے فون کیا تھا کیونکہ اُسے علم تھا کہ گل شیر خان ساری رات جاگتا رہا ہے۔

اُس نے فوراً ہی عارف میاں سے رابطہ قائم کر لیا تھا جس نے ہوٹل پہنچنے کو کہا تھا۔ اگلے آدھ گھنٹے میں وہ عارف میاں کے سامنے موجود تھا۔ دونوں نے ملاقات کے لیے جس جگہ کا انتخاب کر رکھا تھا وہ اتنی محفوظ تھی جس کا کوئی تصور

بھی نہیں کر سکتا تھا۔

یہ ایک عام سا ہوٹل تھا جس کا مالک گل شیر خان کے گاؤں کا ایک آدمی تھا
جسے گل شیر خان نے عارف میاں کی پہچان کرواتے ہوئے اُسے اپنا جگری دوست بتایا
تھا اور کہا تھا کہ وہ اُن کے لیے فوراً ہوٹل کا کمرہ ریزرو کر دیا کرے۔

آج بھی وہ معمول کے مطابق ایک کمرے میں بیٹھے محوِ گفتگو تھے۔

"آپ کے لیے ایک زبردست خبر ہے خان صاحب ——"

عارف میاں نے چھوٹتے ہی کہا۔

"اور تمہارے لیے بھی —— لیکن پہلے تم سناؤ ——"

گل شیر خان نے اُس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی پکڑتے ہوئے کہا۔

"۵۹" میں یہ افواہ ہے کہ پرویز کو منسٹر صاحب نے مروایا ہے۔ میں نے اپنے
طور پر جبار کو اعتماد میں لے کر بات کی ہے۔ اُس کا شک بھی منسٹر صاحب پر ہی ہے
لیکن وہ لوگ اس لیے چُپ ہیں کہ منسٹر صاحب بابا صاحب کی اجازت کے بغیر کچھ
نہیں کر سکتا —— جس کا سیدھا مطلب یہی ہے کہ بابا صاحب نے ہی پرویز کی
چھٹی کروانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ پرویز کو رخسانہ کی مخاصمت لے ڈوبی
جناب —— یہ سالی! بڑی مضبوط عورت ہے۔ بابا صاحب کے اعصاب پر
سوار رہتی ہے —— آج کل اُس نے بابا صاحب کو "کشتوں" پر لگا دیا ہے۔
یہ سونے چاندی کے کشتے اب اُن کے گردوں کا بیڑا غرق کر رہے ہیں اور اندر
والے جانتے ہیں کہ بابا صاحب کو گردوں کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے —— میں نے
خود شہر کے دو گردوں کے سپیشلسٹ جو تنظیم کے بااعتماد ساتھی ہیں بابا صاحب
کے ہاں اکثر آتے جاتے دیکھے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے یہ سالی رخسانہ اُسے کشتے
کھلا کھلا اُس کے گردے ناکارہ کروا دے گی اور خود تنظیم کی قیادت سنبھال لے

آپ دیکھیں ناں جناب کہ اب اس کا کون سا مخالف زندہ بچا ہے۔ میرے خیال
ہے اس وقت تنظیم میں کوئی ایسی شخصیت ہی نہیں رہ گئی جو اُس کے ہم پلّہ ہو اور
بابا صاحب تو اس کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔ افسوس جس شخص نے اس ملک
کے حکمرانوں کو نچا کر رکھ دیا ہے اُس کو ایک فاحشہ عورت اپنی انگلیوں پر نچا
رہی ہے۔"

عارف میاں نے اُسے مطلع کیا۔

"اگر یہ کارنامہ منسٹر صاحب نے انجام دیا ہے تو تمہارے خیال میں کس کے ہاتھوں
بندو اپنے انجام کو پہنچا ہوگا ——"

گل شیر خان نے اگلا سوال کیا۔

"بندو خان کے —— وہی ایک ایسا شخص ہے اس کے پاس جس کے لیے
لئے بے شمار قتل کر دینا کوئی مشکل بات نہیں —— آپ کو علم ہے کہ اُس نے
اپنے تین ساتھیوں کو بھی اُس کے ساتھ ہی مار ڈالا۔ درندہ ہے سالا۔ درندہ ——
اس کی یہی خاصیت ہے کہ اپنے جرم کا کوئی ثبوت نہیں رہنے دیتا —— ہاں جی ——
کسی نے اُسے قتل کرتے نہیں دیکھا لیکن طریقِ واردات اسی کی چغلی کھا رہا ہے۔"

اُس نے رُک کر چائے کا گھونٹ حلق میں اُتارتے ہوئے کہا۔

"پرویز بھائی نے اس کی بہت بے عزتی کی تھی —— ریسٹ ہاؤس کی کہانی
رخسانہ کے ذریعے بابا صاحب کو اور پھر رخسانہ کے ذریعے مجھ تک پہنچی ہے۔
پرویز نے منسٹر صاحب کی بہت بے عزتی کی تھی۔ بہت اونچا اُڑنے لگا تھا سالا۔
حکمرانوں سے سیدھے روابط قائم کر لیے تھے اُس نے۔ مجھے تو یوں لگتا تھا کہ اگر
پرویز اور زندہ رہ جاتا تو شاید بابا صاحب کی پکی چھٹی ہو جاتی —— ہاں خان
صاحب اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ کسی روز بھارتیوں کو اعتماد میں

لے کر بابا صاحب کی ہی "اکال چلنا" کروا دیتا۔ اس وقت تنظیم کے جتنے لڑکے مختلف کیمپوں میں موجود ہیں اُن میں سے ساٹھ ستر فی صد اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور ان سے پہلے کی تمام بھرتی بھی یا تو بڑے بھائی نے دی تھی یا پھر اُس نے۔" "یہ بات عام طور پہ کہی جاتی ہے کہ بھارتی اس پہ بابا صاحب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں کیا مجال جو اس کی چٹ لے کر جانے والے کو ویزا نہ ملا ہو۔ بڑا خطرناک آدمی ہے۔"

عارف میاں نے اُسے ساری کہانی سنائی۔

"یار تم ایک کام کرو ——"

اچانک ہی ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح گل شیر خان کے ذہن پر لپکا تھا۔

"فرمائیے ——"

"کسی طرح جبار اور مظفر صاحب کو اکٹھے کر کے رخسانہ سے ٹکرا دو۔"

گل شیر خان نے یہ بات سرگوشی کے انداز میں کی تھی لیکن عارف میاں اچانک ہی یوں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا جیسے اس کو طاقت ور سپرنگوں نے اُچھال دیا ہو۔

"بیٹھ جاؤ ——"

گل شیر خان نے اُسے اس طرح ہاتھ اُٹھا کر کہا جیسے اس کے حکم سے ہی عارف میاں کھڑے ہوئے تھے اور اس کے حکم سے بیٹھ جائیں گے۔

"خان صاحب —— شاندار —— ایک دم شاندار —— بس اب دیکھیے میرا کمال۔ سالوں کو آپس میں ہی نہ ٹکرا دیا تو عارف نام بدل دیجیے گا —— دیکھتے جائیے میں کرتا کیا ہوں۔"

عارف میاں کے چہرے کا رنگ یک لخت سرخ ہو گیا تھا۔ اُس کے اندر گل شیر خان کے اس فقرے نے گویا ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ اچانک ہی ایک جوار بھاٹا

سا اس کے اندر اُٹھا تھا جس کے آثار اُس کے چہرے پہ بڑے واضح دکھائی دے رہے تھے۔

"اور ہاں تمہارے لیے ایک خبر یہ تھی کہ تمہاری بینا کشی مل گئی ہے —— بھئی بڑا ہاتھ مارا ہے اس نے —— بڑی کایاں عورت ہے کم بخت ——"

گل شیر خان نے اُسے بتایا۔

"گویا قدرت نے اب ہم سے کوئی کام لینے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔"

عارف میاں نے کہا۔

"ہاں —— تمہیں بھی جلد ہی اُس کا دیدار کروا دوں گا —— لیکن ابھی دور دور سے ہی نظارہ کرنا —— تمہیں شاید علم نہ ہو کہ آجکل تنظیم کے بڑے بڑے لڑکے اس کے نزدیک پائے جا رہے ہیں۔ میرے خیال سے احتیاط اب لازم ہو گئی ہے۔ تم اپنے طور پر اشفاق بھائی یا اس کے ساتھیوں سے کوئی رابطہ نہ کرنا۔ انہوں نے نفیس میاں کو بھی اُس کے محسن کا نام بتا دیا ہے۔ وہ سب لوگ تمہاری بہت عزت کرتے ہیں۔"

گل شیر خان اُس کے ساتھ کافی دیر باتیں کرتا رہا۔ دونوں نے ایک منصوبہ طے کیا تھا اور اب دونوں اُس کی کامیابی کے لیے خدا سے دعائیں مانگتے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

○

اختر ملک کے ساتھ جو کچھ ہونے جا رہا تھا وہ کبھی اُس کے گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔ مختلف دفاتر میں تبدیلیاں تو روزانہ کا معمول تھا۔

لیکن ——

یہاں ہونے والے تبادلے بلا مقصد نہیں تھے۔

یہ تبادلے چھوٹی سطح پر ہوئے تھے۔ کچھ ڈرائیور اس محکمے سے دوسرے محکموں میں بھیج دیے گئے تھے اور اگلے دو تین روز میں پانچ ڈرائیور یہاں آگئے تھے۔ ملک اختر نے ان میں سے ایک کا انتخاب اپنے لیے کیا تھا اور آج ہی اس نے "صاحب بہادر" کی گاڑی کا چارج سنبھالا تھا۔

پہلے ہی روز اس نے گاڑی میں ایک معمولی سی الیکٹرانک پرابلم شکایت کی اور اس کے حکم پر کسی مکینک کو دکھانے لے گیا۔

یہ معمول کی کارروائی تھی۔

اس شہر میں مختلف مقامات پر ہونے والی کھدائی سے حشر برپا ہوا تھا اور جس طرح گرد و غبار کا طوفان سارا دن فضا پر چھایا رہتا تھا۔ اس کے بعد کسی انسان یا مشین میں کوئی خرابی پیدا ہو جانا معمول کی بات تھی۔

ڈرائیور صوبے خان جو اس سے پہلے ایس پی صاحب کی ڈیوٹی کسی دوسرے شہر میں کر رہا تھا گاڑی لے گیا اور ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد جب واپس لوٹا تو گاڑی کا "ڈائی لاگ"... "ہو چکی تھی اس کا معمولی نقص دُور ہو گیا تھا۔

لیکن ــــــ

گاڑی میں ایک معمولی سا اضافہ بھی کر دیا گیا تھا۔

یہ خصوصی "بگ سسٹم" تھا جو بادلِ نخواستہ پاکستان انٹیلی جنس کو اپنے ہی ایک آفیسر کی کار میں نصب کرنا پڑا تھا تاکہ اس کے شیطانی منصوبوں سے آگاہی حاصل کر سکے۔

بال جتنی باریک تاروں سے ترتیب دیا یہ سسٹم اتنا حساس اور طاقتور تھا کہ اس گاڑی میں ہونے والی معمولی آہٹ کو بھی ریکارڈ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

صوبے خان کے ساتھ ملک اختر کا پہلا سفر ہی بڑا شاندار تھا۔

وہ اس کی توقع سے بڑھ کر تابعدار، مستعد اور اس کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں ملک اختر سے اپنے سابق ایس پی صاحب کا مکمل تعارف کروا دیا تھا ـــــ اور اشارے کنائے میں بتا دیا تھا کہ وہ افسروں کے لیے اُن کے اشارہ ابرو پر جان دینے کو بھی تیار رہتا ہے۔

اس کے اطوار بتا رہے تھے کہ اس شخص میں اپنے افسران کے راز چھپانے کی مکمل صلاحیت موجود ہے کیونکہ اپنے سابقہ مالک کے متعلق اُس نے ملک اختر کے کریدنے پر بھی کوئی بات نہیں بتائی تھی اور یہی تاثر دیا تھا کہ وہ اپنے افسروں کی پرائیویٹ زندگی کے رازوں کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرتا ہے۔

ملک اختر اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔

اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ صوبے خان بھی اُس جیسے شوق کا مالک ہے لیکن غریب اور کانسٹیبل کے درجے کا ملازم ہونے کے سبب وہ چھپ کر ہی اپنا شوق پورا کر سکتا تھا۔

دو ایک روز ہی میں اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ صوبے خان اُس کے عین مزاج کے مطابق ہے اور مستقبل میں اس کا بہترین ملازم ثابت ہو گا۔

ملک اختر نے اس کا ٹیسٹ اگلے ہی روز کر لیا تھا جب اُس نے صوبے خان کو ایک پیٹی کسی دکان سے وصول کر کے اس کے گھر پہنچانے کی ہدایت کی تھی اور صوبے خان نے یہ کام اس طرح کیا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

لیکن ــــــ

گھر پہنچتے ہی اس نے ملک اختر کے بیرے سے دوستی گانٹھ لی تھی اور اُسے بتایا تھا کہ بھوک کے مارے اُس کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اگر وہ اُسے روٹی کھلا دے تو اس سے زیادہ ثواب کبھی نہیں کمائے گا۔

بیرے کو اس کی طبیعت کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی تھی اور اس نے فوراً ہی ان کے لیے کھانا تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔

صوبے خان کمرہ سیدھا کرنے کے بہانے ملک صاحب کے بیڈ روم میں بچھے قالین پر لیٹ گیا تھا۔

اُسے اپنا کام مکمل کرنے کے لیے بمشکل آدھا گھنٹہ درکار تھا۔

آدھ گھنٹے میں اُس نے ملک صاحب کے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں بگ سسٹم "نصب کر دیا تھا۔ اب اُن کی کار کی طرح اُن کے گھر میں ہونے والی گفتگو بھی تمام تفصیلات کے ساتھ ریکارڈ ہو سکتی تھی۔

اپنا کام مکمل کر کے وہ کچن میں آ گیا تھا اور جلدی جلدی کھانا کھا کر ملک صاحب کو لینے چلا گیا۔

گھر پہنچ کر ملک صاحب نے بطور خاص یہ بات نوٹ کی تھی کہ اس نے کسی بھی طرح پیٹیاں کھول کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ ہی اس نے پیٹی لینے والے سے کوئی سوال کیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھنے والا ہے اس بات سے قطعاً بے نیاز کہ اس کے افسران کیا کرتے ہیں۔

ایسے ہی شخص کی اُسے تلاش تھی۔

ملک اختر نے اُسے اپنے ساتھ مستقل ڈیوٹی کے لیے رکھ لیا تھا۔ صوبے خان نے اُسے اپنی خوش بختی جانا تھا۔

○

"گیسٹ ہوم" کی انچارج مسز عاصمہ چوہدری شہر کی کئی انجمنوں کی عہدیدار تھیں۔ اُنہیں دنیا کی ہر مظلوم عورت سے ہمدردی تھی۔ اس شہر میں ہلاذ کے بہتر [illegible] زبانات کی بہبودی وہ خود کر رہی تھیں۔ انہوں نے مظلوم اور ستم رسیدہ خواتین کی

ان کے لیے بطور خاص "لیگل ایڈ" کمیٹی قائم کر رکھی تھی۔

ملک کے کونے کونے سے مظلوم اور ستم رسیدہ خواتین ان کے پاس پناہ لینے آتی تھیں اور مسز چوہدری ان کے اور ظالم معاشرے کے درمیان ڈھال بن کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔

آج بھی وہ معمول کے مطابق اپنے دفتر میں بیٹھی تھیں جب دوپہر کے بعد ان کی سیکرٹری نے ایک جواں سال لڑکی کو اندر بھیج دیا۔

اس لڑکی نے اپنا نام عمرانہ بتایا تھا۔ اس کی عمر بمشکل تیئس برس ہو گی لیکن وہ نظر سے بمشکل اٹھارہ برس کی دکھائی دیتی تھی۔ یوں تو مسز چوہدری نے بڑی بڑی خوبصورت ستم رسیدہ لڑکیاں دیکھی تھیں ——

لیکن ——

اتنی خوبصورت اور شاندار شخصیت کی مالک لڑکی سے اُن کا واسطہ پہلی مرتبہ پڑا تھا۔ اس نے مسز عاصمہ چوہدری سے انگریزی میں گفتگو کرتے ہوئے اپنا تعلق ملک کے ایک معروف گھرانے سے بتاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ان پر بوجھ نہیں بنے گی اور اپنے اخراجات خود ادا کرے گی۔ اُس نے اپنی آنسو بھری آنکھوں اور رندھے ہوئے لہجے میں بتایا تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اُس کا گھرانہ جاہل جاگیردارانہ ذہنیت رکھتا ہے۔

اس کا گناہ یہ ہے کہ اُسے اپنے خاندان سے کمتر درجے کے ایک پڑھے لکھے نوجوان سے محبت ہو گئی تھی۔ جب کہ اس کے والدین اس شادی پر رضامند نہیں ہیں۔ انہوں نے لڑکے کو اتنا خوفزدہ کیا ہے کہ وہ شہر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

اب عمرانہ بطور احتجاج اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر آ گئی تھی۔

اُس نے مسز عاصمہ چوہدری کو بتایا کہ وہ کسی پر بوجھ نہیں بنے گی۔ اُس نے اس

شہر میں نوکری کا بندوبست کر لیا ہے اور یہاں قیام کرنا چاہتی ہے۔ اُس نے کہا تھا
کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر اپنے بزدل محبوب کو یہاں لائے گی اور اپنے والدین کی
آنکھوں کے سامنے علی الاعلان اُس سے شادی کرے گی۔

مسز عاصمہ چوہدری پر اُس کی پُر اثر اور سحر انگیز شخصیت کا ایسا جادو چلا کہ وہ موم
کی طرح پگھلتی چلی گئی۔

اُس نے شام کو گیسٹ ہاؤس کے کامن روم میں موجود لڑکیوں سے اُس کا تعارف
کرواتے ہوئے اُس کی جرأت کی تعریف کی اور انہیں کہا گیا کہ جب تک اس ملک کی
عورت خود جرأت کا مظاہرہ نہیں کرے گی اس معاشرے میں انہیں کوئی مقام نہیں
ملے گا۔

اُس نے عمرانہ کی جرأت کی داد دیتے ہوئے اسے گیسٹ ہاؤس کا شاندار کمرہ
الاٹ کیا تھا اور یقین دلایا تھا کہ اس کی تنظیم اس کی ہر قدم پر مدد کرے گی۔

یوں دکھائی دیتا تھا جیسے عمرانہ نے مسز چوہدری پر کچھ پڑھ کر ہی پھونک
دیا ہے کیونکہ اس نے بہت عرصہ بعد آج اس کے اعزاز میں چائے پارٹی کا اہتمام
کیا تھا۔ اس پارٹی میں بطورِ خاص شہر کی سوشل ورکر خواتین کو مدعو کیا گیا تھا۔
اُن کے سامنے بھی اس نے عمرانہ کی تعریف کے پُل باندھنے شروع کر دیے تھے۔

عمرانہ سے یوں تو اس "گیسٹ ہاؤس" کی بہت سی مظلوم لڑکیاں دوستی کی
خواہاں نظر آتی تھیں لیکن اُسے یہاں ایک خاص لڑکی کی تلاش تھی جو اُسے بالآخر
ایک کونے میں کھڑی نظر آ گئی۔ یہ پروین تھی۔

پروین بھی کوئی معمولی ہستی نہیں تھی۔ اس وقت بھی وہ شہر کی متمول خواتین
سے محوِ گفتگو تھی جب عمرانہ بڑے نامحسوس انداز میں اس کے نزدیک پہنچ گئی۔

"ہیلو ــــ"

عمرانہ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"ہیلو ــ مجھے پروین کہتے ہیں ــــ بہت خوشی ہوئی آپ کے متعلق جان کر
آپ جیسے بڑے گھروں کی لڑکیاں جب تک ہمت سے کام نہیں لیں گی باندی
بنے گی۔"

"آف کورس مس پروین۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے کہ یہ لوگ جب چاہیں
ہمیں مذہب اور روایات کے نام پر بیوقوف بنانا شروع کر دیں۔ ۲۱ ویں صدی
کی عورت کیسے غلام رہ سکتی ہے ــــ بتائیے ناں کیسے رہ سکتی ہے؟"

اُس نے پروین کی ہاں میں بڑھ چڑھ کر ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

عمرانہ کی آنکھوں میں اسے معصومیت کا دریا ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دے رہا تھا۔

"چلے گی ــــ"

اس نے دل ہی دل میں خود سے مسکراتے ہوئے کہا۔

رات کے کھانے تک دونوں ایک دوسرے کی دوست بن چکی تھیں۔ پروین نے
ان کے لیے کھانا بطورِ خاص اپنے کمرے میں منگوایا تھا۔

کھانے کے دوران عمرانہ نے پروین پر ثابت کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ آزاد خیال
شاید اس ملک میں کوئی اور نہیں ہے جسے نہ تو اپنے ملک و ملت سے کوئی واسطہ
ہے نہ اپنے مذہب سے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ زندگی جتنے دن کی بھی ہے اُسے اپنی
مرضی سے اپنے نظریات کے مطابق ہی گزارنی چاہیے۔

پروین کو بھی اس سارے لیڈیز گیسٹ ہوم میں پہلی لڑکی کچھ پسند آئی تھی۔
ورنہ وہ کسی کو منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک تو وہ یوں بھی ہفتے میں
دو چار دن یہاں قیام کرتی تھی پھر جتنے دن وہ یہاں رہتی عموماً اپنے کمرے
میں بند رہتی۔

اس کے متعلق مشہور تھا کہ کسی بڑے سرکاری افسر سے اس کا معاشقہ چل رہا ہے
جس کے ساتھ جلد ہی اس کی شادی ہونے والی تھی۔

یوں لگتا تھا شاید عمرانہ یہاں آئی ہی اس لیے ہے کہ پرویز سے دوستی
کر لے۔

○

دونوں شہر سے باہر جبار کے ہی ایک خفیہ ٹھکانے پر آ گئے تھے۔
جبار سے جب اس نے ایک ضروری مسئلے پر بات چیت کرنے کے لیے کہا تھا
تو اس نے ایک مرتبہ تو حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"سالے کوئی چکر تو نہیں دے رہا۔"

جبار نے اس کی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"جبار بھائی ہم نے اپنے سفر کا آغاز ایک ساتھ کیا تھا۔ ہماری منزل اگر الگ
الگ ہو بھی گئی تھی تو اب ایک ہو جانی چاہیے۔ حالات انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے
ہیں۔ میرے خیال میں بنے بھائی کے بعد پرویز بھائی کی موت ایسا واقعہ نہیں جسے
آسانی سے نظر انداز کر دیا جائے۔ ہمیں مل کر یہ سوچنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ ہم ایک ایک
کر کے مارے جائیں ——"

اُس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا تو جبار نے چند لمحے سوچنے کے بعد ہاں کر دی
لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ وہ جگہ کا انتخاب خود کرے گا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ——"

عارف میاں نے جواب دیا۔

اب دونوں ایک ہی گاڑی میں یہاں تک آئے تھے۔ گاڑی جبار خود چلا رہا
تھا۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا راستہ اختیار کیا تھا جو بالکل ویران تھا اور شہر سے

فاصلے پر وہ ایک فارم پر آ گئے تھے۔
شاید اس لمبے راستے سے اس لیے آیا تھا کہ کسی بھی تعاقب کو نوٹ کر سکے۔

لیکن ——

اُسے یقین ہو گیا تھا کہ عارف میاں اُس کے خلاف کوئی چکر نہیں چلا رہا بلکہ
حالات کے پیشِ نظر شاید اس نے کچھ اور فیصلہ کر لیا ہے۔

"ہاں عارف میاں اب بات کرو —— بھائی برا مت ماننا۔ ان حالات میں جبکہ
ہمارے گروپ پرویز بھائی کو اس طرح سازش سے مروا دیا گیا ہے ہم کسی پر آنکھیں
بند کر کے اعتبار نہیں کر سکتے۔"

جبار بھائی نے ایک چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

یہ فارم شاید اس کے کسی ساتھی کا تھا یا پھر اس کا۔ کیونکہ اس کا استقبال
مالک کی طرح ہی کیا گیا تھا۔

"مجھے علم ہے اس میں کسی کا قصور نہیں۔ جبار بھائی ہم نے ایک عظیم انقلاب
کے لیے اس تنظیم میں شمولیت اختیار کی تھی۔ کم از کم میں یہ بات کر سکتا ہوں کہ میں نے
بابا صاحب کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہایا ہے۔ مجھے اُن کی ڈکٹیٹر شپ پر اعتراض نہیں
اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کا وجود تنظیم کی بقا کے لیے نقصان دہ ہے تو
انہیں یہ حق حاصل ہے کہ اُسے ختم کروا دیں۔"

"لیکن یہ فیصلہ اُن کا ذاتی فیصلہ ہو تو —— میں تو یہ نہیں چاہوں گا کہ ہماری
تنظیم کے فیصلے اب خواتین کو سونپ دیے جائیں۔"

عارف میاں کا تیر عین نشانے پر لگا۔ اس کے آخری فقرے کا جبار کے چہرے
پر شدید ردِ عمل دکھائی دے رہا تھا اس کے اعصاب اچانک تن گئے اور چہرے
کا رنگ بدلنے لگا تھا۔

"عارف میاں جو بات آج تمہارے دماغ میں سمائی ہے اس کا احساس پرویز بھائی کو بہت پہلے سے ہو گیا تھا۔ یہ سالی انٹیلی جنس کی ایجنٹ ہے۔ اس کے فوراً بعد [illegible] کسی اور نے نہیں خود اُس نے نصب کیا تھا بھلا کسی کی جرأت ہے کہ اس کے [illegible] ہاتھ لگا سکے۔ اور اس کے اُکسانے پہ پرویز بھائی کے قتل کی اجازت بھی دے دی۔ تم جانتے ہو اس سالے منسٹر کی یہ ہمت تھی کہ ان کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھتا بابا صاحب کی اجازت اور حکم سے سب کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے نواب بنے بھائی کے قتل کے پیچھے بھی بابا صاحب ہی نظر آ رہے ہیں۔"

جبار نے بمشکل اپنی زبان پہ کنٹرول پایا تھا یوں لگتا تھا جیسے اُس کے اندر اُبلتے لاوے کو اچانک ہی عارف میاں نے اخراج کی راہ دکھا دی ہو۔

اُسے جبار کی اس کمزوری کا علم بھی تھا کہ وہ پرویز بھائی کا سالا بھی ہے۔ کچھ بھی ہو پرویز اس کا بہنوئی تھا۔ اس کی بہن پرویز کے قتل سے بیوہ ہوئی تھی۔

"دیکھو جبار بھائی کہنے کو تو بہت سی باتیں ہیں لیکن میرے خیال سے باتیں کرنے کا وقت گزر چکا ہے اور اب عمل کا وقت آ گیا ہے۔ جس طرح تنظیم کا ایک سازش کے تحت بیڑا غرق کیا جا رہا ہے اور جس طرح انٹیلی جنس کے لوگ ہماری صفوں میں گھس آئے ہیں اس طرف شاید بابا صاحب کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ وہ اپنی لگن میں مست ہیں۔ کسی ورکر کے مشورے کو اہمیت نہیں دی جاتی اور ہر فیصلے کے پیچھے اس رخسانہ کا ذہن کارفرما ہوتا ہے۔ اب ہمیں خود کچھ سوچنا ہوگا ورنہ یاد رکھنا یہ لوگ تو بچ جائیں گے کیونکہ یہ سرکار کے وعدہ معاف گواہ بن کر ہمارے خلاف بھارتی کیمپوں میں تربیت حاصل کرنے کے ثبوت پیش کر کے ہمیں ساری زندگی کے لیے فوجی عقوبت خانوں میں پھینکوا دیں گے۔"

عارف میاں بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے

وہ چاہتا تھا کہ جبار کے منہ سے وہ بات نکلوا لے جو عارف میاں کے دل میں تھی اور جسے کہنے کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق جبار تو اس سے کئی گنا زیادہ بابا صاحب کے خلاف بھرا بیٹھا تھا۔ پرویز کے قتل نے اُسے پاگل کر دیا تھا۔

"عارف میاں اب مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ اشفاق بھائی اور کالیا وغیرہ نے بالکل صحیح فیصلہ کیا تھا۔ ان لوگوں نے قوم کے لیے کیا ہی کیا ہے۔ سوائے اپنی عیاشیوں کے ——— ہم تو "۵۹" کے لوگ ہیں۔ ہم سے کیا پوشیدہ ہے۔ تم ہی بتاؤ بابا صاحب کے اکاؤنٹس کی کسے خبر نہیں۔ ارے وہ سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کے بینکوں میں جو اربوں روپیہ جمع کر رکھا ہے وہ کس کے باپ کی کمائی ہے۔ ہمارا ہی تو مال ہے۔ ایسے مرنے کے لیے کیا ہم ہی رہ گئے ہیں اور مزے کرنے کے لیے یہ لوگ۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ عارف میاں چاہے کوئی میری زبان کاٹ دے میں تو یہی بات کہوں گا کہ بابا صاحب خود ذمہ دار ہے۔ اس کے دماغ میں تکبر سما گیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو خدا سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا دماغ ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ وہی ہماری تباہی کی جڑ ہے۔ ہمیں اس جڑ کو اکھاڑ پھینکنا ہوگا۔ ورنہ یاد رکھنا ایک ایک کر کے ہم سب مارے جائیں گے۔"

بالآخر جبار بھائی نے کہہ ہی دیا۔

"جبار بھائی میں گزشتہ چار روز سے خواب آور گولیاں کھا کر سو رہا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے بابا صاحب اس تنظیم کے ہر اس شخص کو جس کے متعلق اُسے شک ہو جایا کرے گا کہ کہیں مستقبل میں اس کے لیے خدشات پیدا نہ کر دے مروا دیا کرے گا ——— اور ہاں جبار بھائی اس غلط فہمی میں ہم میں سے کوئی نہ رہے کہ بابا صاحب یا رخسانہ کا قرب کسی کو بچا لے گا ——— ارے کہیں بابا صاحب

نے حکومت سے ہاتھ تو نہیں ملا لیا اور انٹیلی جنس والوں کی نشاندہی پر کہیں ملک کے خون سے ہولی کھیل جا رہی ہو۔ میرا تو دماغ ہی ماؤف ہو کر رہ گیا ہے۔"

عارف میاں نے جلتی پر تیل ڈالا۔

"عارف میاں ـــ بات سیدھی سی ہے۔ جو بات تمہارے دل میں ہے وہی خدشہ ہم بھی محسوس کر رہے ہیں۔ تم نے صحیح کہا ہے یہ لوگ سالے بک جائیں گے ہمیں قربانی کا بکرا بنا کر سرکار کے سامنے پھینک دیں گے۔ میں تو کہتا ہوں اب تخت یا تختہ دونوں میں سے ایک کو چن لینا چاہیے ـ تمہارے ساتھ بھی مخلص کارکن ہیں اور میرے ساتھ بھی اگر ہم "وہ" پر قبضہ کر لیں تو ہم بھی حکومت کو بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں آ جائیں گے۔"

جبار بھائی نے تجویز پیش کی لیکن یہ کام بڑی رازداری اور انتہائی مضبوط منصوبہ بندی سے ہو گا۔ کسی بھی مرحلے پر معمولی سی غلطی ہم سب کو لے ڈوبے گی میرے ذہن میں ایک تجویز ہے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کر لو اور اس کے بعد ہم کوئی اگلا قدم اٹھائیں گے۔"

عارف میاں نے بڑی رازداری سے اس طرح اس کے نزدیک جھکتے ہوئے یہ بات کہی تھی جیسے اُسے خدشہ ہو کر کوئی اُن کی بات سن نہ لے حالانکہ یہاں دُور دُور تک کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔

"کہو ـــ کہو ـــ کیا تجویز ہے۔ میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔"

جبار بھائی اُس سے زیادہ بے چین دکھائی دے رہا تھا۔

"دیکھو جبار بھائی ہم میں سے کسی کا سرکاری ایجنسی کے ساتھ تو کوئی رابطہ ہے نہیں ـــ ہمیں تو جو کام بھی کرنا ہے خود ہی کرنا ہے پرویز بھائی کی وجہ سے اگر تم یہ سمجھتے ہو کر بھارتی قونصلیٹ سے کوئی مدد لو گے تو تمہاری خام خیالی ہو گی

بلکہ یہ لوگ مردوں سے دوستی نہیں رکھا کرتے۔ پرویز بھائی جب تک زندہ تھا بات اور تھا مر گیا اُن سے تعلق ختم۔ یوں بھی ان لوگوں کو بھنک لگ گئی کہ بابا صاحب کے خلاف "وہ" میں کوئی سازش چل رہی تو فوراً اُسے ہوشیار کر دیں گے کیونکہ اس وقت وہی اُن کا سب سے مضبوط ساتھی ہے۔ بابا صاحب کے لیے ہمیں تنظیم کے اندر ہی سے لوگ تلاش کرنے ہوں گے اور کام بھی اسی طرح کرنا ہو گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ خاص طور پر بھارتیوں کو تو اس کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے۔"

اس نے رازداری سے کہا۔

"تنظیم کے اندر تو پھر ہم خود ہی ہیں ـــ مار دیتے ہیں سالے کو آج ہی گولی"

جبار بھائی نے اپنی دانست میں بڑا آسان حل نکالا تھا۔

"جلدی نہیں جبار بھائی۔ جلدی ہم سب کو مروا دے گی۔ پہلے میری بات سن لو ـــ میں ایک تیر سے دو شکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ اس وقت بابا صاحب کے مقابلے کی ایک ہی شخصیت ہے اور وہ ہے مظفر صاحب۔ اس سالے نے پرویز بھائی کو مروایا ہے۔ ہم اسی کو اعتماد میں لے کر لیڈری کا جھانسہ دیں گے۔ اُسے باور کرائیں گے کہ اب اس کا نمبر لگنے والا ہے کیونکہ رخسانہ بابا صاحب کی جگہ لینا چاہتی ہے اور تم تو جانتے ہی ہو یہ ہے بھی سچی بات ـــ میرے خیال میں اگر ہم نے ذرا سمجھ سے اپنے پتے کھیلے تو کوئی وجہ نہیں کہ مظفر قابو میں نہ آئے۔ اس کو بابا صاحب سے ٹکرا دیتے ہیں اور خود ایک طرف بیٹھ کر تماشہ دیکھیں گے دونوں میں سے جو دوسرے کو زیر کر لے گا وہ خود بھی اتنا تھک چکا ہو گا کہ تازہ حملے کی تاب نہیں لا سکے گا۔ رخسانہ کو فی الحال مظفر کے پیچھے میں لگا دوں گا اور مظفر کو بابا صاحب کے پیچھے ـــ جو ان میں سے بچے گا وہ ہمارا شکار ہو گا۔"

عارف میاں کی بات کے خاتمے پر جبار بھائی نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"ارے واہ عارف میاں — تم تو سالے بڑے کام کے آدمی ہو — بڑا تیز ہے رے تیرا — ہم ایسے تو دو سال ہی خطا ہو رہے تھے۔ کاش پہلے ہی ہم نے تجھے اپنے ساتھ لگا لیا ہوتا۔"

جبار نے اس کے لیے نعرہ تحسین بلند کیا۔

"کل سے آغاز کر دیں اس کام کا —؟"

عارف میاں نے پوچھا۔

"ارے میاں آج ہی سے۔ بلکہ ابھی سے، لیکن ایک لفڑا ہے۔"

"وہ کیا —؟"

"یہ سالا منسٹر میری بات کا اعتبار نہیں کرے گا۔ یہی سمجھے گا کہ میں کوئی چال چلنے والا ہوں۔"

جبار بھائی نے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔

"یہ کام تم مجھ پہ چھوڑ دو۔ مجھے تمہاری اجازت چاہیے تھی۔ میں تمہاری طرف سے اُسے صلح کا پیغام دیتا ہوں اور کسی طرح تمہیں اکٹھے کرتا ہوں وہیں اس کے سامنے بہ ترتیب چال چل دینا۔ اس درمیان بابا صاحب کی طرف سے اس کی ٹھکائی بھی کروا دوں گا جب لوہا گرم ہو گا تب ہی تو صحیح چوٹ پڑے گی۔"

عارف میاں نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

"ارے واہ عارف میاں — مزہ آ جائے گا۔ آؤ تمہاری ہماری فتح کا جام تجویز کریں۔"

جبار نے اس کا بازو پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچا اور گلے لگا لیا۔

اُسے اپنے ساتھ لے کر وہ ایک کمرے میں آیا تھا جہاں وہ سب کچھ موجود تھا جس کی توقع جبار سے کی جا سکتی تھی۔ یہیں دونوں نے جام فتح نوش کیا اور واپس پلٹ آئے۔

⊙

اگلے روز ایک بجے سے پہلے ہی گل شیر خان وہاں پہنچ گیا تھا۔

اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی چوکیدار کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بظاہر لاپرواہی سے اس طرح اس کی طرف آ رہا تھا جیسے وہ کوئی عام سا ملاقاتی ہو۔

"شاہد — آیا ہے ابھی یا نہیں اور وہ کہاں ہے تمہاری میڈم پروین۔"

اس نے بے حیائی سے آنکھ دبائی اور ایک نوٹ نکال کر چوکیدار کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"ارے صاحب اس کی کیا ضرورت تھی آپ نے پہلے ہی اتنا کچھ دے دیا ہے یہ بڑا خطرناک کام ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو علم ہو گیا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے تو میری چھٹی ہو جائے گی۔ صاحب جی! وہ بہت بڑا افسر ہے کوئی معمولی افسر نہیں کہیں مجھ غریب کو مروا ہی نہ دینا۔"

چوکیدار نے بظاہر اس پر احسان جتانا بھی ضروری سمجھا۔

"ارے یار کیوں مرا جاتا ہے۔ کیا ہو گیا زیادہ سے زیادہ تیری نوکری جائے گی ناں — بے فکر ہو جا — ایسی درجنوں نوکریاں تجھے دلا دوں گا اور یہاں سے ڈبل دوں گا زیادہ تنخواہ بھی۔ پھر یار میرا کیا دماغ خراب ہوا ہے کہ تیرا پتہ چلنے دوں تیرا کیا تو کسی کا ملازم ہے ایسا ہی میں بھی کسی کا نوکر ہوں۔ میں سامنے کھڑا ہوتا ہوں تم بس اشارہ کر دینا پھر اپنے کام میں مست ہو جانا۔ سمجھ گئے ناں۔"

گل شیر خان نے اُسے مطمئن کیا۔

"ٹھیک ہے صاحب۔ میں چلتا ہوں گیٹ پہ — کوئی فون ہی نہ آ جائے۔"

یہ کہہ کر وہ گیسٹ ہوم کے دروازے پر اپنے کیبن میں جا گھسا۔

گل شیر اور اس کے ساتھی اپنی جگہ مستعد تھے جب انہوں نے دور سے ملک اختر ملک کی کار آتے دیکھی۔ حسب توقع وہ کار خود ہی چلاتا ہوا آ رہا تھا۔ شاید یہ گاڑی اُس نے حال ہی میں خریدی تھی یا کسی شوروم سے اُٹھا لایا تھا کیونکہ اس سے پہلے اس کے پاس کسی نے یہ گاڑی نہیں دیکھی تھی۔

چوکیدار نے گاڑی کو دُور سے دیکھا اور کیبن سے باہر آ کر اسی طرح مخصوص انداز میں ہاتھ ہلا دیا جس طرح اُسے گل شیر خان نے سمجھایا تھا۔!

انٹیلی جنس کے خفیہ کیمرے حرکت میں آ گئے اور ان مناظر کی فلمبندی شروع ہو گئی۔ ملک اختر کار سے اُتر کر چوکیدار کو کچھ کہہ رہا تھا۔ انہوں نے تھوڑا کھلا کر اُسے ایک نوٹ چوکیدار کو تھماتے دیکھا جس کے بعد اس نے قریباً جھکتے ہوئے ملک اختر کا شکریہ ادا کیا اور کیبن میں رکھے ٹیلی فون پر اندر اطلاع دی۔

قریباً دو منٹ بعد انہوں نے بینا کشی کو بن سنور کر اسی طرف آتے دیکھا۔ شاید وہ پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی۔

ملک اختر نے گیٹ پر اس کا استقبال کیا۔ دونوں نے بے تکلفی سے ہاتھ ملایا اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ملک اختر کی کار تک آ گئے۔

اُن کے کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہونے تک کا ایک ایک لمحہ کیمرے کی آنکھ نے سلولائیڈ کے پردے پر منتقل کر دیا تھا۔

جیسے ہی کار وہاں سے روانہ ہوئی تین موٹر سائیکل سوار اُس کا تعاقب کرنے لگے اُن میں گل شیر خان بھی شامل تھا جس نے خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ ملک اختر کی نگرانی پر کسی کار کو مامور نہ کیا جائے۔ اس طرح اُسے شک گزرنے کا امکان تھا۔

اب انہیں معروف شاہراہوں سے گزرنا تھا جہاں سے وہ کسی بھی کار کا باآسانی تعاقب کر سکتے تھے۔ تینوں اپنے محکمے کے ذہین آفیسر تھے۔ انہوں نے شہر کے مشہور ہوٹل تک اس طرح اپنی پوزیشنیں بدل بدل کر ان کا تعاقب کیا تھا کہ ملک اختر کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

یوں بھی وہ بینا کشی کے شباب میں اس طرح گم تھا کہ اس کے لیے ایک ہی رستے میں بینا کشی اور سڑک پر نظر رکھنا ہی کار دارد تھا۔ شاید دونوں یہاں اکثر آتے رہتے تھے۔ کیونکہ جیسے ہی وہ ہوٹل کے اندر داخل ہوئے دروازہ کھولنے والے نے بڑی آشنا نظروں سے ان کا استقبال کیا اور اُن کی راہنمائی ایک میز کی طرف کی جہاں پہلے ہی سے کوئی ان دونوں کا منتظر تھا۔

یہ بینا کشی کے بھائیوں میں سے ایک تھا۔

لیکن ——

اس کی اصلیت کچھ اور تھی اور اس اصلیت سے گل شیر خان بخوبی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا یہ پرکاش ہے۔ بھارتی قونصلیٹ کا ایک افسر۔

پرکاش کی سرگرمیاں ہمیشہ سے مشکوک رہی تھیں۔ اس پر شروع ہی سے انٹیلی جنس نے نظر رکھی تھی اور لسانی تنظیم کے لیڈروں کے ہاں اس کا اکثر آنا جانا مشکوک سمجھا جاتا تھا۔ پرکاش کو قونصلیٹ میں ایک طرح سے تنظیم کے آفس کی سی حیثیت حاصل تھی۔ تنظیم کے ذریعے جتنے ویزے اور دیگر مراعات حاصل کی جاتی تھیں۔ اُن کا ذریعہ پرکاش ہی بنتا تھا۔

تینوں کھانے کی پہلے سے ریزرو میز پر بیٹھے تھے اور آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے جس سے انہوں نے یہی اندازہ کیا کہ ان کے پہلے سے گہرے آپس میں تعلقات رہے ہوں گے۔

ملک اختر کو اس مرتبہ پھر احساس نہ ہو سکا کہ اُس کی موجودگی کے دوران ہی ہوٹل کے دروازے پر ایک کار سے ایک نوبیاہتا جوڑا اُتر کر شاید ڈنر کرنے آیا تھا۔ یہ شاید اُن کا پہلا باقاعدہ ڈنر تھا۔ تب ہی تو اُن سے پہلے والی کار سے ایک کیمرہ مین باہر نکلا تھا جس نے اُس کی کار سے اُترتے ہی فلمبندی شروع کر دی تھی۔

یہ شادی شدہ جوڑا بڑے اطمینان سے ان میزوں کی طرف جا رہا تھا جو ملک اختر کے نزدیک خالی موجود تھیں۔

ایسی ہی ایک میز پہ ہوٹل کے ہیڈ ویٹر نے اُنہیں بڑے احترام سے بٹھایا۔ اُسے علم تھا کہ ایسے جوڑے انہیں کتنی ٹپ دے دیا کرتے ہیں۔

کیمرے کا رُخ بظاہر اُن کی طرف تھا لیکن کیمرہ مین کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملک اختر اور اس کے ساتھیوں کی ایک ایک حرکت فلما رہا تھا جبکہ اُن کی آواز کے اور سب کچھ ریکارڈ ہو رہا تھا۔

یہ سارا ڈرامہ گل شیر خان کی ہدایت پر انٹیلی جنس والوں نے ہنگامی بنیادوں پہ تیار کیا تھا۔ اس کے تمام کردار انٹیلی جنس کے لوگ تھے اور دُلہا دُلہن کی آڑ میں دراصل وہ ملک اختر کے خلاف تمام ثبوت سلولائیڈ پہ منتقل کر رہے تھے۔

ملک اختر کے یہاں سے روانگی اور پھر کار پارکنگ میں موجود اپنی کار میں مینا کشی سمیت سوار ہونے تک کی ساری فلم تیار ہو چکی تھی۔ پر کاش کچھ دیر بعد دوسری کار میں گیا تھا۔ کسی نے اُس کا تعاقب نہیں کیا کیونکہ سب جانتے تھے کہ وہ یہاں سے سیدھا قونصلیٹ جائے گا۔ اس ہوٹل میں قونصلیٹ کے اکثر لوگ دوپہر کا کھانا کھانے آیا کرتے تھے اور یہ کوئی

ولی بات نہیں تھی۔

لک اختر کی روانگی کے بعد گل شیر خان نے ہوٹل میں موجود انٹیلی جنس یک "سروس" کے ذریعے اس بات کا دستاویزی ثبوت بھی حاصل کر لیا تھا۔ ـا اختر نے یہ میز اپنے نام سے بُک کروائی تھی۔

مکافاتِ عمل

جبار بھائی نے اگلے ہی روز ہنگامی بنیادوں پر اپنے خاص دوستوں کو اپنے خفیہ ٹھکانے پر اکٹھا کیا تھا اُس نے عارف میاں کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اُس کا نام درمیان میں لائے بغیر اُن لوگوں کے سامنے تنظیم پر قابض ہونے کا [illegible] پیش کیا تھا۔

اس کے ساتھی تو پرویز بھائی کے قتل کے خلاف پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے انہوں نے فوراً اُس کی ہاں میں ہاں ملا دی اور اس کی طرف سے اُٹھائے جانے والے کسی بھی انتہائی اقدام میں اس کا ساتھ دینے کا اعلان کیا تھا۔

جبار بھائی نے انہیں فی الوقت خاموشی سے کام کرتے رہنے کی تلقین کی تھی اور یہ وارننگ بھی دی تھی کہ اگر اس میٹنگ کی خبر یہاں سے باہر نکلی تو اُن میں سے کسی کی بھی خیر نہیں۔ وہ بھی ایسے بے وقوف نہیں تھے کہ حالات کو نہ پہچان پاتے انہوں نے بھی جان لیا تھا کہ باباصاحب مکھن سے بال کی طرح نکل جائے گا اور وقت آنے پر اُنہیں غداروں کی فہرست میں شامل کر کے ساری زندگی انٹیلی جنس کے عقوبت خانوں اور جیلوں کی بھینٹ چڑھانا پڑے گی۔

عارف میاں نے جبار بھائی کی طرف سے سگنل ملتے ہی اپنا کام شروع کر

دیا تھا اور اس ضمن میں وہ آج رخسانہ کی اُس کوٹھی پر موجود تھا جہاں وہ اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ آ چکا تھا۔ شاید باباصاحب کے بعد وہ اس لسانی تنظیم کا سب سے زیادہ خوش قسمت ممبر تھا جس نے اتنی مرتبہ رخسانہ کی خواب گاہ میں قدم دھرا تھا۔

"خیریت ہے۔ آخر ایسی کون سی بات ہے بھئی ـــــ چلو اس بہانے تم نے ہمارے غریب خانے پہ قدم تو رکھا"ـــــ

رخسانہ نے گھر پہنچتے ہی اس سے کہا۔

"بات ہی ایسی تھی مس رخسانہ جو کم از کم اتنی احتیاط کا تقاضا کرتی ہے۔"

عارف میاں نے ایک آرام دہ کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

"اب پہیلیاں ہی بجھواتے رہو گے یا کچھ کہو گے بھی ـــــ"

رخسانہ نے اس کے پہلو میں براجمان ہو کر اُس کے گلے کا ہار بنتے ہوئے کہا۔

"مجھے شک تو پہلے ہی سے تھا لیکن آپ جانتی ہیں کہ میں تصدیق کیے بغیر کوئی بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ شک تو مجھے نفیس میاں پر بھی ہوا لیکن میں نے زبان نہیں کھولی جو بعد میں سچ ثابت ہوا ـــــ مس رخسانہ تنظیم کو تباہ کرنے کی ایک گھناؤنی سازش کا علم ہوا ہے مجھے ـــــ آستین کے سانپ اب باباصاحب کو ڈس کر تنظیم پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔"

عارف میاں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا واقعی تم سنجیدہ ہو ـــــ؟"

اب رخسانہ کے حیران ہونے کی باری تھی۔

"ہاں مس رخسانہ۔ سنجیدہ اس لیے ہوں کہ میں نے ذاتی طور پر اس کھیل میں

ملوث ہو کر ساری معلومات حاصل کی تھیں۔

عارف میاں نے جواب دیا۔

"خدا کے لیے میری قوتِ برداشت کا مزید امتحان نہ لو اور سب کچھ بتا دو۔"

رخسانہ نے بے چینی کا مظاہرہ کیا۔

"مس رخسانہ میں آپ کو سب کچھ بتانے کے لیے ہی یہاں لایا ہوں۔ لیکن میری ایک درخواست ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ باباصاحب کی طبیعت آج کل یوں بھی خراب ہی رہتی ہے۔ وہ ہر وقت سازشوں کی زد میں رہتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ اس عظیم انسان کو ہم مزید ذہنی دباؤ کا شکار کریں۔ اسی لیے میں یہ بات آپ سے اسی درخواست سے کر رہا ہوں کہ فی الوقت یہ بات صرف میرے اور آپ کے درمیان رہنی چاہیے۔ اور ہم کوشش کریں کہ اس معاملے کو بالا بالا ہی حل کر لیں۔ میرا مطلب ہے باباصاحب کو تکلیف دیے بغیر۔ مس رخسانہ آپ جانتی ہیں کہ منشر اور جبار، باباصاحب کے خلاف اکٹھے ہو چکے ہیں اور جلد ہی باباصاحب کے خلاف بہت خطرناک قدم اٹھانے والے ہیں، مس رخسانہ باباصاحب کی جان خطرے میں ہے۔ باباصاحب کو بچا لیجئے۔ خدا کے لیے باباصاحب کو بچا لیجئے۔"

اس نے آخری دونوں فقرے اتنے زبردست فلمی انداز سے کہے تھے کہ خود کو دل ہی دل میں داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

"لیکن۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ دونوں تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے....."

رخسانہ نے بات نامکمل چھوڑ دی۔

"آپ نے بالکل بجا فرمایا میں بھی پہلے یہی سوچتا تھا جب مجھے یہ خبر ملی تھی لیکن بعد میں جب خود اس تجربے سے گزرا تو مجھے یقین ہوا۔ مس رخسانہ مختصر بات یہ ہے کہ جبار نے خود مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بھی بات کر لینے میں کوئی ہرج نہ جانا۔ بہرحال ہم ملے تو اس نے مجھے بتایا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں اس لیے ہمیں ایک دوسرے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے کہا کہ پرویز بھائی کو منشر صاحب نے باباصاحب کے حکم پر مروایا ہے اور باباصاحب تنظیم کے سارے نظام پر اکیلا قابض ہونا چاہتا ہے۔ اس نے باباصاحب کے غیر ملکی بینکوں میں اکاؤنٹس کے نمبر تک بتلائے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ سارے فساد کی جڑ باباصاحب ہے۔ اور جلد ہی وہ ایک خطرناک چال چل کر ان سب کو مروا دے گا کیونکہ ان لوگوں کے بھارتی انٹیلی جنس سے روابط ہیں جن کا علم پاکستان انٹیلی جنس کو بھی ہے۔ اگر وہ اب تک محفوظ ہیں تو صرف اس لیے کہ یہ لوگ تنظیم کی طاقت سے خوفزدہ ہیں لیکن باباصاحب کسی بھی وقت سودے بازی کر کے انہیں مروا دے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ باباصاحب ہر اس نوجوان کو مروا دیتا ہے جس کے متعلق اسے شک ہو جائے کہ وہ مستقبل میں ان کے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ وہ لوگ آپ کے متعلق بھی بہت غلط بکواس کر رہے تھے۔ بہرحال مفادات کے حصول پر جبار اور منشر صاحب اکٹھے ہو گئے ہیں۔ میں نے ان موذیوں کی سازش کا سراغ لگانے کے لیے فی الحال جبار بھائی کی ہاں میں ہاں ملا دی ہے اور اب میں اس کی طرف سے منشر صاحب کو اتحاد کی پیشکش لے کر جاؤں گا۔ مس رخسانہ میں آپ کو پرسوں تک سارے نتائج دے دوں گا۔ اس کے بعد کا لائحہ عمل ہم مل کر طے کریں گے۔"

جیسے جیسے وہ اپنی بات کر رہا تھا رخسانہ کے چہرے پر ایک رنگ آ اور دوسرا جا رہا تھا۔!

اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ عارف میاں کم از کم اس سے جھوٹ نہیں بول سکتے ـــــ اُن دونوں کے درمیان بڑے گہرے اور مضبوط روابط قائم ہو گئے تھے جن کے بعد ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی تھی۔

"عارف ـــــ تم نے میرے ساتھ یہ بات کر کے میری تشویش میں اضافہ ضرور کیا ہے۔ مجھے بھی دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔ جس طرح ممکن ہے اس سازش کا سراغ لگاؤ۔ مَیں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ بابا صاحب کے بعد اس تنظیم میں اگر کسی کو کوئی مقام ملے گا تو تمہیں ملے گا۔ مَیں بابا صاحب کی زندگی میں تمہیں اُن کا نائب بنا دوں گی۔"

اُس نے بڑے جوش سے عارف میاں کے گلے کا ہار بنتے ہوئے کہا۔

"مس رخسانہ ـ مَیں نے زندگی میں کبھی اس بات کا تصور ہی نہیں کیا۔ خدا نہ کرے میں کبھی ایسا سوچوں۔ میرے لیے اگر کوئی ہستی اس دنیا میں بابا صاحب کے بعد ہے تو وہ آپ ہیں ـــــ آپ ـــــ"

عارف میاں نے اس طرح رخسانہ سے یہ بات کہی تھی کہ اُس کے جسم کے سارے تار جھنجھنا کر رکھ دیے تھے۔

کیا واقعی یہ نوجوان اس سے اتنا متاثر ہو گیا ہے؟

رخسانہ نے سوچا اور شیطان نے اس کے کان میں پھونکتے ہوئے اُس کی سوچ کا جواب ہاں میں دے دیا۔ اب عارف اُسے کچھ زیادہ ہی دل و جان سے عزیز ہو گیا تھا۔ اس کی شدید خواہش پر آج پھر عارف میاں کو رات اس کے ہاں بسر کرنی پڑی۔

اس گھر میں گزاری الف لیلیٰ کی دیگر راتوں کی طرح یہ رات بھی اپنے پہلو میں شباب کی ہزاروں رنگینیاں لائی اور رہا کر لے گئی۔

ساری رات رخسانہ اُس پر اپنے جسم کا فسوں پھونکتی رہی۔ عارف میاں کے لیے گو یہ کوئی نیا کھیل نہیں تھا۔

لیکن ـــــ

جس انداز کے داؤ پیچ رخسانہ نے آزمائے تھے۔ اس کے بعد سے اُسے پتا چلا تھا کہ بابا صاحب کہ وہ واقعی گدھا بنانے کی اہلیت رکھتی ہے۔

○

عارف میاں کی طرف سے پیغام ملنے پر منسٹر صاحب نے اُسی روز اُسے ریسٹ ہاؤس میں طلب کر لیا تھا۔ شاید اُن کے خوابوں کی تکمیل ہونے جا رہی تھی۔

"کیا حال ہے عارف میاں۔ ہم غریبوں کو کیسے یاد کر لیا۔ آپ تو "رنگ محل" کے اندر بنے ہوتے ہیں۔ ہم ایسے بے چاروں کی گنجائش کہاں نکل آئی۔"

انہوں نے عارف میاں سے گرمجوشی سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔

"منسٹر صاحب آپ جو کچھ فرما رہے ہیں اس میں ذرّہ برابر شک نہیں لیکن یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ مَیں نے اور میرے جیسے ہزاروں بدقسمت نوجوانوں نے تنظیم میں کسی عظیم مقصد کے لیے شمولیت اختیار کی تھی اور ہم نے کسی بھی طرح قربانی دینے میں کبھی بُخل سے کام نہیں لیا ـــــ لیکن منسٹر صاحب کیا ہماری قربانیاں محض ایک عورت کے ناز نخروں کی بھینٹ چڑھا دی جائیں گی ـــــ ذرا سوچیے۔ ذرا سوچیے ـــــ"

اُس نے پھر بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کیا۔

"عارف میاں یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔"

انہیں شاید عارف میاں کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

" منسٹر صاحب آپ ہمارے بڑے ہیں۔ آپ سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔ آپ
جانتے ہیں کہ بابا صاحب کو گردوں کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے۔ آپ کو اس کی وجہ
کا بھی علم ہے۔ میں اسے سازش سمجھتا ہوں۔ کیا ہم سب آنکھیں بند کر کے یہ تماشا
دیکھتے رہیں۔"

"عارف میاں میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ اس وقت تنظیم
کے نوجوانوں کے دلوں میں کیا ہلچل مچی ہے۔ تم ہی بتاؤ اس صورتِ حال کا حل
کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم نے رخسانہ بیگم کا اصلی روپ تو پہچان لیا۔"

منسٹر صاحب کے دل کی آواز یہی تھی جو عارف میاں کے منہ سے برآمد ہوئی
لیکن وہ چاہتے تھے کہ سب کچھ عارف ہی کہہ ڈالے۔

"میں لمبی بات نہیں کرتا منسٹر صاحب نہ مجھے کسی کا خوف ہے۔ میں سمجھتا ہوں
کہ اب تو انقلابی قدم اٹھانے کا وقت آ چکا ہے۔ اس انقلاب کی کمان آپ نے
سنبھالنی ہے۔ ہم اگر اکٹھے ہو جائیں تو بابا صاحب کو ذمہ داریوں سے سبکدوش کر
سکتے ہیں۔

اس نے بالآخر منسٹر صاحب کے دل کی بات کہہ دی۔

"عارف میاں تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ ہمیں بابا صاحب کو
آرام کرنے کا موقع دینا چاہیئے۔ یوں بھی بیچارے بابا صاحب کے دل و دماغ
پر آجکل رخسانہ بیگم سوار ہے۔ میں نہیں کہتا کہ انہیں قتل کر دیا جائے وہ
شوق سے زندہ رہیں لیکن اب سیاست سے ریٹائرمنٹ لے لیں۔ میرے خیال
سے انہوں نے اتنی دولت جمع کر لی ہے کہ ساری زندگی کسی یورپی ملک میں بادشاہ
کی طرح گزار سکتے ہیں۔ اگر پسند کریں تو رخسانہ بیگم کو بھی ساتھ لے جائیں مجھے
کیا اعتراض ہے۔ اب تنظیم کی قیادت کم از کم ان کے ہاتھوں میں نہیں رہنی چاہیئے

لیکن یہ کام میں اکیلا نہیں کر سکتا۔"

منسٹر صاحب نے کھل کر بات کہہ دی۔

اُن کی گفتگو کا آغاز ہوتے ہی عارف میاں نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا
نکالنے کے بہانے ایک چھوٹا سا بٹن دبا دیا تھا جس سے اب ساری گفتگو ان کے
لباس میں چھپے چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ ہونے لگی تھی۔

"آپ کو "۵۹" کا مکمل تعاون ملے گا۔ منسٹر صاحب میں آپ کے پاس جبار بھائی
کے نمائندے کی حیثیت سے آیا ہوں۔ آپ حیران نہ ہوں۔ سیاست میں دوستیاں
دشمنیوں میں اور دشمنیاں دوستیوں میں بدلتی رہتی ہیں۔ میں بھی بہت حیران ہوا
تھا جب اس کی طرف سے مجھے پیغام ملا کیونکہ وہ لوگ مجھے بھی مخالف کیمپ کا آدمی
سمجھتے ہیں۔ جبار بھائی چند معمولی سی شرائط کے ساتھ آپ کی قیادت تسلیم کرنے
کو تیار ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ سرحد پار والے دوستوں نے اُسے ذہنی طور پر ہیرو
کے طور پر ذہن نشین سمجھ لیا ہے اور وہ اُس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ جبار
بھائی کا آپ کے ساتھ ملنے کا مطلب ہوگا کہ "۵۹" آپ کی جیب میں آ گیا جس کے
بعد بابا صاحب تک رسائی کوئی مسئلہ نہیں رہ جاتی۔"

عارف میاں نے اگلا ترپ کا پتہ پھینکا۔

"عارف میاں کاش ایسا ہی ہو۔ مجھے جبار اپنے بیٹوں کی طرح عزیز ہے
میں اس کے ساتھ ہر وقت ہاتھ ملانے کو تیار رہا ہوں۔ اُسے علم ہونا چاہیے کہ اس
تنظیم میں کچھ بھی بابا صاحب کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا۔ پرویز بھائی سے میری
کیا دشمنی تھی؟ میں اُسے کیوں مرواتا۔ یہ سب رخسانہ کا کیا دھرا ہے۔ اس نے
بابا صاحب کے ذریعے کروایا ہوگا۔ بچانے مجھے کیوں درمیان میں قربانی کا بکرا
بنایا جا رہا ہے۔"

مظفر صاحب نے اپنی دانست میں مکاری کا مظاہرہ کیا۔

"میں اُسے آپ کی اجازت سے یہیں بلا لیتا ہوں۔ اس سے زیادہ اس کی وفاداری کا کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا کہ وہ ہنستا میاں چلا آئے گا۔"

عارف میاں نے اپنی رائے پیش کی۔

"اسے ضرور، عارف میاں۔ میں نے تو کہہ دیا ناں کہ وہ میرے بیٹے کے برابر ہے"

مظفر صاحب کو آنے والے دنوں کے خواب نے ابھی سے بوکھلا کر رکھ دیا تھا اور وہ اقتدار کے نشے میں اندھا ہو کر سانپ اور سیڑھی کے اس خطرناک کھیل میں کود گیا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہاں جبار بھائی موجود تھا۔

دونوں نے عارف میاں کو ثالث مان کر اس کی ہر ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔ حالانکہ دونوں بدنیت تھے اور اپنی دانست میں ایک دوسرے کو بیوقوف بنا رہے تھے۔

اس کا احساس دونوں کو نہ ہو سکا۔

مظفر صاحب نے فنڈ کی تقسیم اور استعمال سے متعلق جبار بھائی کی تمام باتیں تسلیم کر لیں۔ مستقبل کے منصوبے بن گئے۔ منافقوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کامیابی کی صورت میں مل کر لوٹ مار کرنے کے خفیہ معاہدے کر لیے۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ تقدیر اپنا کھیل کھیل رہی ہے

دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ مظفر صاحب نے وہاں بیٹھے بیٹھے جبار بھائی کے ایک رشتہ دار کو تین کروڑ کا ایک ٹھیکہ دے کر اس پر اپنی وفاداری اور دوستی کا سکہ جما دیا۔

تینوں کے درمیان ایک خفیہ سمجھوتہ طے پا چکا تھا۔

اگلے روز اس ٹیپ کی ایک کاپی شیر دل کے پاس اور دوسری رخسانہ کے پاس پہنچ چکی تھی!

جیسے جیسے رخسانہ کیسٹ سن رہی تھی اس کا بلڈ پریشر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

کتنے کا پلا ـــــ!

اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

"دیکھا مس رخسانہ۔ دیکھا آپ نے ـــــ یہ غدار بھی کس ذلت کے مستحق ہیں۔ نالی کے کیڑوں کو بابا صاحب نے آسمان کے ستارے بنایا اور ان کے دماغ خراب ہو گئے ـــــ سالے! بابا صاحب کی جگہ لینا چاہتے ہیں۔ ذلیل انسان، نمک حرام، کمینے....."

وہ بے تحاشا مظفر صاحب اور جبار کو گالیاں بکنے لگا۔

عارف میاں میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان نہیں بھلا پاؤں گی۔ تم میری توقعات سے بڑھ کر عظیم نکلے ہو۔ اب دیکھنا میں ان سب گدھوں کو بتاؤں گی کہ بابا صاحب کے بغیر، میری بات نہیں مانتے۔ میں انہیں مٹا کر خاک کر دوں گی۔ میرے نزدیک ان کے گھوڑوں کی حیثیت ہی کیا ہے۔ اور ہاں تم آج شام گھر پہنچ جانا ـــــ بابا صاحب سے وہیں بات ہو گی۔"

رخسانہ غصے سے باؤلی ہوئی جاتی تھی۔

"مس رخسانہ خدا کے لیے آپ کیوں اپنا بلڈ پریشر بڑھا رہی ہیں۔ ہم جیسے جانثاروں کے ہوتے ہوئے کوئی آپ کی یا بابا صاحب کی طرف میلی نظروں سے دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ بالکل مطمئن ہو جائیں۔ اچھا چلئے کہیں چل کر کافی پیتے ہیں۔"

اس نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔

رخسانہ نے جواب میں اُس سے زیادہ گرمجوشی دکھائی تھی۔

شام تک دونوں اکٹھے رہے۔

شام ڈھلے باباصاحب اپنے دو خاص باڈی گارڈز کے ساتھ بھیس بدل کر یہاں آتے تھے۔ "۹۵" میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ باباصاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔

انہوں نے سیکورٹی کے انتہائی اقدامات کیے تھے اور اس وقت ایک کمرہ میں اُن تینوں کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔

بے چارے باباصاحب اور بے چاری رخسانہ کو اس بات کا گمان ہی نہیں گزر سکتا تھا کہ ان تینوں کی گفتگو عارف میاں کے کپڑوں میں چھپے انتہائی حساس ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ ہو رہی ہے۔

اس نے رخسانہ کے کہنے پر باباصاحب کو دوبارہ ساری رام کہانی سنائی اس کے بعد رخسانہ نے وہ کیسٹ چلا کر سنا دیا۔

باباصاحب نے کیسٹ اپنی جیب میں رکھ لیا اور ایک مرتبہ گہری نظروں سے عارف میاں کا جائزہ لیا۔ ان کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ عارف میاں کو اپنے سارے بدن میں سنسنی کی ایک لہر دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔

باباصاحب کے چہرے سے اُن کے دلی جذبات کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ یہ شخص اپنے جذبات چھپانے پر مکمل عبور رکھتا تھا۔

"عارف میاں! ہم اپنے وفاداروں کے لیے دنیا کی تمام آسائشوں کے دروازے کھول دیا کرتے ہیں اور غداروں کے لیے جہنم کے۔ دشمن کتنے بھی پردوں میں چھپا ہو پہنچ نہیں سکتا ــــ میں اُن کے جسموں سے چمڑی اُتروا دیا کرتا ہوں۔ میرے

نزدیک سے تراشے صنم زندگی کے لیے میرے محتاج ہیں۔ میں خالق ہوں اُن کا ــــ پتھروں میں زندگی ڈالنے اور نکالنے کا فن جانتا ہوں۔ تمہارا شکریہ۔ وقت آنے پر تمہیں توقع سے بڑھ کر انعام ملے گا۔ ان سے کیسے نمٹنا ہے ہم بہتر جانتے ہیں۔ ہماری طرف سے ان غداروں میں گھسے رہو ان کو شک نہ گزرنے دینا۔ میں ایک بردباری میں ان کا علاج کرتا ہوں۔ میں دشمنوں کو زندہ رہنے کے لیے زیادہ مہلت دینے کا قائل نہیں ہوں۔ سانپ کا زہر جتنی جلدی نکل جائے اتنا ہی بہتر۔ بڑا رخسانہ بی ــــ!"

باباصاحب کا موڈ اچانک ہی بدلنے لگا تھا۔

اُن کی رنگین طبع اپنی جولانیوں پہ آ رہی تھی۔

وہ اس طرح نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اس کے لیے یہ کوئی معمولی سی بات ہو جس کی اس کے نزدیک اہمیت نہ ہونے کے برابر ہے۔

لیکن ــــ

اس کے اندر اس خبر کے بعد جو جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا اُس سے بھی عارف میاں لاعلم نہیں تھے۔ وقت اور حالات نے اُنہیں بھی ماہر نفسیات بنا دیا تھا۔

انہوں نے رات کا کھانا دونوں کے ساتھ کھایا اور تھوڑی دیر بعد انعام کی ایک خطیر رقم کے ساتھ عارف میاں کو جانے کی ہدایت کر دی۔ آج رات انہوں نے عارف میاں کی بجائے خود یہاں قیام کرنا تھا۔!

عارف میاں کو اُنہوں نے نارمل رہنے کی تلقین کی تھی۔

○

گل شیر خان بیقراری سے پہلے سے مخصوص جگہ پہ عارف میاں کا منتظر تھا۔ عارف میاں اپنی گاڑی خود چلاتے ہوئے آئے تھے۔ انہوں نے گل شیر خان کو

دیکھ کر گاڑی روکی نہیں تھی اور وہ بھی معمول کے مطابق اُس کے پیچھے آ رہا ٹرک
ایک مخصوص جگہ عارف میاں نے گاڑی روک کر اس کا بونٹ اُٹھایا اور گاڑی خراب ہونے کا
اس طرح اس کے نزدیک ٹرک آ رُکا جیسے مدد کے لیے رُکا ہو۔ عارف میاں نے جھکے جھکے
چھوٹی سی کیسٹ نکال کر اُسے تھمادی اور بونٹ بند کر کے اپنی راہ لی۔

اگلے روز بابا صاحب نے صبح سب سے پہلے جبّار بھائی کو اپنے پاس طلب کیا۔
وہاں پہلے سے منسٹر صاحب اور دو تین کونسلر بھی بیٹھے تھے۔

"حیدر آباد کا معاملہ بہت اُلجھ گیا ہے۔ تم لوگ ابھی روانہ ہو جاؤ اور جس طرح
بھی ممکن ہے دونوں گروپوں کی صلح کرا دو۔ میں حکومت کے سامنے اب مزید تماشا
نہیں بننا چاہتا۔"

اُنہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔

"جو حکم بابا صاحب۔"

جبّار بھائی نے احترام سے جواب دیا۔

بابا صاحب نے انہیں کچھ ہدایات دیں اور چاروں حیدر آباد کے لیے چل دیے
جہاں واقعی گزشتہ پندرہ بیس روز سے تنظیم کے دو گروپوں کے درمیان ٹھن گئی اور
انہوں نے ایک دوسرے پر فائرنگ بھی شروع کر دی تھی۔

انہیں اپنے مشن پر روانہ ہوئے بمشکل ایک گھنٹہ ہُوا تھا جب منسٹر صاحب کو
بابا صاحب سے فوری ملاقات کا پیغام ملا۔ چونکہ آجکل اُن کی بابا صاحب سے گاڑھی
چھنتی تھی اور بابا صاحب اکثر معاملات میں اُن سے مشاورت کرتے رہتے تھے۔
یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

منسٹر صاحب بابا صاحب کے آستانے پر پہنچ گئے۔ دونوں کے درمیان قریباً
ایک گھنٹہ میٹنگ چلتی رہی جب اُن کی سیکرٹری نے اطلاع دی کہ چیف منسٹر صاحب

بابا یابی چاہتے تھے۔
شام کا وقت دے دو۔"

بابا صاحب نے لاپرواہی سے کہا۔
اُنہوں نے منسٹر صاحب سے آج بہت اہم باتیں کی تھیں جس کے بعد انہیں
کر دیا تھا۔ بابا صاحب کی عادت تھی کہ اپنے خاص مہمانوں کو جنہیں عزت دینا
لوب ہوتا بابا صاحب اپنے کمرے کے باہر برآمدے تک رُخصت کرنے آتے تھے۔
برآمدے سے قریباً تیس چالیس گز تک میدان کو پیدل سفر کر کے اپنی کار
جانا ہوتا تھا۔ بابا صاحب نے منسٹر صاحب کو گرمجوشی سے رخصت کیا اور جیسے
واپس مڑے اچانک لڑکھڑا کر گر پڑے۔
ایک کونے میں کھڑے ایک باڈی گارڈ نے اچانک گولیوں کی بارش شروع
کر دی تھی۔ منسٹر صاحب کے جسم میں یکے بعد دیگرے آٹھ دس گولیاں جا گھسیں۔
اُس بے چارے کو تو منہ سے آواز نکالنے کی بھی مہلت نصیب نہیں ہوئی تھی۔
اچانک ہی کسی نے چیخ کر بتایا بابا زخمی ہیں۔
چاروں طرف کہرام مچ گیا۔
درجنوں محافظ اُس طرف دوڑتے چلے آئے جنہوں نے بابا صاحب کے گرد
حصار باندھ لیا اور انہیں اُٹھا کر اندر لے گئے۔
جس باڈی گارڈ نے فائرنگ شروع کی تھی اُس نے "منصوبے کے مطابق" ایک
دوڑ لگا دی لیکن اس بے چارے کو چند قدم ہی بھاگنے کی مہلت نصیب ہوئی
اُس کے جسم پر گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔
مرتے دم اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں کیونکہ اس بے چارے
نہیں بتایا گیا تھا کہ اُسے بھی اسی انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اُس نے

تو حکم کی پابندی کی تھی اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ خود اُسے علم نہیں تھا کہ وہ تو قربانی کا بکرا بن رہا ہے۔ !

بابا صاحب کو ان کے محافظ ہسپتال لے جا رہے تھے۔ !

سارے شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ بابا صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے جس میں منسٹر صاحب مارے گئے ہیں اور بابا صاحب زخمی ہوئے ہیں۔

لیکن ——

سیکورٹی ایجنسیاں پہلے سے کسی بھی طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے ہوشیار تھیں۔ اس لیے شہر نگاراں میں خون خرابہ تو ہوا لیکن معمول سے بہت کم۔

چند گھنٹوں کے اندر اندر حساس علاقوں میں کرفیو نافذ کرنے کے بعد قانون نافذ کرنے والے اداروں کے جوانوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔

⊙

ہسپتال کے باہر بابا صاحب کے عقیدت مندوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

لوگ ہسپتال کی دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے کہ کسی بھی طرح انہیں بابا صاحب کی ایک جھلک دیکھنے دی جائے۔

لیکن ——

بابا صاحب کے خصوصی گارڈز نے کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

ہسپتال کی انتظامیہ کی طرف سے لوگوں سے بار بار اپیل کی جا رہی تھی کہ وہ بابا صاحب کو آرام کرنے دیں، فی الوقت اُن کو ڈسٹرب کرنا اُن کی صحت کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

بابا صاحب ہسپتال میں فروکش تھے جب یہ "افسوسناک خبر" انہیں مل گئی۔
جس کے مطابق جبار بھائی جو اُن کے حکم پہ تنظیم کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے

حیدرآباد گئے تھے اُن پر حیدرآباد پہنچتے ہی قاتلانہ حملہ ہوا جس میں جبار بھائی بھی جاں بحق ہو گئے۔

واقعات کے مطابق جبار بھائی جب تنظیم کے مرکزی دفتر میں اپنے ساتھیوں سے ملاقات کے بعد واپس آ رہے تھے۔ تو وہاں پہلے سے گھات لگائے ایک شخص نے اُن پہ گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ درجنوں گولیاں اُن پہ فائر ہوئیں اور حملہ آور بچ نکلنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔

یہ حملہ بالکل اُسی انداز کا تھا جس طرح یہاں منسٹر صاحب پہ کیا گیا تھا فرق صرف یہ تھا کہ منسٹر صاحب پر حملہ کرنے والے کو موقع پہ مار دیا گیا تھا۔ جب کہ جبار بھائی پر حملہ کرنے والا بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

تنظیم کے مقامی دفتر نے اس حملے کی ذمہ داری حسبِ روایت مخالف لسانی تنظیم پر عاید کر کے اُس کے خلاف دھواں دھار بیانات اخبارات کے لیے جاری کر دیے تھے۔

جیسے ہی اس حادثے کی خبر شہر میں پھیلی چاروں طرف بے چینی پھیل گئی۔ جذبات بھڑکے اور اشتعال انگیز نعروں نے ہجوم کی شکل اختیار کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زبان، نسل، قومیت کے بھیانک شکنجے میں جکڑے معصوم اور ورغلائے ہوئے لوگوں کے انبوہِ کثیر کے احتجاج نے تخریب کاری کا رُخ اختیار کر لیا اور اُن علاقوں میں گھس آئے "را" کے تخریب کاروں نے اُن کی راہنمائی کرتے ہوئے سرکاری دفاتر، مخالف لسانی تنظیم کے عہدیداران کے گھروں اور پولیس چوکیوں تک کا راستہ دکھایا۔

پل بھر میں شہر کا امن تہہ و بالا کر کے رکھ دیا گیا۔

خوفزدہ لوگ چیختے چلاتے بے بسی سے تخریب کاروں کی گولیوں کی بھینٹ

چڑھ رہے تھے۔

ہنگامہ آرائی کی آڑ میں لسانی تنظیم والوں نے چُن چُن کر مخالف لسانی تنظیم کے عہدیداروں کے خون سے ہولی کھیلی۔

اُن کے گھر پھونک دیئے گئے۔

گھروں کو جلاتے ہوئے بطورِ خاص اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ وہاں سے کوئی مقیم اس ظلم کی داستان سُنانے کو زندہ نہ نکل سکے۔

شام تک امن وامان کی حالت اتنی بگڑ چکی تھی کہ انتظامیہ کو بادلِ نخواستہ کرفیو لگانا پڑا اور کئی جگہ ہوائی فائرنگ کر کے جلوس منتشر کرنے پڑے۔

باباصاحب نے ہسپتال کے آرام دہ کمرے میں جہاں وہ ایک کامیاب ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے کے بعد اپنی ٹانگ پر پٹیاں باندھے آرام کر رہے تھے یہ خبر سُنی تو اُن کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک دوچند ہو گئی۔

"مر گیا سالا ــــ کتّے کا پِلّا ــــ ہماری بلّی اور ہمیں کو میاؤں بہت چالاک سمجھتا تھا خود کو ــــ ارے ایسے تو درجنوں مَیں نے چٹکی سے مسل ڈالے اور وہ مُنّا سا بچہ۔ وہ گندی نالی کا کیڑا۔ جسے میں نے زمین سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا وہ تو اپنی اوقات ہی بھول گیا تھا۔ مجھے مارنے چلا تھا ــــ بناتا ہوں تمہیں تنظیم کا چیئرمین ــــ سالے لیڈر بنتے ہیں....." اُس کے منہ سے مغلّظات کا طوفان برآمد ہُوا۔

کمرے میں اُس کی چارپائی سے لگے باباصاحب کے خصوصی درندے بڑے خشوع وخضوع سے اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے اور بڑھ چڑھ کر باباصاحب کو ایک ہی جھٹکے سے دو شکار مار گرانے پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے تھے۔

"باباصاحب! سیاست تو آپ کے گھر کی باندی ہے۔ یہ سالے کل کے لونڈے

کیا جانیں سارے انہیں کیا خبر کہ سرکار سے کیسے نمٹا جاتا ہے ــــ حکومت کیسے کی جاتی ہے ــــ"

نصیر بھائی نے چمچہ گیری میں زبان ہلائی۔

"واہ باباصاحب کمال کر دیا۔ کمال کر دیا آپ نے۔ ایک ہی ہلّے میں دونوں کا صفایا کروا دیا۔"

عارف میاں نے جن کے جسم سے حساس ٹیپ ریکارڈر لٹکا تھا باباصاحب کے منہ سے اقرارِ جرم ریکارڈ کروانے کے لیے فقرہ چھوڑا۔

"ارے عارف میاں ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ مَیں تو غداروں کو زمین کی پاتال تہہ سے نکال کر زندہ درگور کروا دیا کرتا ہوں ــــ چاہیے تو یہ تھا کہ ان دونوں کی کھال میں بھُس بھروا کر انہیں چوراہے میں لٹکا دیتا لیکن بے چاروں کے جسموں میں اتنے زیادہ سوراخ ہو گئے تھے کہ ایسا کرنا ممکن ہی نہیں رہا۔"

باباصاحب نے بھیانک قہقہہ بلند کیا۔

"آپ عظیم ہیں باباصاحب۔"

نصیر بھائی نے نعرہ بلند کیا اور وہاں موجود تمام بھیڑیئے اُن کے ہم زبان ہو گئے۔

○

ہسپتال کے ایک بڑے کمرے میں پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔

اخبار نویس وہاں جمع ہو چکے تھے اور اب باباصاحب کی آمد کے منتظر تھے، جنہوں نے کمال مہربانی سے اتنی "زخمی حالت" میں بھی اُن کے ساتھ گفتگو کا فیصلہ کیا تھا۔

"سب آ گئے کیا؟"

باباصاحب نے جن کے پاؤں پر گولی لگی تھی لیکن جو اپنے قدموں پر کھڑے کمرے میں بے چینی سے چکر کاٹ رہے تھے اپنے خصوصی بھیڑیوں سے دریافت کیا۔

"جی باباصاحب۔ آپ کے منتظر ہیں"

رخسانہ نے جواب دیا جس نے آج باباصاحب کے حکم پر میک اپ سے اجتناب کیا تھا اور بادل نخواستہ سُرخی پاؤڈر کے بغیر ہی پریس کا سامنا کرنے جا رہی تھی۔

"چلو" ——

باباصاحب نے اچانک بے خیالی میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ادھر باباصاحب"

نصیر بھائی نے اچانک اُنہیں یاد دلایا کہ اُن کے تو پاؤں میں گولی لگی ہوئی ہے اور وہ تو چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ اُنہوں نے معذوروں والی کُرسی پہلے سے ہی وہاں منگوا رکھی تھی۔

عارف میاں حیران رہ گئے جب اُنہوں نے دیکھا کہ باباصاحب کے جسم پر تو خراش تک نہیں آئی تھی اور اُنہوں نے پاؤں میں گولی لگنے کا ڈرامہ بھی اپنے پیروکاروں اور حکومت کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے رچایا ہوا تھا۔

عارف میاں کو یاد آ گیا کہ جس سرکاری ہسپتال باباصاحب "زیرِ علاج" ہیں وہ دراصل تنظیم کا ایک قلعہ ہے۔

اس ہسپتال کا چپڑاسی سے ڈاکٹر تک سب باباصاحب کے خاص مرید تھے۔ اُن ہسپتال میں کسی باورچی کی تعیناتی بھی اُن کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتی تھی۔ اُسے علم تھا کہ اس ہسپتال کے بعض کمرے دراصل لسانی تنظیم کا اسلحہ خانہ ہیں جہاں بڑے خطرناک ہتھیار چھپائے گئے ہیں۔ کس کی جرأت تھی کہ وہ اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرتے ہوئے کمزوری کا مظاہرہ کرتا۔

یہاں کے ہر ملازم کا احساس تھا کہ وہ نوکر تو سرکار کا ہے لیکن حکم اُسے باباصاحب کا ماننا ہوگا۔ بصورتِ دیگر نوکری سے چھٹی ہی نہیں بلکہ بھیانک سزا بھی اُس کا مقدر بن جائے گی۔

تھوڑی دیر بعد مریضوں کی کُرسی پر حزن و یاس کی تصویر بنا اس صدی کا سب سے بھیانک اداکار اخبار نویسوں کے سامنے موجود تھا۔

"ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہمارے پاس قربانیوں کی ایک لازوال تحریک موجود ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے اس ملک کے قیام کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے اور ہماری نسل اس ملک کی بقا کے لیے اپنا خون بہا رہی ہے اگر ہمارے دشمن یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھیوں کو شہید کر کے ہمارا راستہ روک لیں گے تو یہ اُن کی بھول ہے۔ ہمارے دشمنوں کی گولیاں ختم ہو جائیں گی لیکن ہمارے سینے اور اُن میں موجود عزائم کبھی دم نہیں توڑ سکتے۔ منظر صاحب اور جبار بھائی کی شہادت نے ہماری منزل کو اور قریب کر دیا ہے۔ ہمارے کارکنوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ اُن کی شہادت سے بُلند ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے مر کر ہمیں جینے کی راہ دکھائی ہے"

باباصاحب کی آواز بھرا گئی تھی۔

اچانک ہی اُنہوں نے اداکاری کا کمال دکھایا اور بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رونے لگے۔

"معزز صحافی حضرات! پرویز بھائی کے بعد منظر صاحب اور جبار بھائی کی رحلت نے باباصاحب کو بہت دُکھی کر دیا ہے۔ ڈاکٹروں نے شدت سے انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے اور فوراً کسی یورپی ملک جا کر فی الوقت موجودہ حالات سے کنارہ کشی کی ہدایت کی ہے لیکن باباصاحب نے ہماری منت سماجت

کے باوجود ڈاکٹروں کی اس ہدایت پہ عمل کرنے سے انکار کر دیا ہے اور زبردستی
آپ سے ملاقات کرنے بھی چلے آئے ہیں۔ باباصاحب کا فرمانا ہے کہ وہ اس نازک
مرحلے پہ اپنے عوام سے ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہیں ہو سکتے۔"

نصیر بھائی نے رندھے ہوئے گلے سے پریشان اخبار نویسوں کے سامنے جھوٹ
کا طومار باندھنا شروع کیا۔

"حضرات! مجھے افسوس ہے میں زیادہ دیر تک آپ سے باتیں نہیں کر سکتا۔
مجھے اپنے کارکنوں کو ایک ہی پیغام دینا ہے کہ وہ ملک و قوم کی سلامتی کے لیے
ان شہادتوں کو بھی دلوں پہ پتھر رکھ کر قبول کر لیں اور خدا کے لیے اُن لوگوں کو
معاف کر دیں جنہوں نے اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ میری اپنے بھائی
بہنوں سے التجا ہے کہ وہ مشتعل ہو کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے ملکی
سلامتی پہ حرف آتا ہے۔ پُرسکون رہیں اور تنظیم کے تمام دفاتر میں شہیدوں کی
روح کو ایصالِ ثواب کے لیے قرآن پاک ختم کروائے جائیں۔ اپنے شہید ساتھیوں
کی موت پہ میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ مجھے اربابِ حکومت سے صرف یہی
پوچھنا ہے کہ کیا وہ ہمیں جرمِ وفا کی سزا دے رہے ہیں۔ ہم حکومت کے حلیف
ہیں لیکن ہمارے ساتھ حریفوں سے بدتر سلوک کیا جا رہا ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو قاتلوں
کو گرفتار کر کے کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ میں حکومت کو وارننگ دے رہا ہوں
کہ قاتلوں کی گرفتاری میں تاخیر سے عوام کا اضطراب بڑھے گا۔ اُن میں بے چینی پیدا
ہو گی اور وہ لا اینڈ آرڈر کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں گے۔ مجھے اور
کچھ نہیں کہنا۔"

اتنا کہتے ہوئے اچانک باباصاحب آگے کی سمت اس طرح جھکے جیسے بے ہوش
ہونے کی تیاریاں کر رہے ہوں پھر انہوں نے اس خباثت کا عملی مظاہرہ بھی کر ہی

دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بے ہوش ہو گئے۔

اُن کے اداکار بھیڑیے۔ "باباصاحب۔۔۔ باباصاحب"۔۔۔ کے نعرے بلند کرتے اُن
کو کرسی گھسیٹ کر اُسی کمرے میں لے گئے۔

اخبار نویسوں کے لیے چائے اور لوازمات کا بندوبست موجود تھا۔

چائے نوشی کے دوران باباصاحب کے چیلے اخبار نویسوں کے سامنے مسلسل
باباصاحب کی عظمت کے راگ الاپتے رہے۔

چائے اتنی بھرپور تھی کہ اخبار نویسوں کے لیے اُن کی باتوں کو سچ ماننے بغیر کوئی
چارہ ہی باقی نہیں رہا تھا۔

عارف میاں کا دل آج پہلی مرتبہ اُن کے قابو سے باہر ہوا تھا۔ اس کا جی چاہتا
تھا کہ ابھی جائے اور تمام منافقوں اور مصلحتوں پہ لعنت بھیج کر اس خونخوار درندے کا
گلا گھونٹ کر مار ڈالے۔

لیکن ۔۔۔

وہ حالات کی کٹھ پتلی بنا سوائے اشاروں پہ ناچنے کے کچھ کرنے سے معذور تھا۔
وہ جانتا تھا کہ اس ملک کے عاقبت نااندیش حکمران جنہوں نے اپنی آنکھوں پہ ہوسِ اقتدار
کی پٹی باندھ رکھی ہے۔ اس بھیڑیے کو جس کی زندگی کا واحد مقصد سوائے انسانیت کی
رگوں سے قطرہ قطرہ خون پینے کے اور کچھ نہیں، اپنا "سیاسی گورو" بنا چکے ہیں۔

اس صوبے کی دس بارہ سیٹوں کے لیے اقتدار کے پجاریوں کی آپس میں دوڑ لگی
ہوئی تھی اور اس کمزوری سے باباصاحب جیسے موذی فائدہ اٹھا رہے تھے۔

وہ جانتے تھے کہ اگر اقتدار پہ قابض گروپ نے اُن کی کسی بھی غیر قانونی حرکت
کا نوٹس لیا تو وہ اُسے دھتکار کر دوسرے کی گود میں بیٹھ سکتے ہیں کیونکہ پلڑہ وہی
بھاری ہوتا ہے جس میں "باباصاحب" اپنا وزن ڈالے۔

قربتیں اور....

عمرانہ نے چند دنوں میں ہی بینا کشنی کا قرب حاصل کر لیا تھا اور آج بینا کشنی اسے اپنے ایک کزن سے ملانے لے جا رہی تھی جس کا نام بینا کشنی نے اُسے سلیم بتایا تھا۔

"بڑی مالدار اسامی ہے اگر تم نے قابو کر لیا تو ساری زندگی عیش کرو گی۔ جس طرح کے گیسٹ ہوم میں ہم رہتے ہیں ایسے دس گیسٹ ہوم تم اپنے لیے بنا سکتی ہو ———"

روانگی سے پہلے اُس نے آنکھ دباتے ہوئے عمرانہ کی طرف جھکتے ہوئے بتایا تھا۔

"اوہ.... دیکھیں گے" عمرانہ نے بھی خالص کاروباری انداز میں اپنے ماتھے پر بالوں کی لٹ جھٹک کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

پروین نے اُس کے انقلابی خیالات سے متاثر ہونے کے بعد اُسے بتایا تھا کہ وہ بھی ایسے ہی عزائم لے کر گھر سے نکلی ہے اور اُس نے بھی عمرانہ کی طرح اپنے گھر بار اور خاندان کے جھنجھٹوں سے نجات حاصل کر لی ہے۔ اُس نے عمرانہ کو کئی راز کروڑ پتی بننے کے بھی نسخے بتا دیے تھے اور آج اسی سلسلے میں وہ اپنے ایک سیٹھ کزن سے اُسے ملانے جا رہی تھی۔

دونوں شہر کے جس فائیو سٹار ہوٹل میں پہلے سے طے شدہ ملاقات کے لیے جا رہے تھے وہاں پہلے سے گل شیر خان اور اُس کے ساتھیوں کے لیے تین میزیں ریزرو تھیں۔

عمران نے بظاہر بڑا ماڈرن اور جدید تراش خراش کا لباس زیب تن کیا تھا۔ لیکن ——

پروین کو اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ اُس کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ایک چھوٹا سا نہایت جدید ریکارڈنگ سسٹم بھی موجود ہے جو دس گز دور سے بھی معمولی سی آواز ریکارڈ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

انہیں لینے کے لیے ایک قیمتی کار گیسٹ ہوم آئی تھی۔ اس کار کی آمد اور اس میں موجود ڈرائیور کی علم بندی انٹیلی جنس کے کیمرہ یونٹ نے آسانی سے اس طرح کر لی تھی کہ اُسے احساس ہی نہ ہو سکا۔ ان لوگوں نے کار سوار کی آمد سے بہت پہلے ہی اپنے لیے محفوظ ٹھکانہ تلاش کر لیا تھا اور کار کی آمد سے پروین اور عمران کے اس میں سوار ہونے تک کی مکمل تفصیلات سلولائیڈ کے فیتے پر منتقل ہو چکی تھی۔

○

گیسٹ ہوم سے ہوٹل تک کسی نے اُن کا تعاقب نہیں کیا۔

ہوٹل میں اُن کے استقبال کے لیے گل شیر خان اور اُس کے ساتھی پہلے ہی سے چشم براہ تھے۔ کار واپس چلی گئی اور دونوں ڈائننگ ہال میں چلے آئے جہاں پہلے ہی سے اُن کی ٹیبل ریزرو تھی۔ جس پر ایک درمیانی عمر کا شخص اُن کا منتظر تھا۔

"سلیم" کہتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ عمران کی طرف بڑھایا تھا جس نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے اُسے اپنے نام سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

"پروین نے آپ کی اتنی تعریف کی کہ مجھے خواہ مخواہ ملاقات کا شوق چرایا۔"

اُس نے گفتگو کی تمہید باندھی۔

"جی شکریہ۔ میں بھی پروین کے کہنے پر ہی آپ سے ملنے آیا ہوں۔"

عمران نے بظاہر ایسا ہی تاثر دیا تھا جیسے اُس پر ملاقات کا احسان جتلا رہا ہو۔ اُس نے اپنی میز سے تیسری میز پر گل شیر خان اور اُس کے ساتھی کو بیٹھے دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔ اور اب اُس کا اعتماد پہلے سے بھی دو چند ہو گیا تھا۔

سلیم نامی شخص جو اُس کے سامنے بیٹھا تھا گل شیر خان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سلیم نہیں بلکہ نسیم بھائی ہے۔ لسانی تنظیم کے تخریب کار گروپ کا فعالی سرغنہ۔

لسانی تنظیم کے تخریب کار گروپ کے لوگ بہت کم ہی منظر عام پر آیا کرتے تھے۔ یہ تمام لوگ "را" کے تربیت یافتہ اور انتہائی خطرناک سمجھے جاتے تھے۔ انہیں بھارتی انٹیلی جنس کی طرف سے باقاعدہ ہدایات دی جاتی تھیں اور لسانی تنظیم کی آڑ میں دراصل یہ لوگ "را" کے آلہ کار بن کر ملک میں دہشت گردی کی وارداتیں کرتے تھے۔

سلیم کے کھانا منگوانے تک عمران نے اُس پر اپنی "ترقی پسندی" کا جادو چلا لیا تھا۔

"سلیم صاحب مجھے دراصل دیر سے اس بات کی سمجھ آئی کہ اس دنیا میں ہر رشتے کی پہچان دولت سے ہے۔ باقی سب فراڈ ہے اور مجھے تو اب بہر صورت اسی کو حاصل کرنا ہے۔ میں نے پروین کو بتایا ہے کہ میں جلد ہی یورپ کا چکر لگانے والی ہوں۔ ایک رابطہ ہوا ہے اور ادھر کسٹم میں اپنی ٹھیک ٹھاک واقفیت بھی ہے۔ ایک چکر ہی میں ساری زندگی کی روٹیاں اکٹھی کر لوں گی۔ باقی پھر دیکھا جائے گا۔"

اُس نے آدھے گھنٹے کی گفتگو کے بعد بالآخر سلیم کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی

کے انداز میں کہا۔

"مس عمرانہ! آپ کو اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ اگر آپ کو سب کچھ یہاں بیٹھے بٹھائے ہی مل جائے تو کیسا رہے؟"

سلیم نے بے حیائی سے آنکھ دبائی۔

"ونڈرفل ۔۔۔ شاندار ۔۔۔ کیا ایسا ممکن ہے؟"

عمرانہ نے اپنی دانست میں خاصی بے قراری دکھائی تھی۔

"یہ جگہ کچھ مناسب نہیں لگتی آئیے اوپر بیٹھ کر بات کرتے ہیں یہاں ہمارے نام پر ایک دو کمرے ہمیشہ ریزرو رہتے ہیں۔"

سلیم نے کہا۔

"چلئے ۔۔۔"

عمرانہ اس طرح اُٹھ کر کھڑی ہوئی تھی جیسے اس وقت اُس کے لیے اس سے زیادہ ضروری کام اور کوئی نہ رہا ہو۔

اس کی اس حرکت پر مناکشی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے آنکھ دبا کر خاص اشارہ کیا تھا جس سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ یہ چڑیا تو خودبخود پنجرے میں پھنس رہی ہے۔

اُس کی اس حرکت کو تیسری میز پر بیٹھے گل شیر خان نے نوٹ کر لیا تھا۔

"چلئے مس عمرانہ ۔۔۔ آپ واقعی بہت سمارٹ ہیں ۔۔۔ بڑی زبردست شے ہیں آپ۔"

پھر جین نے اُسے بے ہودہ سا اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ اس ہوٹل کے تیسرے منزل پر بنے کمرے میں موجود تھے ۔۔۔ اُن کے ہال سے باہر نکلنے پر گل شیر خان اپنی میز سے اس طرح اُٹھ کر

باہر آیا تھا جیسے اُسے کسی مہمان کا انتظار ہو جو اب تک نہیں آیا اور وہ اُسی کو دیکھنے جا رہا ہے۔

عمرانہ نے اُسے دیکھ کر نامحسوس انداز میں گو اُس تک یہ پیغام منتقل کر دیا تھا کہ وہ ابھی اس ہوٹل میں مقیم ہیں۔

لیکن ۔۔۔

گل شیر خان نے احتیاطاً دوسری لفٹ کے ذریعے اُن کے کمرے تک اُن کا پیچھا کیا تھا پھر کمرے کا نمبر پڑھ کر مطمئن ہو کر واپس لوٹ آیا۔

سلیم نے عمرانہ کو بڑے احترام سے کرسی پر بٹھایا تھا اور دونوں اُس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے لیے کافی کمرے ہی میں منگوالی تھی۔

"مس عمرانہ مجھے آپ کے خیالات سے صد فی صد اتفاق ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ انسان خواہ مخواہ اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالے آپ کو قدرت نے حسن کی لازوال دولت بخشی ہے۔ آپ کے پاس اس سے زیادہ مؤثر ہتھیار کوئی نہیں اس ملک میں قدم قدم پر آپ کو بے شمار ایسے گدھے مل جائیں گے جو آپ کے ایک اشارہ ابرو پر اپنا دل بھی ہتھیلی پر نکال کر رکھنے کو تیار ہو جائیں گے۔ آپ کو بس ہمارے لیے اُن سے رابطہ رکھنا ہو گا۔ دیکھئے مس عمرانہ ہم بزنس میں ہیں اور سرکار دربار سے ہمارا کام لگا ہی رہتا ہے۔ کوئی بھی ڈیل ہو گی اُس میں سے آپ کو بھی اچھا حصہ مل جایا کرے گا ۔۔۔ فی الحال تو میرے پاس آپ کے لیے بہترین آپشن یہی ہے۔"

ادھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد سلیم نے اُس سے کہا۔

"سلیم صاحب! میں ایک بات صاف صاف بتا دوں کہ اس بزنس میں ہماری حیثیت ایک پارٹنر کی ہو گی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں ۔۔۔"

اُس نے سلیم کے دل میں اگر کوئی شبہات باقی تھے تو بھی یہ بات کر کے نکال دیئے اور اُنہیں اُمید ہو گئی کہ واقعی یہ لڑکی ہوس کی ماری ہوئی ہے اور دولت کے اندھوں کی اُن سے زیادہ ضرورت اور کسے ہو سکتی تھی۔

"ویل ڈن۔ مس عمرانہ آپ کا اور ہمارا ساتھ خوب نبھے گا۔ ہمیں بھی ایسے ہی دوست چاہئیں جو بزنس کو بزنس سمجھیں۔ یقیناً ایسا ہی ہو گا جیسا آپ چاہیں گی لیکن ہم اپنے دوستوں سے یہ اُمید ضرور رکھتے ہیں کہ وہ وقت آنے پر ہمارا ساتھ دیں اور ایک دوسرے کو اکیلا چھوڑ کر نہ بھاگیں۔"

سلیم نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"یہ بات قبل از وقت ہے سلیم صاحب اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا کہ کس نے کس کا ساتھ دیا اور کون میدان چھوڑ کر بھاگا۔"

عمرانہ نے دو بدو جواب دیا۔

ابھی تک اُنہیں عمرانہ کی کسی حرکت پر شک تک نہیں گزرا تھا۔

سلیم تو یہ سوچ رہا تھا کہ یہ اُس کی پہلی ڈیل نہیں بلکہ وہ اس میدان کی منجھی ہوئی کھلاڑی ہے۔ اُس کی گفتگو سے کم از کم یہی اندازہ ہو رہا تھا۔

"مس عمرانہ آپ کی ملاقات پھر کبھی ہمارے ایک سرکاری دوست سے کرائیں گے۔ اس سے آپ کو ہمارے طریقِ کار کا اندازہ ہو جائے گا۔ میں صرف ایک ہی بات کہوں گا کہ آپ کی اور ہماری بقا اسی میں ہے کہ ہم کام کی نوعیت جانے بغیر صرف اپنے کام سے غرض رکھیں۔ بہت سی باتوں کا علم بسا اوقات بہت نقصان دہ ہوتا ہے۔ میں آپ کو ابتدا ہی میں بتا دوں کہ ہمیں عموماً تجارتی معاملات سے متعلق سرکاری دستاویزات کی ضرورت بھی رہتی ہے۔ جس کے لیے ہم منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ آپ

ہمیں سرکاری افسر کی نشاندہی کریں اُس سے تعلقات اُستوار کر کے اُسے اپنے دام میں پھانسنا ہی آپ کی اہلیت تصور ہو گا۔ بظاہر آپ ایسی سمجھدار اور خوبصورت خاتون کے لیے یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں لیکن دراصل یہی وہ کام ہے جس کی قیمت ہم لاکھوں میں ادا کریں گے۔"

عمرانہ کو اچھی طرح سمجھ آ رہی تھی کہ یہ شخص جن "تجارتی دستاویزات" کا ذکر کر رہا ہے وہ دراصل کون سی دستاویزات ہیں؟

دراصل یہ لوگ اُسے اندھیرے میں رکھ کر اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے تھے۔ اور یہی ان کا طریقِ واردات بھی تھا جس میں اکثر اُنہیں کامیابی نصیب ہوتی تھی۔

کتنے خطرناک لوگ تھے یہ؟

اس طرح تو وہ معمولی سی فلرٹ قسم کی لڑکی کو بھی اپنے جال میں پھانس سکتے تھے۔ اُس لڑکی بے چاری کو تو یہی بتایا جاتا ہو گا کہ وہ معمول کے مطابق جسم فروشی کر رہی ہے۔

لیکن ——

دراصل اس کی آڑ میں کتنا بھیانک کھیل کھیلا جا رہا تھا؟

عمرانہ کو اندازہ ہو گیا کہ اخبارات میں جو خبریں "را" کی طرف سے پاکستان لائی جانے والی فاحشہ عورتوں کی ہوتی ہیں جن سے "را" والے جاسوسی کی خدمات لیتے ہیں۔ اصل میں یہ بھارتی لڑکیاں کم اور مقامی بدقسمت لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں اور یہ وہی لڑکیاں ہوتی ہیں جنہیں سلیم جیسے "را" کے پالتو کتے اُن کے لیے پھانستے ہیں۔

"مسٹر سلیم میں آپ کی بات کا مطلب بخوبی سمجھ گئی ہوں گو مجھے یہ کہنا نہیں چاہیے لیکن میں آم کھانے سے غرض رکھتی ہوں۔ اس زمانے میں گٹھلیاں گننے رہنے کی مہلت

کے یسر ہے لیکن میری یہ خواہش ضرور رہے گی کہ اگر آپ لوگوں کے لیے بات غیر ضروری نہ ہو تو میں جاننا چاہوں گی کہ میں دراصل کس کے لیے کام کر رہی ہوں اس طرح کم از کم مجھے اپنی اہلیت اور کام کی بھی اہمیت کا احساس رہے گا۔"

اس نے ہوا میں تیر چلایا۔

"بہت سی باتیں مس عمرانہ وقت سے پہلے جان لینا اچھا نہیں لگتا۔ اس طرح بات کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے آپ ہمارا اعتماد حاصل کریں گی ویسے ویسے آپ کو مختلف نوعیت کی جانکاری بھی حاصل ہوتی جائے گی لیکن میں لیے بغیر نہ رکھے یہ بات ابھی سے بتا دوں کہ ہمارے معاہدے میں یہ بات شامل نہیں ہوئی کہ آپ کو کام کی نوعیت بھی سمجھائی جائے یہ ہماری "ڈسکریشن" ہو گی عین ممکن ہے کہ ابتدا ہی میں ہم آپ کو وہ کچھ بتا دیں جو شاید کسی کو کبھی نہیں بتاتے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ہم آپ کو کبھی کچھ نہ بتائیں۔"

سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں مسٹر سلیم۔"

عمرانہ نے مزید سوالات کر کے بنا بنایا کھیل بگاڑنے کی بجائے فی الوقت تیل اور تیل کی دھار کو دیکھنے کا ہی فیصلہ کیا تھا۔

"یہ ہماری پہلی ملاقات کا نذرانہ اور دوستی کی ابتدا ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنا بریف کیس کھولا اور بڑے نوٹوں کی دو گڈیاں اُس کے سامنے رکھ دیں۔

"تھینک یو ——"

عمرانہ نے دونوں گڈیاں گنے بغیر اپنے بڑے سے پرس میں منتقل کر لیں تھوڑی دیر بعد پیرو بن نے وہیں سے فون پہ ایک نمبر ملایا اور دوسرے

ہی لمحے ملک اختر لائن پر تھا جس نے انہیں ایک دوسرے ہوٹل میں پہنچنے کی تلقین کی تھی۔

"او کے سلیم صاحب نائس میٹنگ۔"

عمرانہ نے سلیم کی طرف بے تکلفی سے ہاتھ بڑھایا۔

"آف کورس۔"

سلیم نے اُس سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور دونوں کو لفٹ تک چھوڑ کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

دونوں لفٹ سے نیچے اُتریں تو لفٹ کے دروازے کے سامنے لابی میں رکھے آرام دہ صوفے میں دھنسا گل شیر خان اُن کا منتظر تھا۔

"اسی طرف چلتے ہیں۔"

عمرانہ نے بے تکلفی سے اپنی ساتھی کا ہاتھ تھام کر اُس کا رُخ ایگزٹ کے بجائے نزدیکی ہال کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ باہر جانے کا راستہ نہیں!"

پیرو بن نے حیرانگی سے کہا۔

"مجھے علم ہے محترمہ لیکن ہیرے میری کمزوری ہیں اور یہاں ڈائمنڈ کی نمائش چل رہی ہے۔ کیا خیال ہے؟"

عمرانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ونڈر فل —— سپلینڈڈ —— واقعی تم جیسی عورت کی کمزوری ہیرے ہی ہونے چاہئیں۔"

میناکشی نے اُس کی طرف دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

دونوں ہوٹل کے اُس ہال کی طرف جا رہے تھے جہاں مقامی کمپنیوں کی طرف

سے ہیروں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اُن کے یہاں پہنچنے کے بمشکل دو منٹ
بعد ہی گل شیر خان بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اُس نے شوکیس میں سجے ہیروں کو
بائیں ہاتھ سے دیکھنا شروع کیا تھا جب کہ عمرانہ اور بینا کشی نے دائیں ہاتھ سے۔
بینا کشی کے لیے اس نمائش میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا وہ ہیرے
دیکھنے کے بجائے انہیں حاصل کرنے پر یقین رکھتی تھی۔

لیکن ــــ

اُسے عمرانہ کی ہر ادا فی الحال برداشت کرنی تھی۔ اُس نے ہیروں سے
اُکتا کر دیوار میں لگی پینٹنگز کو مرکزِ نگاہ بنا لیا تھا اور اُس وقت بھی ایک پینٹنگ
ہی دیکھ رہی تھی جب عمرانہ نے موقع غنیمت جانا اور پھرتی سے نامحسوس انداز
میں گل شیر خان کے قریب پہنچ گئی۔

دونوں بظاہر ایک شوکیس پہ جھکے اُس میں سجائے قیمتی ہیروں کو بڑے
غور سے دیکھ رہے تھے اور اُن کی طرح یہاں موجود باقی تماشائی بھی اپنے
اپنے خیال میں مگن تھے۔

"گرینڈ لے ہوٹل' ہم اس وقت جا رہے ہیں۔"

عمرانہ نے جھکے جھکے اُس کے کان میں سرگوشی کی اور آگے بڑھ گئی۔
گل شیر خان نے اس کی طرف دیکھے بغیر اُس کا پیغام نوٹ کر لیا تھا اور
اب وہ خراماں خراماں ہال کے باہری دروازے کی طرف جا رہا تھا۔

"سوری ــــ ویری سوری ــــ مجھے علم ہے کہ تم بور ہو رہی ہو لیکن
کیا کروں ان ہیروں کے شوق نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔"

عمرانہ نے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی بینا کشی کے نزدیک جا کر کہا۔

"اوہ نو ــــ اِٹس او۔ کے"

بینا کشی نے بے تکلفی سے اُس کے کندھے پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔
دونوں ٹہلتی ہوئی باہر آ گئیں۔ انہوں نے ہوٹل کے کاؤنٹر سے "رینٹ
اے کار" سے پرائیویٹ کار حاصل کی تھی اور اب گرینڈ لے ہوٹل کی طرف جا رہی
تھیں جہاں ملک اختر شام کی چائے پہ اُن کا منتظر تھا۔

دونوں کے استقبال کے لیے یہاں گل شیر خان اور اُس کے ساتھی پہلے
سے موجود تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے ملک اختر پہچان سکتا۔
ان کے لیے اس ہوٹل کے ایک محفوظ کونے میں ایک میز ہمیشہ ریزرو رہا
کرتی تھی۔

○

عمرانہ کی شکل پہ نظر پڑتے ہی ملک اختر کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ اُس نے
کھڑے ہو کر اُس کا استقبال کیا تھا اور اُس وقت تک کھڑا رہا جب تک عمرانہ
بیٹھنے سے کرسی پہ بیٹھ نہ گئی۔

"ملک صاحب آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟"

اچانک ہی بینا کشی نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا شاید وہ اُسے صورتحال
کا احساس دلانا چاہتی تھی۔

"کچھ نہیں ــــ دراصل میں کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا تھا آپ کی دوست
کی شخصیت سے۔"

اختر ملک کہے بغیر نہ رہ سکا۔

تینوں نے خاصا محفوظ گوشہ تلاش کیا تھا۔ اس وقت یہاں زیادہ لوگ
زور نہیں تھے۔ کیونکہ اس ہوٹل میں سنیکس بھی لنچ کے بعد پڑتے تھے اور
کم ہمت والا ہی اِدھر کا رُخ کرتا تھا۔

مینا کشی نے دونوں کا تعارف کروانے کے بعد ملک اختر کو بتایا کہ "بھائی جان" نے عمرانہ کو بھی اپنا بزنس پارٹنر بنالیا ہے اور اب وہ بھی اس سے رابطہ قائم کیا کرے گی۔

"زہے نصیب۔"

ملک اختر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

عمرانہ کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اتنی گھٹیا ذہنیت رکھنے والے اس گدھے کو کس نے اتنی اہم اور حساس پوسٹ پر تعینات کیا تھا لیکن پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ اس معاشرے میں ملک اختر اپنی نوعیت کی کوئی واحد مثال نہیں۔ سارا ملک ہی اقربا پروری، کرپشن اور غنڈہ گردی کی سیاست میں الجھا ہوا ہے۔ جب کوئی قوم اپنی اخلاقی اقدار کا بیڑہ غرق کرنے پر خود ہی تل جائے تو پھر وہاں ملک اختر جیسی مثالیں ہی دیکھنے کو ملیں گی۔

اُس کے دل میں اس شخص کی شکل پر نظر پڑتے ہی نفرت پیدا ہو گئی تھی لیکن اُس نے جبراً اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا رکھی تھی۔

مینا کشی نے ملک اختر کے سامنے عمرانہ کو اُن احتیاطی تدابیر سے آگاہ کیا جو اُس سے ملاقات کے لیے ضروری تھیں۔ اُس نے عمرانہ سے کہا کہ اُسے ان تدابیر پر سختی سے عمل کرنا ہو گا۔!!

"آپ کے پورٹ والے کام سے بھائی جان بہت خوش ہیں۔"

مینا کشی نے ملک اختر کو بتایا۔

"ارے ہم تو غلام ہیں آپ کے۔ آپ کہیے تو خود سمندر میں چھلانگ لگا دیں۔"

ملک اختر کھینگی پر اُتر آیا تھا۔ اسے بن پیے ہی نشہ ہونے لگا تھا۔

"ملک صاحب کل جو لانچ یہاں سے جا رہی ہے اُس میں ہمارے دس بہت

... دم کر ہیں جنہوں نے دوسری طرف جانا ہے۔ کل آپ نے بطور خاص خود ... تے پر موجود رہنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دوسرے محکمے والے افسر اعلیٰ نے ... نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ بھائی جان اس بات پر بہت برہم ہیں کہ وہ ... کے معاملات میں ٹانگ اڑانے والا کون ہے؟"

مینا کشی نے کام کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

"مجھ پر چھوڑ دو میری جان ـــــ ایسے کئی افسر اعلیٰ آئے اور گئے۔ خدا ... نے ان لوگوں کو کباب میں ہڈی بننے میں کیا مزا ملتا ہے۔"

ملک اختر نے اس کی تشویش دُور کرتے ہوئے کہا۔

"مس عمرانہ کی ملاقات آپ نے اپنے دوست سے کروانی ہے" ـــــ اُس ... عمرانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مس عمرانہ ہمیں جس شخص سے تجارتی دستاویزات حاصل کرنی ہیں اُس ... ملک صاحب آپ کو پہنچا دیں گے۔ اس کے بعد آپ کا کام شروع ہو گا۔ ... ایک بات کہنا ضروری سمجھتی ہوں کہ کبھی بغیر وجہ کے ملک سے رابطہ نہیں کرنا ... اسی میں ہماری بہتری ہے۔"

اُس نے اپنی بات مکمل کی۔

دونوں عمرانہ کی موجودگی میں اگلے روز روانہ ہونے والی کسی لانچ سے ... گفتگو کرتے رہے۔ عمرانہ نے اُن کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ اس ... کے ذریعے کچھ لوگوں کو غیر قانونی طور پر بھارت پہنچایا جائے گا۔ جنہوں ... نے وہاں موجود "را" کے تربیتی کیمپوں میں تخریب کاری کی تربیت حاصل ... کرنی ہے۔

انہوں نے اپنی گفت گو میں زیادہ اصطلاحیں ایسی استعمال کی تھیں جن کی

عام آدمی کو سمجھ نہیں آسکتی تھی لیکن اُس کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

"اب چلیں ـــ جلدی ملاقات ہو گی۔"

مینا کشی نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایکسکیوزمی ـــ میں ذرا باتھ روم تک ۔ ۔ ۔ ۔"

عمرانہ نے اُن سے اجازت طلب کی اور باتھ روم کی طرف چل دی۔

اُس کے باتھ روم کی طرف جاتے کے بمشکل دو منٹ بعد ہی گل شیر خان بھی اُس طرف جا رہا تھا۔ مردانہ اور زنانہ باتھ روم ایک دوسرے کے سامنے بنے ہوئے تھے جن کے درمیان دیوار بنا کر پردہ کیا گیا تھا لیکن اس طرف جانے والا راستہ ایک ہی تھا۔

گل شیر خان راستے کے کنارے پر اس طرح کھڑا تھا کہ ہال میں موجود لوگ اُسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

اُسے یہاں کھڑے بمشکل ایک منٹ ہوا تھا جب اُس نے زنانہ باتھ روم کی طرف سے قدموں کی آہٹ سُنی دوسرے ہی لمحے عمرانہ کی شکل اُسے دکھائی دی جس نے اپنے ایک ہاتھ میں وہ چھوٹی سی ٹیپ تار سمیت لپیٹ کر پکڑی ہوئی تھی جسے اُس نے اب تک اپنے کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔

ٹیپ اُس نے اتنی ہوشیاری سے گل شیر خان کے پھیلے ہوئے ہاتھ پہ رکھی تھی کہ اگر کوئی اُن کی طرف دیکھ بھی رہا ہوتا تو اندازہ نہ کر پاتا۔

عمرانہ ڈائننگ ہال کی طرف چل دی تھی اور گل شیر خان ٹیپ سنبھالتا باتھ روم کی طرف چلا گیا تھا۔

"چلئے جناب!"

اُس نے مینا کشی سے کہا۔

بھئی ہمارے غریب خانے پر کب لا رہی ہو مس عمرانہ کو۔"

ملک اختر نے اُٹھتے ہوئے مینا کشی سے کہا۔

ملک صاحب آپ گھبرائیے نہیں، مَیں کسی سفارش کے بغیر خود ہی بہت جلد آپ سے ملنے آ رہی ہوں۔ مجھے تو نجانے کب سے آپ کی تلاش تھی۔

بظاہر یہ بات عمرانہ نے اس انداز سے کہی تھی کہ ملک اختر کی باچھیں کھل اُٹھیں۔

عظمت کے مینارے

ٹیپ ریکارڈر اُن کے سامنے دھرا تھا اور اُس کی آواز ایک بڑے سپیکر کے ذریعے دونوں تک بڑی واضح ہو کر پہنچ رہی تھی۔ اس میں اُس لانچ کے متعلق گفتگو موجود تھی جس کو ملک اختر کی غداری کے ذریعے پاکستانی سمندروں کا تقدس پامال کرنا تھا۔

"سر! میرے خیال سے مزید انتظار کرنا یا ان لوگوں کو موقع دینا مناسب نہیں۔ اب آپ کو جرأتِ ایمانی سے کام لے کر کچھ کر گزرنا چاہیے۔"

گل شیر خان جس کی رگوں میں انگارے دوڑنے لگے تھے بولا۔

"ہاں گل شیر خان۔ مزید انتظار مناسب نہیں ہو گا۔ تم نے ٹھیک کہا۔ اس لانچ میں بندو خان بھی جا رہا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ کسی بھی طرح ہمارے ہاتھوں سے بچ نکلے۔"

افسرِ اعلیٰ کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔

وہ تمام مصلحتوں پر لعنت بھیج کر کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اُن کی وفاداری ملک سے تھی۔ سٹیٹ سے تھی۔ غدار کوئی بھی ہو حاکم یا محکوم اُن کے نزدیک قابلِ معافی نہیں تھا۔

وہ بابا صاحب کو چوہے دان میں پھانسنے کے لیے اُسے بِل سے نکالنا ضروری

سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے نوجوان آفیسر گل شیر خان اور عارف میاں کی مدد سے بڑی مہارت اور محنت سے بابا صاحب کے گرد ایسا جال بُن دیا تھا جس سے اس کا بچ نکلنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔

"گل شیر خان! کل رات کو گیارہ بجے مجرم ہمارے شکنجے میں ہوں گے جس کے ذرا بعد تم ملک اختر کو قابو کر لو گے۔ عمران سے کہو اس انڈین لڑکی پر کڑی نظر رکھے اور ملک اختر کے ساتھ ہی اُسے بھی قابو کر لے۔ میں ملک اختر کے وارنٹ گرفتاری آج رات تک بہر صورت حاصل کر لوں گا۔ ناؤ گیٹ سٹارٹ۔"

انہوں نے کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ گل شیر خان کی طرف بڑھایا۔

"رائٹ سر!"

گل شیر خان نے محبِ وطن افسرِ اعلیٰ کا ہاتھ فرطِ عقیدت سے جھک کر چوما۔ اور اُن کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ جانتا تھا کہ بھیڑیوں کے اس بھٹ میں ہاتھ ڈالنے والا یہ مائی کا لال کسی [illegible] والی کا جنا ہے جو اپنی عزت، جان اور مال کی پرواہ کیے بغیر ملک کی سلامتی کے لیے اپنی جان سے گزرنے پر تُل گیا تھا۔

اس نے جس خطرناک کام کا بیڑہ اٹھایا تھا اس میں اُسے نوکری ہی سے نہیں جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے لیکن اس کے افسرِ اعلیٰ نے کسی مصلحت کو اپنے فرض پر غالب نہیں آنے دیا تھا۔

خداوندا! اس عظیم انسان کو اپنی پناہ میں رکھنا۔ اس کی حفاظت کرنا میرے مولا کریم۔ یہ لوگ ہماری آبرو ہیں۔ یہی وہ چند 'افسرِ اعلیٰ' ہیں جن کی نیتوں کا صدقہ ابھی تک یہ ملک سلامت ہے ورنہ جس طرح چاروں طرف سے درندوں نے اس پر یلغار کر رکھی ہے اور ہماری آستینوں کے سانپ جو اپنی دھرتی کے لیے کوڑھ

بنے ہوئے ہیں جس طرح ان وحشیوں سے بڑھ چڑھ کر تعاون کر رہے ہیں اُن کے بعد تو یہاں سے غیرتِ ملی کا جنازہ اُٹھ چکا تھا۔ خدائے ذوالجلال یہ ملک تیرے نام پر حاصل کیا گیا تھا پینتالیس سال سے یہ وطن فروش تیرے اُن بندوں کو جو اپنے ہی خون کا سمندر عبور کر کے اس مملکتِ خداداد تک پہنچے تھے دوبارہ غلام بنا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اِلہ العالمین! اگر تیرے نام پر حاصل کردہ اس ملک کے بدقسمت عوام کی زندگیوں اور آبروسے چند لٹیرے اسی طرح کھیلتے رہے تو ہم جیسے گناہ گار بندوں کا ایمان تیری رحمت اور منصفی سے اُٹھنے لگے گا۔ یا اللہ! انصاف کر — انصاف کر — اور ان وحشیوں کو اُسی ذلت آمیز موت سے دوچار کر جو اُن سے پہلے والوں کا مقدر بنی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر بے اختیار اُس کا سر میز سے جا لگا!

آنسو تھے کہ اُس کے آہنی وجود کو طوفانی ریلے کی طرح بہائے لیے جاتے تھے۔

اُس نے اپنے سینے میں گھٹی آہوں کو زندگی میں پہلی مرتبہ اخراج کی راہ دکھائی تھی۔

اُس کے دل پر دھرا سارا بوجھ جس نے اُس کے وجود کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیا تھا۔ آنسوؤں کی اس طغیانی میں اس طرح بہا کہ اُسے اپنا وجود گلاب کے پھول کی طرح ہلکا پھلکا اور کھلا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اپنی ہتھیلیوں کی پشت سے اُس نے آنکھوں کے راستے رخساروں تک بہہ آنے والے آنسوؤں کو سمیٹا اور باتھ روم کے شیشے میں آج ایک بدلے ہوئے گل شیرخان کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

گل شیرخان نے اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالے اور اُس کا آنسوؤں میں دھلا چہرہ نکھر گیا۔ ایک مسکراہٹ سچائی کے ابدی حسن کی طرح اُس کے ہونٹ چوم گئی۔

رات ایک پہر بیت چکی تھی جب وہ اپنے گھر پہنچا۔

○

صبح بیدار ہونے پر اُسے والدہ نے بتایا کہ عارفہ نے شام کے بعد دو تین مرتبہ فون کر کے اُس کی خیریت دریافت کی ہے۔

عارفہ کو اس کے فون نمبر کا علم تو تھا لیکن اُس نے شاید ہی کبھی گل شیرخان کو فون کیا تھا۔ اس طرح اچانک اُس کی طرف سے دو فون آنے کی اطلاع نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

اُس نے پہلی فرصت میں عارفہ سے رابطہ ضروری جانا۔ عارفہ نے اُسے ہنگامی صورت میں اپنے ایک ہمسایہ کا نمبر دیا ہوا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اُس نے وہی نمبر گھما دیا۔

دوسری طرف سے کسی ادھیڑ عمر خاتون نے فون اُٹھایا تھا۔ گل شیرخان نے مقامی لوگوں کے سے انداز میں بات کرتے ہوئے اُنہیں عارفہ کو بلانے کے لیے کہا اور اپنا وہ نام بتایا جو اُس نے عارفہ کو کبھی بتا رکھا تھا۔ عارفہ اور گل شیرخان دونوں ہی نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے محلے میں بھی کسی کو گل شیرخان کی اصلیت کا ظاہر ہو کیونکہ اس علاقے کو لسانی تنظیم کا گڑھ سمجھا جاتا تھا جہاں اپنی مرضی سے زندگی بیتنے کی کم از کم سزا موت تھی۔

جتنی دیر فون ہولڈ رہا اُس کے دل کی دھڑکن بڑھتی رہی۔ خدا خدا کر کے فون پر اُسے ایک مہربان آواز سنائی دی۔ گل شیرخان نے اندازہ لگا لیا کہ یہ عارفہ کی ماں کی آواز ہی ہو سکتی تھی جس نے شاید ہمسایوں کو مطمئن کرنے کے لیے اُس کی خیریت دریافت کرتے ہوئے فون اپنی بیٹی کو تھما دیا تھا۔

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

اُس نے فون پہ عارفہ کی گھبرائی ہوئی آواز سُنی۔

"کیا بات ہے کیا پریشانی ہے۔ خیریت تو ہے ناں۔ میں گھر سے بول رہا ہوں۔"

گل شیر اس کی آواز سُن کر پریشان ہو گیا تھا۔

"امی کی طبیعت خراب ہے۔ میں امی کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے کر آ رہی ہوں آپ بھی وہیں آجائیں۔"

عارفہ نے کہا اور گل شیر خان نے فون پہ ہی اندازہ کر لیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے شاید اسے خوف تھا کہ کوئی اُن کی باتیں نہ سُن رہا ہو اور اس خوف کے پیشِ نظر اس نے یہ بات کر دی تھی۔ اُس کے شک کی تصدیق بھی تب ہو گئی جب عارفہ نے اُس سے دو تین اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد فون پہ ہی سرگوشی کے انداز میں اُس ہوٹل کا نام لے دیا جہاں وہ اکثر جایا کرتے تھے۔

"عارفہ میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں شاید تم کسی مسئلے پہ بہت پریشان ہو لیکن گھبرانا نہیں۔ تم جس طرح بھی ممکن ہو اس وقت اپنی امی کو ڈاکٹر کے ہاں لے جانے کے بہانے ہوٹل پہ پہنچو میں تمہارا منتظر ہوں اور اپنے اوسان بحال رکھو کسی کو شک نہ ہونے دینا۔ اچھا خدا حافظ۔"

اُس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ اپنے اُس عزیز کا نمبر گھما رہا تھا جس کے ہوٹل میں عارفہ نے آنا تھا۔

"حسن خان"۔ اُس نے لائن ملنے پہ دوسری طرف سے کسی کی آواز پہچانتے ہوئے کہا۔ "میرے مہمان آ رہے ہیں۔ اُن کی ہر ممکن حفاظت کرنا۔ اپنے لوگوں کو چوکس کر دو۔ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔"

"گل شیر خان مطمئن رہو۔ کوئی اُن کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔"

حسن خان کی پُر اعتماد آواز نے اُس کا حوصلہ بڑھا دیا۔

اگلا نمبر اُس نے اپنے افسرِ اعلیٰ کا گھمایا تھا۔ جنہیں فون پہ اُس نے عارفہ اور اپنے تعلقات کی نوعیت اور اپنے اندازے سے اُنہیں پیش آمدہ خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے اُن کی مدد طلب کی تھی۔

"میں اس علاقے کی "پیٹرول" کو ہدایت دے رہا ہوں۔ حوصلہ رکھنا۔ ہم اُنہیں آسانی سے شکار نہیں کھیلنے دیں گے۔ مطمئن رہنا۔"

افسرِ اعلیٰ نے اُسے فون پہ تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ماں کے بضد ہونے پہ اُس نے جیسے تیسے دودھ کا ایک گلاس زہر مار کیا اور اپنی جیپ کو اُڑاتا ہوا ہوٹل تک پہنچا تھا جہاں حسن خان اور اُس کے ساتھی پوری طرح چوکس تھے۔

"ابھی تک تو نہیں آئے تم کہو تو ہم لوگ خود......"

حسن خان نے اُس کی شکل پہ نظر پڑتے ہی کہا۔

"نہیں لالہ! ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ ہمیں کچھ دیر انتظار کر لینا چاہیئے۔"

اس نے جیپ ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی کی تھی اور خود اُس سڑک پہ آ گیا تھا۔ جس سے عارفہ کی آمد ممکن تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی اُسے ایک آٹو رکشا کے تعاقب میں اپنے محکمے کی ایک جیپ آتی دکھائی دی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ افسرِ اعلیٰ نے اس کی بات کو سیریس لیا ہے اور وہ لوگ ماضی کی طرح اُسے کسی اور سانحے سے دوچار کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

جیپ اُس کے نزدیک رُکی تو گل شیر خان نے ہاتھ کے اشارے سے "سب اچھا" کا سگنل دے کر اُنہیں واپس بھیج دیا۔

آٹو رکشا، ماں بیٹی نے احتیاطاً ہوٹل سے کچھ فاصلے پہ کھڑا کیا تھا اور اُس

وقت تک وہاں کھڑی رہیں جب تک کہ رکشا اُن کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔ جس کے بعد ہی وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتیں ہوٹل میں داخل ہوئی تھیں۔

حسن خان نے خود اُن کا استقبال کیا تھا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر اُس کمرے تک آیا تھا جو اُس کی دانست میں یہاں کا بہترین اور محفوظ ترین کمرہ تھا۔ اُس نے دونوں ماں بیٹی کو تسلی دے کر مطمئن رہنے کو کہا تھا اور ماں بیٹی دونوں نے اُس کے اعتماد اور احترام سے اندازہ کر لیا تھا کہ کم از کم یہاں وہ محفوظ ہیں۔

○

گل شیر خان کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ عارفہ کی آنکھوں میں جانے کب سے رُکے ہوئے آنسو بے اختیار چھلک پڑے۔ اُس نے جن آنکھوں سے گل شیر خان کی طرف دیکھا تھا اُس سے تو گل شیر خان کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اُس کا سامنا عارفہ کی ماں سے ہو رہا تھا۔

"عارفہ حوصلہ کرو، مجھے کچھ بتاؤ آخر بات کیا ہے؟"

گل شیر کو اُلجھن ہونے لگی تھی۔

"میں بتاتی ہوں بیٹا۔"

خوفزدہ بوڑھی عورت نے جس کے سر میں چاندی اُتر آئی تھی اور جو اپنی روایات کے بالکل برعکس آج نجانے کس مجبوری کے عالم میں یہاں چلی آئی تھی۔ شاید عام حالات میں وہ کبھی ایسا نہ کرتی۔

"بیٹا میں تمہیں صرف اس حد تک جانتی ہوں کہ تم نجمہ کے بھائی ہو، مجھے اس بات کا علم نہیں کہ عارفہ سے تمہارے تعلق کی کیا نوعیت ہے۔ نجمہ ہماری بچیوں کی طرح ہمارے گھر آیا کرتی تھی لیکن میں نے تمہیں اس سے پہلے نہیں دیکھا صرف اتنا علم تھا کہ تم سیکورٹی کے افسر ہو۔ بیٹا تم ہماری مجبوری اور بے بسی کا اندازہ

ہی بات سے لگا لو کہ آج مجھے تمام حجاب اور روایات ایک طرف رکھ کر عارفہ کے والے سے تمہارے پاس آنا پڑا ہے۔ بیٹا ہم تو لُٹ گئے؟"

اتنا کہہ کر انہوں نے بھی رونا شروع کر دیا۔

"ماں جی حوصلہ کیجئے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے سامنے ہونے والی کسی بھی زیادتی کا حساب لیا جائے گا کسی بھی زیادتی کا۔"

اُسے خود اپنا لہجہ بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"تنظیم والوں نے کل ابو کو بلایا تھا انہوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں اگلے روز بھی آج شام کو اُن کی "عوامی عدالت" میں پیش نہ ہوئی تو اس کی سزا سارے خاندان کو بھگتنا پڑے گی۔"

عارفہ نے اپنا حوصلہ قائم کیا۔

"لیکن کیوں؟ وہ حرام خور کون ہوتے ہیں تمہیں اپنی عدالت میں طلب کرنے والے۔ انہیں کس نے اس کا اختیار دیا ہے؟"

گل شیر کے لیے اپنے غصے پر قابو پانا ممکن نہیں رہا تھا۔

بیٹا! انہیں کس نے اختیار دیا ہے؟ حیرت ہے اس سوال کا جواب تو ہمیں تم سے مانگنا چاہیے تھا کیونکہ سرکار کی نمائندگی تو تم کرتے ہو۔ بلایا انہوں نے اس لیے ہے کہ انہیں خدا جانے کس طرح اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ عارفہ کے تمہارے ساتھ تعلقات ہیں اور لسانی تنظیم کے کسی دشمن کے ساتھ تعلق کا مطلب اپنی موت کے بلیک وارنٹ سائن کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ میرے خیال سے تم میری بات سمجھ گئے ہو گے۔"

عارفہ کی ماں نے بھی اب خود پر قابو پا لیا تھا اور قدرے تلخی سے اُس کی بات کا جواب دیا تھا۔

"انھوں نے کل میر صاحب کو اپنے پاس بُلا کر انہیں اپنی بیٹی کے اس جرم سے آگاہ کیا اور انہیں قوم کا غدار قرار دیتے ہوئے اس غداری کی سزا سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حکم دیا ہے کہ وہ آج رات تک اپنی بیٹی کو اُن کے حضور پیش کریں تاکہ ملزمہ براہِ راست اُن کے سامنے اپنے جُرم کا اقبال کرے اور وہ اُسے سزا دے سکیں"

بوڑھی اور بے کس عورت نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"ماں جی! میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں اب آپ کچھ اور نہ بتایئے۔ میں آپ کو صرف ایک بات کی ضمانت دے سکتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں کوئی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ میں سرکاری ملازم یا پولیس آفیسر ہوں بلکہ اُس تعلق کے حوالے سے کہہ رہا ہوں جو قدرت نے ہمارے درمیان قائم کر دیا ہے میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری یہ بات بہت عجیب لگی ہے کہ ایک معمولی سا آفیسر ہونے کے ناطے میری حیثیت ہی کیا ہے ارباب حکومت جس کی چوکھٹ پہ ماتھا رگڑتے ہوں اور جس سے اقتدار کے تسلسل کی بھیک مانگتے ہوں اس کے سامنے ایک معمولی سے سرکاری ملازم کی حیثیت ہی کیا ہو گی لیکن آپ سے صرف ایک بات کہتا ہوں کہ اب ہاتھی نے چیونٹی کو اپنے پاؤں تلے روندنا چاہا ہے۔ طاقت اور اقتدار کے نشے میں بدمست بے ضمیر فروش درندے ہاتھی کی طرح مضبوط درخت کو تو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک سکتے ہیں لیکن چیونٹی سے نہیں ٹکرا سکتے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ ان وحشیوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ چونکہ جب چاہیں انسانی قوانین کی دھجیاں اُڑا دیتے ہیں اس طرح شاید وہ قانونِ قدرت کا بھی مذاق اُڑانا چاہتے ہیں لیکن وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ میری بہن نجمہ میرے ارادوں میں ابھی زندہ ہے۔ میں اب کسی کو نجمہ کی طرح بے بسی کی موت نہیں مرنے دوں گا۔ میری صرف

ایک درخواست ہے کہ اب چند روز کے لیے میرے کہنے پر عمل کر لیجئے۔ اس میں ہم سب کی بقا اور بھلائی ہے"

بوڑھی عورت کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اُس کے زخموں پر بڑے آرام سے پھاہا رکھ کر اُسے پُرسکون نیند سُلا دیا ہو۔

شجانے کیوں کوئی نادیدہ قوت انہیں بار بار اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر گزرنے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔

"بیٹا! اب خدا کے بعد تم ہی ہمارا سہارا ہو۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم تمہارے دروازے پہ کیوں دستک دیتے۔ بیٹے تمہیں دیکھنے سے پہلے میں نے تمہارے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی تھی۔ لیکن مجھے اس بات کی اُمید ضرور تھی کہ میری تربیت کبھی مجھے دھوکہ نہیں دے گی۔ ایک ماں ہونے کے ناطے مجھے آج اپنی بیٹی عارفہ پر فخر محسوس ہوا ہے"

معزز خاتون نے کہا اور خاموشی اختیار کر لی۔

حسن خان نے اس کے لیے کمرے میں چائے کا بندوبست کر دیا تھا اور بیرہ چائے کے کر آ رہا تھا۔ شاید دونوں نے کل سے پانی کو بھی منہ نہیں لگایا تھا کیونکہ اُن کے ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی تھیں۔

گل شیر خان کے لیے بضد ہونے پر انھوں نے چائے کے ساتھ ایک آدھ بسکٹ لیا۔ اس دوران اُس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"میں ابھی حاضر ہوا"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر حسن خان کے دفتر میں آ گیا جہاں سے اُس نے فون پہ پھر اپنے افسرِ اعلیٰ کا نمبر براہِ راست ملا کر انہیں مختصراً پیش آمدہ صورتِ حال سے باخبر کرتے ہوئے اُن کی رائے طلب کی تھی۔

"ان لوگوں کو فوراً "سیف ہاؤس" میں پہنچا دو۔ آج رات کے ایکشن کے بعد صبح باقی معاملات دیکھ لیں گے۔ یوں بھی فی الوقت اس سے زیادہ اُن کی کوئی مدد نہیں ہو سکتی کہ اُن کی جان بچالی جائے۔ ورنہ "عوامی عدالت" کے نام پر ان وحشیوں نے جو روز اکھاڑے سجا رکھے ہیں وہاں سے کسی کا زندہ بچ نکلنا معجزے والی بات ہو گی۔ میں چھ نمبر پارٹی کا چارج تمہیں دے رہا ہوں۔ اُن کی مدد سے "کوئیک ایکشن" کرو۔ "ایٹ ونس"۔

افسرِ اعلیٰ کا رویہ اُس کے ساتھ سگے بھائیوں سے بڑھ کر ہمدردانہ ہو رہا تھا۔

"تھینک یو سر، شکریہ سر!"

اُس کا شکریہ سننے سے پہلے افسرِ اعلیٰ نے فون بند کر دیا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ کمرے میں واپس پہنچ چکا تھا۔ اس دوران ماں بیٹی نے ایک آدھ بسکٹ اور زہر مار کر لیا تھا۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ دونوں اب قدرے پُرسکون ہیں۔

"آپ لوگوں کو چند دنوں کے لیے ہم اپنے ایک "سیف ہاؤس" میں منتقل کر رہے ہیں یہ آپ کی حفاظت کے لیے ناگزیر ہے۔ مجھے افسوس ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ دکھائی نہیں دیتا کہ آپ کو چند دنوں کے لیے اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا۔ آپ دونوں یہاں سے میرے ساتھ جائیں گی اب آپ کا گھر جانا ہماری اطلاعات کے مطابق خطرے سے خالی نہیں۔ آپ کی دونوں بیٹیاں، بیٹا اور میر صاحب بھی آپ کے پاس آج شام تک پہنچ جائیں گے۔ کیا آپ کے لیے میر صاحب سے ٹیلیفون پر رابطہ ممکن ہے؟"

اُس نے دونوں ماں بیٹی سے کہا جن کے چہروں پر خوف نے ڈیرے جما لیے تھے لیکن محفوظ ہو جانے کے احساس کی پرچھائیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

"بیٹیا ان کے آفس میں فون ملا کے دیکھ لو۔"

عارفہ کی والدہ نے یہ کہتے ہوئے میز پر دھری سلپ پر پنسل سے اُن کا نمبر لکھ دیا۔

گل شیر نے عارفہ کو سمجھانے کے بعد اُس کمرے سے میر صاحب کا فون نمبر ملایا اور عارفہ کو فون تھما دیا۔

عارفہ نے فون پر اپنے باپ سے بڑے پُرسکون لہجے میں ساری بات بتائی اور انہیں یہ بتا کر کہ انھوں نے نجمہ کے بھائی کی مدد حاصل کر لی ہے فون گل شیر خان کو تھما دیا تھا۔

گل شیر خان نے میر صاحب کو دو تین منٹ میں سب کچھ سمجھا دیا اور ساتھ ہی انہیں تنبیہہ کر دی کہ اُن کی گھبراہٹ سے سوائے اُن کے خاندان کی عزت اور جان داؤ پر لگنے کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔ اس لیے وہ ہمت سے کام لیں اور جس طرح اُنہیں کہا جا رہا ہے اُسی پر عمل کریں۔

میر صاحب بھی گرم سرد چشیدہ تھے اسے تائیدِ غیبی جانا اور اُس کی بات ماننے پر تیار ہو گئے۔

"آپ کے پاس ہمارے دوست چند منٹ بعد پہنچ رہے ہیں۔" اُس نے میر صاحب کو اپنے دوستوں کی پہچان کرواتے ہوئے اُن سے کہا کہ وہ اپنے دفتر میں فوراً دس دن کی چھٹی کی درخواست دے آئیں اُن کا میڈیکل سرٹیفکیٹ وہ لوگ اُن کے آفس پہنچا دیں گے۔

فون رکھ کر اُس نے اطمینان کا سانس لیا کہ یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے پا گیا۔

"اُٹھیے آپ لوگ میرے ساتھ چلیں۔"

اس نے ماں بیٹی سے کہا۔

تینوں تھوڑی دیر بعد گل شیر خان کی جیپ میں اُس کی ایجنسی کے ایک سیف ہاؤس کی

کی طرف جا رہے تھے۔

"سیف ہاؤس میں اُسے محفوظ ہاتھوں کے حوالے کر کے اُس نے اپنے دفتر کی راہ لی ابھی اُسے بہت کام کرنا تھا۔

میر صاحب تک ان لوگوں نے آدھ گھنٹہ میں رسائی حاصل کر لی تھی اور چند منٹ بعد ہی چار مسلح کمانڈوز سفید پوشوں کے ساتھ میر صاحب ایک بڑی پجیرو جیپ میں اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں اُن کی خوفزدہ دونوں بچیاں بے چینی سے اُن کی منتظر تھیں۔

میر صاحب نے اپنی بیٹیوں کی مدد سے چند منٹ کے اندر اندر ضروری کپڑے اور دیگر سامان سمیٹا اور تین بڑے اٹیچی کیسوں کے ساتھ سارے گھر کو تالے لگا کر نیچے اُتر آئے جہاں ایک مجمع جمع ہونے لگا تھا۔

اُن کے ہمسایوں نے شاید تنظیم کے مقامی دفتر کو اطلاع کر دی تھی کہ اُن کے "غدار" جان بچا کر فرار ہونے کے چکر میں ہیں۔

جیسے ہی یہ اطلاع وہاں پہنچی فوراً پندرہ بیس مقامی غنڈوں کے ساتھ علاقے کا کونسلر جو شکل ہی سے دس نمبری غنڈہ دکھائی دے رہا تھا پہنچ گیا۔

"کون ہو تم لوگ ـــــ کیا کرنے آئے ہو ـــــ جانتے نہیں یہ یامین کونسلر کا علاقہ ہے تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی ؟"

اُس نے جیپ کے باہر کھڑے سفید پوشوں کو اپنی دانست میں ڈانٹ پلائی۔

یہ بات تھی بھی بڑی عجیب، واقعی اس علاقے میں کسی بھی سرکاری اہل کار کو داخل ہونے سے پہلے تنظیم کے مقامی دفتر پر حاضری دے کر اپنی آمد کا مقصد بیان کرنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد یہ تنظیم کے سرکردہ لوگوں کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا کہ وہ اُسے اپنا کام کرنے کی اجازت دیں گے یا نہیں ـــــ!!

اس طرح آج تک کسی نے براہِ راست اُن کی "حکومت" کو للکارنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

لیکن ـــــ

ان بے چاروں کو اس بات کا تو احساس ہی نہیں تھا کہ کبھی اُن کا پالا کسی محبِ وطن افسرِ اعلیٰ سے بھی پڑ سکتا ہے جو تمام مصلحتیں خاطر میں لائے بغیر اپنے جذبۂ ایمانی کے بل بوتے پر اُن کی "سٹریٹ پاور" کو چیلنج بھی کر سکتا ہے۔

"کونسلر صاحب جائیے اپنا کام کیجئے ہم یہاں سرکاری کام سے آئے ہیں۔"

"اُن میں سے ایک نے اُس کی بات کا جواب اس طرح دیا جیسے ہاتھ سے اُن پر بیٹھی مکھی اُڑا رہا ہو۔

"کیا ہم اُس کام کی نوعیت جان سکتے ہیں ؟"

کونسلر یامین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہم سرکاری طور پر ایسا کرنے کے مجاز نہیں۔ نہ ہی ہم اپنے افسران کے علاوہ خود کو کسی کے سامنے جوابدہ خیال کرتے ہیں۔"

اُس سفید پوش نے لاپرواہی سے کہا۔

"دیکھئے جناب آپ معاملات کو خراب کر رہے ہیں۔ ہماری اجازت کے بغیر آپ یہاں سے کسی کو نہیں لے جا سکتے۔"

کونسلر کچھ زیادہ ہی گرم جوشی دکھا رہا تھا۔

"دیکھو مسٹر تم جو کوئی بھی ہو، ہمارے کام میں مداخلت نہ کرو۔"

اُس سفید پوش نے جواب دیا۔

"ابے تیری تو....."

کونسلر یامین نے اُسے گالی دیتے ہوئے اپنی دانست میں اس کے منہ پہ

طمانچہ مارا تھا۔

لیکن ـــــ

جیسے ہی اُس نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا دوسرے ہی لمحے اُسے یوں لگا ہوا جیسے اس کے بازو کی ہڈی درجنوں ٹکڑوں میں بٹ گئی ہو۔

آہنی گرفت نے اُس کا بازو فضا میں جکڑا اور اُسے جھٹکا دے کر اس طرح زمین پر پھینکا کہ وہ منہ کے بل زمین چاٹ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ اس کی غنڈہ فورس حرکت میں آئے باقی تینوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی آٹومیٹک بندوقیں مجمع کی طرف تان لیں۔ اس کے ساتھ ہی سفید پوش نے زمین پر گرے کونسلر کی دھنائی شروع کر دی۔ اُس نے اپنے ہاتھوں کو تکلیف دیے بغیر صرف پاؤں کی ٹھوکروں سے درجنوں بے گناہوں کے قاتل اور لسانی تنظیم کے مقامی ٹارچر سیل کے انچارج کا مار مار کر حلیہ بگاڑ دیا۔

لسانی تنظیم کے غنڈوں کا واسطہ آج تک اس قسم کے "سرکاری لوگوں" سے نہیں پڑا تھا۔ انہوں نے یہی دیکھا تھا کہ مقامی پولیس کے بیشتر اہلکار سرکار کے کم اور تنظیم کے زیادہ وفادار ملازم تھے۔

تنظیم کے غنڈوں نے شہر نگاراں کے بہت سے علاقوں کی طرح یہاں بھی اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی یہاں اُن کا حکم چلتا تھا اور یہاں کے مکینوں کے لیے نہ صرف اس غیر قانونی حکومت کے احکامات پر عمل پیرا ہونا ضروری تھا بلکہ اس نام نہاد حکومت کے اخراجات بھی انہی کو ادا کرنے پڑتے تھے ـــ!!

یہ لوگ غلاموں کی زندگی جی رہے تھے۔

ان کی بہو بیٹیاں لسانی تنظیم کے وحشی درندوں کی ہوس رانیوں کی بھینٹ چڑھ رہی تھیں اور اس بربریت کے خلاف زبان نہیں کھول سکتی تھیں۔

ان کے جگر گوشوں پر اُن کی آنکھوں کے سامنے اس جبلت کے ساتھ جبر کے پہاڑ توڑے جاتے تھے کہ اگر اُن میں ہمت ہے تو وہ حکومت سے انصاف طلب کر لیں۔

خود پر اٹھائے جانے والے مظالم کے خلاف ان لوگوں کو زبان ہلانے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی تھی۔ اس شہر کے چوراہوں پر ایسی لاشیں عام ملا کرتی تھیں جن کی کھال اُن کے بدن سے نوچ کر الگ کر لی جاتی تھی۔

انسانی بربریت کی تاریخ ایسے گھناؤنے مظالم کی مثال پیش نہیں کر سکتی تھی جو ان لوگوں پر ٹوٹ رہے تھے۔

لیکن ـــــ

خوف زدہ ہرنوں کی طرح بے بسی سے تمام ظلم برداشت کر رہے تھے۔

آج جب طویل مدت بعد انہوں نے اس محلے میں لاء اینڈ آرڈر کو اپنی اصل شکل میں عمل پیرا ہوتے دیکھا تو وہ دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ گئے۔

وہ حیرت زدہ یامین کونسلر کو پٹتے دیکھ رہے تھے۔

کسی کی ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر اُسے چھڑا لیتا۔

سفید پوش نوجوان نے مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا اور اب حالت یہ تھی کہ چند منٹ پہلے تک خود کو زمین پر فرعون سمجھنے والا لسانی تنظیم کا غنڈہ کونسلر زخمی سانپ کی طرح جس کا زہر نکل چکا ہو زمین پر لوٹنیاں کھا رہا تھا۔

سفید پوش نوجوان اب پاؤں کے بل زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے یامین کونسلر کا گریبان اپنے ایک ہاتھ سے پکڑ کر اُسے کھڑا کیا اور دوسرے ہاتھ کو تکلیف دیے بغیر اُسے سر سے اونچا کر کے زمین پر پٹخ دیا۔

"امید ہے اب نہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا ہو گا۔"

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا جدھر سے بہر اب اپنی پردہ دار بیٹیوں کے ہمراہ اٹیچی کیس سنبھالے اُس کی طرف آ رہے تھے۔

اُس نے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھ سے اٹیچی کیس تھامے اور ایک ایک کر کے اطمینان سے پیچھے رکھ دیے۔ تینوں باپ بیٹیوں کے اندر بیٹھنے پر اُس نے دروازہ احترام سے بند کر دیا تھا۔

میر صاحب کو آج احساس ہُوا تھا کہ یہ لوگ اندر سے کتنے بزدل ہیں۔ اُن میں سے کسی کو یہ ہمت بھی نہیں ہو سکی تھی کہ وہ زمین پر گرے کونسلر بابر کو کھڑا کرنے کے لیے اپنا سہارا پیش کر دیتا۔

"کاش کوئی ایک تو ہم میں سے ایسا ہوتا جو ان کی غنڈہ گردی کا اس طرح منہ توڑ جواب دینے کی ہمت کرتا۔ کاش کوئی ایک ——— کوئی ایک اپنی ماں کا جنا تو ایسا ہوتا ——— شاید انہیں پھر کبھی یہ ذلت کی زندگی جینے پر مجبور نہ ہونا پڑتا۔"

میر صاحب نے سرگوشی کے انداز میں اپنی بیٹیوں سے کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ابا میاں۔ افسوس یہاں کی ماؤں نے مرد کم اور زنخے زیادہ پیدا کیے افسوس۔ ——— ورنہ شاید ہمیں بھی اس طرح اپنا گھر چھوڑ کر نہ بھاگنا پڑتا۔"

ان کی منجھلی بیٹی نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اتنے زہریلے لہجے اور تیز الفاظ میں اُن سے بات کی تھی۔

"یہاں تماشہ لگا ہے کیا، کیا دیکھ رہے ہو تم لوگ بے غیرتو، کب تک اپنی بہو بیٹیوں کا چارہ ان وحشیوں کے سامنے پھینکتے رہو گے۔ کبھی سوچا ہے تم نے ——— ہٹ جاؤ پرے ہٹ جاؤ۔"

بندوق بردار سفید پوش نے کھا جانے والی نظروں سے اُنہیں گھورتے ہوئے ڈانٹا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کا بس چلے تو انہیں کچا چبا جائے۔

میر صاحب اپنی بیٹیوں اور بیوی کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹے بعد انٹیل جنس کے ایک "سیف ہاؤس" میں پہنچ چکے تھے۔ اُن کا بیٹا لیاقت مقامی انجینئرنگ کالج کا طالب علم تھا اور آج کل گھر کے بجائے ہوسٹل میں رہتا تھا تاکہ یکسوئی سے اپنی پڑھائی جاری رکھ سکے۔

زمین کا کوڑھ

بندو خان کے ساتھ دس ننھے "مُرغے" جنھیں لسانی تنظیم کے مختلف ونائے "دا" نے منتخب کیا تھا ایک بڑی ویگن میں ساحل سمندر کی طرف جارہے تھے۔
اس ویگن پر بظاہر سواریوں والی ویگن کا گمان گزرتا تھا اور وہ نمبر لگا تھا۔ جس نمبر کی ویگنیں اس روٹ پر سفر کیا کرتی تھیں۔ اس وقت رات کے قریباً گیارہ بج رہے تھے جب وہ لوگ پہلے سے مخصوص جگہ پر پہنچے اور وہاں اُتر گئے۔
ویگن ڈرائیور ویگن کو اطمینان سے آگے لے گیا۔
یہ چھوٹا سا "بوٹ سٹیشن" تھا جہاں سے جانے اور آنے والی لانچوں کو زیادہ تر ماہی گیروں کی ہوتی تھیں یا پھر نزدیکی جزیرے میں سامان برداری کا کام کرنے والی لانچیں سرکاری طور پر چیکنگ کے بعد ہی کھلے سمندر میں جانے کی اجازت ملا کرتی تھی کیونکہ یہاں سے جانے والی بیشتر لانچیں ساحل سمندر پر چند کلو میٹر کے فاصلے پر موجود غیر ممالک تک ہی سفر کیا کرتی تھیں۔
یہاں لانچوں کو روانگی کی اجازت دینے کی ذمہ داری ملک اختر کے محکمے کو سونپی گئی تھی اور اس وقت بھی معمول کے مطابق کام جاری تھا جب اچانک اس کے ماتحتوں نے ملک اختر کو اپنے سر پر موجود پایا۔
ملک صاحب نے اس طرح اچانک چھاپہ مار کر شاید انہیں "سرپرائز" دیا تھا

یا پھر اُن کی چیکنگ کی تھی۔
"کیا ہو رہا ہے چوہدری ـــــ کیسا چل رہا ہے۔ سب ٹھیک تو ہے نا!"
اپنے ماتحت عملے کے نگران افسر سے اُس نے افسروں کے لہجے میں پوچھا۔
"آل رائیٹ سر۔ سب او کے ہے سر۔"
انسپکٹر چوہدری نے دونوں پاؤں جوڑتے ہوئے ایڑیاں بجائیں۔
"ادھر لاؤ اوئے کاغذات۔ ادھر لاؤ۔"
ملک اختر نے خود لانچوں کے اجازت نامے چیک کرنے شروع کر دیئے تھے۔ دو لانچوں کے اجازت نامے اُس نے چیک کر لیے تھے جب بندو خان ہاتھ میں کاغذ پکڑے اُس کی طرف بڑھا۔
"یہ لیجئے سر!"
اُس نے کاغذات ملک اختر کی طرف بڑھائے۔
"سر کے بچے۔ تمیز سے بولو۔ کون ہو تم؟ کہاں جا رہے ہو؟"
اُس نے جان بوجھ کر کرخت لہجے میں اُس سے دریافت کیا ـــ!
"جناب ہم تو لیسنی جا رہے ہیں۔ غریب آدمی ہیں سرکار۔"
بندو خان ہاتھ جوڑ کر گھگھیایا۔
"ٹھیک ہے خبردار کوئی ہیرا پھیری نہیں ہونی چاہیے۔"
ملک اختر نے کاغذات پر سرسری نظر ڈال کر اُسے واپس لوٹا دیے اور دوسرے ہی لمحے بندو خان کی لانچ کھلے پانیوں کی طرف بڑھنے لگی۔
ملک اختر نے اس طرح دو تین اور لانچوں کے کاغذات چیک کیے۔ ایک لانچ کی اچانک تلاشی لی اور جس طرح آندھی اور طوفان کی طرح آیا تھا اُسی طرح واپس لوٹ گیا۔

"آج کل صاحب کچھ زیادہ ہی سختی دکھانے لگا ہے۔ اللہ خیر کرے۔ بندہ تو ایسا نہیں لگتا۔ میرا خیال ہے اوپر والوں کے آرڈر ہی بڑے سخت ہوں گے۔"

اُس کے جانے کے بعد ایک ماتحت نے تبصرہ کیا۔

بندو خان بڑے اطمینان سے کھلے پانیوں میں سفر کر رہا تھا جب اچانک سمندر پر پھیلے بے پایاں سکوت اور رات کے سحر کو سائرنوں کی تیز آواز نے توڑ ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے چاروں طرف پانیوں پر روشنیاں اُن کی طرف لپکنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ بندو خان کو کسی بات کی سمجھ آتی نیوی کی تیز رفتار بوٹس نے انہیں گھیر لیا۔ اُس کے ساتھی تازہ تازہ قابو آئے ہوئے مرغے تھے انہیں اس صورتِ حال نے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ لانچ میں اسلحہ بھی موجود نہیں اگر ہوتا بھی تو انہیں اس کی مہلت ہی کب ملتی کہ اس تک رسائی حاصل کرتے۔

برق رفتار بحری کمانڈوز بحری عقابوں کی طرح اُن پر جھپٹے اور اُنہیں بے بس گیدڑوں کی طرح جکڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نیوی کے ایک مرکز پر زیرِ حراست تھے۔

عمرانہ نے آج پروین سے بڑی عجیب سی فرمائش کر دی تھی۔

"چلو تمہارے ملک صاحب کی طرف چلتے ہیں۔"

رات دیر گئے جب وہ دونوں ایک مقامی ہوٹل میں "کیبرے" دیکھ کر واپس لوٹ رہی تھیں تو عمرانہ نے اُسے کہا۔

"لیکن ——"

"چھوڑو لیکن کو۔ بھئی ملک صاحب کو سرپرائز دیں گے خوش ہو جائیں گے یوں بھی انہوں نے کل ہی تو کہا تھا کہ میں کب آ رہی ہوں۔"

عمرانہ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"انہیں فون تو کر دیں کہ ہم آ رہے ہیں۔"

پروین نے کہنا چاہا۔

"پھر سرپرائز کہاں رہ جائے گا پروین چھوڑو یار تم کس چکر میں پڑ گئی ہو۔ بھئی یوں کرو ... گی فون۔ اگر وہ گھر نہ ہوئے تو واپس آ جائیں گے۔"

اُس نے فوراً پروین کی بات کاٹ دی۔

بینا کشی نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر اُس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ وہ تو خود یہی چاہتی تھی کہ کس طرح وہ لوگ عمرانہ کو بلیک میل ہونے کی پوزیشن میں لے آئیں۔ لیکن ——

ابھی تک انہیں اس مقصد میں کامیابی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ پروین نے اپنی چند روزہ دوستی میں عمرانہ کو ابھی تک شراب نوشی کی دعوت نہیں دی تھی حالانکہ اُسے زیرِ دام لانے کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔

"برا مت ماننا پروین بیگم تم تو مجھے اللہ میاں کی گائے دکھائی دی ہو۔ بھئی اتنے دن ہماری دوستی کو ہو گئے اور ہم نے ابھی تک اس دوستی کو "سیلیبریٹ" ہی نہیں کیا مجھے تو اُمید تھی کہ کم از کم تم آج ضرور مجھے دعوت دو گی۔ لیکن کمال ہے بھئی آج ویک اینڈ بھی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ تمہارے ملک صاحب کے گھر سے زیادہ محفوظ جگہ مے نوشی کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اصل میں پروین برا مت ماننا۔ میں کبھی کبھی پیتی ہوں لیکن بے تحاشا اور میرے دوستوں کا کہنا ہے کہ کوئی مجھے اُس وقت سنبھالنے والا نہ ہو تو میرے آؤٹ ہونے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔"

اس نے اپنی بات کے خاتمے پر خود ہی قہقہہ بلند کیا تھا۔

بینا کشی کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ اس نے جو کام لگے دس پندرہ روز میں

بڑی محنت اور جانفشانی سے کرنا تھا وہ عمرانہ نے آج دس پندرہ منٹ ہی میں کر دیا تھا۔ اُسے تو اندھے کی طرح اچانک دو آنکھیں نصیب ہو گئی تھیں۔

"واہ واہ عمرانہ ـــ کمال کر دیا بھئی۔ بڑی چھپی رستم نکلی ہو۔ میں تو تمہیں کہتے ہوئے بھی ڈرتی تھی کہیں ناراض ہی نہ ہو جاؤ۔"

پروین اب کھل گئی تھی۔

"میرے خیال سے ہمیں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

عمرانہ نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ چلیے حضور۔ ابھی چلتے ہیں۔"

یہ کہہ کر پروین ہوٹل کے اس کاؤنٹر کی طرف بڑھی جہاں سے پرائیویٹ کار کرایہ پر ملتی تھی۔ جب دونوں کاؤنٹر کی طرف جا رہی تھیں تو عمرانہ نے اپنے کندھے سے لٹکتا پرس پروین کو بے تکلفی سے تھماتے ہوئے باتھ روم تک جانے کی اجازت مانگی تھی۔

کاؤنٹر سے دوسری طرف موجود باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے اُس نے صرف ایک مرتبہ نظر اُٹھا کر اُس نوجوان کی طرف دیکھا تھا جو ہوٹل کے بکنگ کاؤنٹر کے نزدیک کھڑا شاید کسی کا منتظر تھا۔

عمرانہ کو اس طرف جاتے دیکھ کر وہ بھی اس سمت جانے والے دوسرے راستے کی طرف گھوم گیا۔ دونوں کا ٹکراؤ راستے میں ہوا اور عمرانہ نے اپنی اگلی منزل کی نشاندہی کر دی۔

"ویل ڈن۔"

نوجوان کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ تیزی سے فون بکس کی طرف گھوم گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ٹیلی فون پر کسی کو عمرانہ کی اگلی منزل سے باخبر کر رہا تھا۔

میناکشی کے فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہ ہو سکی کہ یہ نوجوان آج دوپہر ہی سے جب وہ "گیسٹ ہاؤس" سے باہر نکلی تھیں اُن سے چپک گیا تھا۔ وہی نہیں اس جیسے تین اور بھی اُن کے ارد گرد کسی بھی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔

یہ اُن کی بڑی کامیابی تھی کہ عمرانہ، میناکشی کو ملک اختر کے گھر لے جا رہی تھی۔ دونوں کا اکٹھے گرفتار ہونا جہاں لیڈی انٹیلی جنس انسپکٹر عمرانہ چوہدری کے لیے بڑا کارنامہ تھا وہاں ملزموں کے خلاف کیس بھی مضبوط ہو جاتا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک کرائے کی کار میں ملک اختر کے ساحل سمندر والے اپارٹمنٹ کی طرف جا رہے تھے۔

عمرانہ نے اپنی ملازمت کا یہ سب سے شاندار مشن کیا تھا گو اس سے پہلے بھی کئی ایڈونچر کر چکی تھی۔

لیکن ـــــ

آج وہ جو کارنامہ انجام دینے جا رہی تھی اُس پر جانے اب تک دل ہی دل میں اس نے خود کو کتنی مرتبہ شاباش دی تھی۔ اُسے یاد تھا کہ جب افسرِ اعلیٰ صاحب کے سامنے وہ پیش ہوئی تھی تو انہوں نے اُسے صاف صاف بتایا تھا کہ یہ کھیل بہت خطرناک بھی ہو سکتا ہے اور وہ اپنے محکمے کی ایک ہونہار آفیسر کو اس طرح ضائع نہیں کر سکتے۔

جس پر اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ وہ ملک دشمنوں کے قلع قمع کے لیے اپنی جان دے دینا بھی سعادت سمجھتی ہے۔

وہ انٹیلی جنس میں جانے کتنے سخت مراحل عبور کرنے کے بعد داخل ہوئی تھی ریٹائرڈ پولیس افسر کی بیٹی ہونے کے ناطے اُسے بچپن ہی سے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے

دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن بغیر وردی والی پولیس سے۔ اُس کے والد صاحب نے کبھی
اپنی بیٹی کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی اور ہمیشہ اُس کے راہنما بنے رہے۔ پھر وہ دن
بھی آ گیا جب عمرانہ کو پولیس میں ملازمت ملی اور یہاں سے بالآخر اُس کی شدید خواہش
کے پیشِ نظر اُسے انٹیلی جنس میں بطورِ سپیشل کیس بھیج دیا گیا۔

یہاں خالصتاً مردانہ ماحول تھا اور وہ بالآخر ایک لڑکی تھی۔

لیکن ——

جلد ہی اُس کے ساتھیوں کو معلوم ہو گیا کہ قدرت نے اُسے مردانگی کے اُس
جوہر سے نوازا ہے جو کسی مرد کو بھی کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ اُس نے انٹیلی جنس کے
کئی کیس کامیابی سے پاس کیے اور جلد ہی اُسے "ڈیسک" سے اُٹھا کر میدانِ عمل
میں اُتار دیا گیا۔

عمرانہ چوہدری نے اب تک کئی سوانگ رچائے تھے عموماً وہ ڈرگ کے سمگلروں
سے دولت کی پجارن کی حیثیت سے اپنا تعارف کرواتی اور اُن کو رنگے ہاتھوں
گرفتار کر لیتی تھی۔ اس مہم کے لیے اُس کا انتخاب گل شیر کی تجویز پر افسرِ اعلیٰ صاحب
نے کیا تھا۔ پہلے تو وہ اتنے حساس کیس میں کسی بھی قسم کا خطرہ مول لینے کے لیے
تیار نہیں ہوتے تھے۔

لیکن ——

گل شیر خان کو تین چار کیسوں میں عمرانہ چوہدری کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا
اور وہ اس کی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ تھا اُس نے بڑے اعتماد سے عمرانہ چوہدری
کو مینا کشی سے چپکا دینے کی تجویز پیش کی تھی۔

آج عمرانہ چوہدری بھارتی جاسوسہ مینا کشی اور پاکستانی غدار ملک اختر کو اکٹھے
گرفتار کروانے جا رہی تھی تو اس کا دل احساسِ تشکر کے جذبات سے لبریز تھا کہ وہ

اپنے بہی خواہوں کی توقعات پر پوری اُتری ہے۔

○

ملک اختر نشۂ کامیابی سے سرشار کار چلاتا ہوا اپنے ساحلی اپارٹمنٹ پر پہنچا تھا۔
آج وہ جان بوجھ کر اپنے نئے ڈرائیور کو ساتھ نہیں لے کر گیا تھا جب ڈرائیور
نے اُسے اکیلے جاتے دیکھا تو گاڑی کا دروازہ اس اُمید پر کھولا تھا کہ اُس کا صاحب
اُسے ہی کار چلانے کا حکم دے گا۔

لیکن ——

اس کے برعکس ملک اختر نے اُسے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

"تم آرام کرو —— میں بڑے اہم کام سے جا رہا ہوں، بلکہ تم آف کر لو کل صبح
آفس میں آ جانا —— ٹھیک ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے سو روپے کا ایک نوٹ اپنے بٹوے سے نکال کر اُس
کی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا۔ بے چارہ ڈرائیور سوائے اپنے افسر کا شکریہ ادا کرنے
کے اور کیا کر سکتا ہے۔

اپنا کام اُس نے کامیابی سے مکمل کر لیا تھا۔ اب وہ اس میدان کا منجھا ہوا کھلاڑی
ثابت ہونے لگا تھا۔ پہلے پہل اس کو لسانی تنظیم کی طرف سے جو بھی عوضانہ موصول ہوتا
وہ شکریہ کہہ کر رکھ لیتا لیکن اب اُس نے رقم گننا شروع کر دی تھی اور وہ کام کی
نوعیت کو جاننے لگا تھا۔

آج بھی جب اُس نے دس تخریب کاروں کو غیر قانونی طور پر سرحد عبور کروانے
کا کارنامہ انجام دیا تھا تو وہ ہی اس بات کا اندازہ لگا سکتا تھا کہ اُس نے تنظیم کے
لیے کتنا اہم کام کیا ہے اور اس غداری کی کم از کم قیمت کیا ہونی چاہیے۔

ملک اختر کو آج شدت سے پروین کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

لیکن ——

بہترین ہی کیوں —— عمرانہ کیوں نہیں ؟ جس نے اگلے ہی روز اُس سے ملاقات کی تھی اور جس کے جسم کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لینے کے بعد اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ مستقبل میں اس کی جنسی بے راہروی کے لیے عمرانہ سے بہترین ساتھی اُسے میسّر نہیں آسکتا۔

گھر پہنچنے پر اُس نے پروین کو دو تین مرتبہ فون کیا تھا لیکن دوسری طرف سے یہی اطلاع ملتی تھی کہ ابھی تک وہ گیسٹ ہوم نہیں پہنچی۔

اُس کے بعد اُس نے نام بدل کر عمرانہ کے لیے فون کیا تو اُسے علم ہوا کہ وہ اپنی دوست پروین کے ساتھ گئی ہوئی ہے۔ ملک اختر تلملا کر رہ گیا۔ اب وہ لسانی تنظیم کے مالِ حرام پر سب سے پہلا حق اپنا سمجھنے لگا تھا۔ اُس کے گندے ذہن نے اُسے یہی راہ سجھائی کہ ضرور دونوں کسی نئے شکار پر نکلی ہیں۔

لیکن ——

زندگی میں اُسے کبھی اتنا شاندار سرپرائز بھی ملے گا؟

یہ تو اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

جب اُس کے چوکیدار نے انٹرکام پر اُسے پروین اور ایک نامعلوم لڑکی کی آمد کی خبر دی تو اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ اپنے سرہانے دھری شراب کے پیگ کا آخری گھونٹ اُس نے تیزی سے حلق میں انڈیلا تو اُس کی جنسی زندگی دوچند ہو گئی۔

اُس نے ننگے پاؤں سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر دونوں کا استقبال کیا تھا اور عالمِ مدہوشی میں اُس کے مُنہ سے اُن کی تعریف میں کئی جملے بے ساختہ نکل گئے تھے۔

"مسٹر ملک —— میں نے کہا تھا ناں کہ بہت جلد آپ سے ملنے آؤں گی —— سوچی

تھی میں نے سوچا کہ آپ کو انتظار کی زحمت میں کیوں ڈالا جائے۔

عمرانہ نے اُس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"چشم ما روشن دل ما شاد —— بندہ اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا ہے ——"

ملک اختر نے اُس کے سامنے نشے میں درباریوں کی طرف جھک کر کورنش بجالاتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ ایک ہی ملاقات میں ہمیں مکھن سے بال کی طرح نکال دیا۔"

پروین نے ملک صاحب کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

"تم تو میری .....!"

یہ کہتے ہوئے ملک نے ایک بیہودہ سی حرکت کر دی جس پر بادلِ نخواستہ عمرانہ کو ہنسنا پڑا۔

تینوں ملک اختر کے پُرتکلف اور پُرتعیش ڈرائنگ روم میں چلے آئے جہاں ملازم اُن کے لیے اپنے فریج سے بیئر کی بوتلیں نکال کر رکھ رہا تھا۔

"بڑا خوبصورت گھر ہے آپ کا —— ساحلِ سمندر کا نظارہ کتنا حسین لگتا ہوگا یہاں سے ——"

عمرانہ نے یہ کہتے ہوئے اُس کے کمرے کی سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ تقریباً ایک منٹ وہاں کھڑے ہو کر سمندر کی طرف ہاتھ کے اشارے سے تعریف کرتی رہی۔

ڈی ایس پی گل شیر خان کی کمان میں کمانڈو ملک اختر کے اپارٹمنٹ کے چاروں طرف متعین تھے اور وہ آنکھوں سے رات کے اندھیرے میں دیکھنے والی دوربین لگائے اس اشارے کا منتظر تھا۔

ڈگرٹ —— اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے "واکی ٹاکی" پر صرف ایک لفظ دہرایا۔

زمین پر چیتے کی طرح قدموں کی آواز نکالے بغیر برق رفتاری سے قلانچیں بھرتے گل شیر خان کی کمان میں خصوصی کمانڈوز نے چند منٹ میں ملک اختر کے چوکیدار اور پہرے کو قابو کر لیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ ڈرائنگ روم کے دروازے کو ٹھوکر سے کھولتا اندر گھس آیا۔ اُس کے تعاقب میں تین مسلح کمانڈوز نے ملک اختر کی طرف اپنی گنیں سیدھی کر لیں۔

"مسٹر ملک اختر اور مس میناکشی بشنا دری میں تم دونوں کو تخریب کاری، غداری اور سرکاری راز چوری کرنے کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔"

ڈی ایس پی گل شیر خان کی آواز میں رعد کڑک رہی تھی۔

"تمہیں کس نے اجازت دی۔ تمہاری اوقات کیا ہے۔ تم....."

ملک اختر کے منہ سے مغلظات کا طوفان برآمد ہوا۔

لیکن ——

عمرانہ چوہدری نے اُس کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا تھا کہ اُس کا نشہ اگلے ہی لمحے ہرن ہو گیا۔

"تم بھی....."

ملک اختر کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ہاں میں بھی ——"

عمرانہ اُس کی طرف قہر آلود نظروں سے گھور رہی تھی۔

⊙

گرفتاری کے فوراً بعد اُن دونوں کو الگ کر لیا گیا تھا۔

میناکشی کو عمرانہ چوہدری کی نگرانی میں مستعد کمانڈوز کے ساتھ بھیجا گیا تھا جبکہ ملک اختر کو دوسری ٹیم اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

ملک اختر کا نشہ تو اُسی وقت ہرن ہو گیا تھا جب اُس نے اپنے گھر میں کمانڈوز کو دیکھا تھا۔ لیکن اب جبکہ وہ اپنے جرائم کا حساب دینے جا رہا تھا تو آنے والے لمحات کے تصور نے اُسے ابھی سے خوفزدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ "افسرِ اعلیٰ" جس ایجنسی کی نمائندگی کرتے تھے اُن سے بچتے میں یہاں نہیں چھوٹ سکتی تھی۔

ملک اختر نے آج تک یہی سمجھا تھا کہ جس طرح اُس نے حرام کی دولت جمع کی ہے اسی طرح وہ کسی اور کو بھی حرام کھلا کر راہِ راست پر لے آئے گا۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے گرفتاری کے لیے آنے والوں کو اتنی بڑی رقم کی پیشکش کی تھی جس کا وہ کبھی گمان نہیں کر سکتے تھے۔

ملک اختر کے پاسپورٹ پر کئی ممالک کے ویزے موجود تھے۔ یورپ کے کئی بینکوں میں اس کے اکاؤنٹ موجود تھے۔

کسی طرح اگر ایک مرتبہ وہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو ساری زندگی عیش و آرام سے بسر کر سکتا تھا۔ دُنیا کے کسی بھی ممالک میں وہ اپنی نئی شناخت کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔

لیکن ——

ملک اختر کو صدمے کے ساتھ ساتھ حیرت کا بھی دھچکا لگا کہ اس کی پیشکش کا جواب گالیوں کی صورت میں موصول ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے تمہیں میری بات کی سمجھ نہیں آئی۔ میں نے بیس لاکھ روپے کی آفر کی ہے۔۔ اور تم نے کرنا بھی کیا ہے۔"

اس نے ڈی ایس پی گل شیر خان سے کہا۔

"تم بیس کروڑ کی آفر بھی کرو تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ اپنی دھرتی ماں کو

بیچ کھانے والے بے غیرت انسان تیری دولت تیرے کسی کام نہیں آئے گی۔"

گل شیر خان نے اُسے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بے وقوف ہو۔ میں یہ رقم وکیلوں اور عدلیہ پر خرچ کر کے انصاف بھی خرید سکتا ہوں۔"

ملک اختر نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"تم نے جو خرید و فروخت کرنی تھی کر لی۔ اب ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑتے رہو گے۔ تم جیسے غدار کے لیے تو موت بھی کم سزا ہو گی۔"

گل شیر خان کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

"اونہہ ــــ بے وقوف تمہاری حیثیت ہی کیا ہے ــــ ایک معمولی سے آفیسر کتنی سزا دلوا لوگے مجھے۔ میں اپنے تمام جرائم کا اقبال بھی کر لوں تو بھی کیا ہو جائے گا ــــ پانچ سال، دس سال پھر، اس کے بعد کیا مجھے مار ڈالو گے۔ میں ساری زندگی عیش کروں گا اور تم ــــ تم اسی طرح، اسی طرح بیوقوفوں کی طرح اپنے افسروں کے احکامات کی تعمیل میں جوتیاں چٹخاتے رہو گے اور کسی روز کسی غنڈے بدمعاش کی گولی کا نشانہ بن جاؤ گے ــــ"

ملک اختر کی بات پر ان کا خون کھول اُٹھا۔

"شٹ اپ۔"

اس نے اس زور سے چیخ کر کہا تھا کہ ملک اختر ہی نہیں گارڈ کے باقی جوان بھی سہم کر رہ گئے۔

"دیکھو مسٹر ملک ــــ اب اپنی زبان بند رکھنا ورنہ تم جانتے ہو کہ ہم زبان بند کروانے کے کتنے گُر جانتے ہیں۔"

گل شیر خان کے ساتھی نے کہا۔

ملک اختر نے اسی طرح "اونہہ" کہہ کر منہ دوسری طرف پھیرا تھا جیسے ناک سے مکھی اڑا رہا ہو۔ اُسے اگر گرفتاری کے وقت کوئی خوف تھا تو اب دور ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جن کی وفاداری کا دم بھرتے ہوئے وہ اس انجام تک پہنچا ہے وہ اسے بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے اور حکومت کو ہر طرح پریشرائز کرنے کی کوشش کریں گے۔

رات آدھی ڈھل رہی تھی جب ملک اختر کو ایجنسی کے ایک سیف ہاؤس میں پہنچا دیا گیا۔ اس کی گرفتاری کے بارے میں کوئی باقاعدہ خبر جاری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ــــ

اس کی گرفتاری سے اُس کے مالکان آگاہ ہو چکے تھے۔

بندو بھائی اور اس کے ساتھیوں کا اچانک سمندر سے غائب ہو جانا ایسا حادثہ نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ لسانی تنظیم کو اسی رات علم ہو گیا تھا کہ بندو بھائی کا گروپ جسے "را" کے تربیتی کیمپ تک پہنچنا تھا راستے ہی سے "افسرِ اعلیٰ" نے اغوا کروا کر اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔

وہ لوگ جانتے تھے کہ جس طرح انہوں نے "را" کی مدد سے ملک اختر کو جکڑا ہوا ہے اس کے بعد ملک اختر سے یہ اُمید کرنا کہ وہ ڈبل کراس کرے گا یا انہیں دھوکہ دے گا غلط ہوتا کیونکہ ملک اختر کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اُن کے لیے افسرِ اعلیٰ کے خلاف اس بھرے پُرے شہر میں لے دے کے ایک یہ ملک اختر ہی تھا جس کے ذریعے لسانی تنظیم اپنا گھناؤنا کھیل جاری رکھے ہوئے تھی۔ اب اختر ملک کی گرفتاری کا مطلب یہ تھا کہ ان کے باقی غدار رہنماؤں کے حوصلے بھی پست ہو جاتے۔

اختر ملک کی گرفتاری تنظیم کے لیے ایک چیلنج کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

بابا صاحب کو علی الصبح گہری نیند سے جگا کر اس حادثہ جانکاہ سے آگاہ کیا گیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو ـــــ ارے وہ کوئی معمولی انسپکٹر ہے کہ جس کو باندھ کر لے گئے ـــــ اتنا بڑا آفیسر ہے قانوناً بھی اس کی گرفتاری بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے ـــــ تم نے بھنگ تو نہیں پی رکھی۔"

بابا صاحب نے فون کرنے والے پر غصہ جھاڑنا چاہا۔

"بابا صاحب! بدقسمتی سے یہ حادثہ ہو گیا ہے اور ہماری توقعات کے برعکس افسرِ اعلیٰ نے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھا لیا ہے ـــــ بندو بھائی کے ساتھیوں، ملک صاحب اور مینا کشی کسی کا پتہ نہیں چل رہا کہ یہ لوگ انہیں کہاں لے گئے ہیں لیکن ان کی گرفتاری کی خبر صد فی صد سچی ہے ـــــ"

فون کرنے والے نے کہا۔

"ہونہہ ـــــ تو اب کچھ کرنا ہی ہوگا۔ آج ہی ان سب کے دماغ ٹھیک کرتا ہوں۔ آج میں دیکھتا ہوں اُن کو ـــــ ارے ان کی یہ مجال۔ میں شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دوں گا۔ سارے شہر کو جلا کر خاک کر دوں گا۔ کسی کی ہمت ہے کہ میری بات ماننے سے انکار کرے۔"

بابا صاحب عالم وحشت میں بکواس کرتے رہے بالآخر انہوں نے اپنا فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

اس کے منہ سے ابھی تک مغلظات کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔

اس کی دیوانہ وار گالیوں کی آواز پر ملحقہ کمرے میں خواب خرگوش کے مزے لوٹتے اُس کے خصوصی دستے کے رضاکار بھاگتے ہوئے اندر آ گئے تھے۔

"تیاری کرو ـــــ تیاری کرو ـــــ ان سالوں کا دماغ خراب ہونے لگا ہے۔ دیکھ لوں گا۔ ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔"

وہ عالم وحشت میں گالیاں بک رہا تھا اور محافظوں کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بابا صاحب پر پاگل پن کا یہ دورہ کس طرح پڑا ہے۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو ـــــ رخسانہ کو بلاؤ۔ فوراً بلاؤ۔"

اس نے اچانک ہی اپنے سیکرٹری کو حکم دیا اور انہیں گالیاں دیتے ہوئے کمرے سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

یوں تو بابا صاحب پر ایسی کیفیت اکثر طاری ہو جایا کرتی تھی لیکن اس کیفیت کا حملہ آج پہلی بار ہُوا تھا وہ بالکل پاگل دکھائی دے رہا تھا۔

اپنے کمرے میں چکر کاٹتے ہُوئے اس کا شیطانی ذہن بار بار ایک ہی تکرار کر رہا تھا کہ کسی طرح وہ حکومت کو اتنا مجبور کر دے کہ وہ بابا صاحب کی ناجائز خواہشات کے احترام میں اُسے من مانی کرتے ہوئے مادرِ وطن کی عزت سے کھیلنے کی چھٹی دے دے ـــــ!

اور ـــــ

اس کا ایک ہی جواب اُس کے ابلیسی دماغ نے دیا تھا۔

ہنگامہ آرائی، لوٹ مار، آگ، بلوہ، جلوس، توڑ پھوڑ۔

اُس نے یہ سب کچھ کرنا تھا ـــــ یہ سب کچھ ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اب سے پہلے بھی ایسے ہی گھٹیا اور بھیانک حربوں سے اُس نے حکومت کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اُس کے ہاتھ بڑا سستا نسخہ لگ گیا تھا۔

وہ جب دیکھتا کہ حکومت کے ایماندار اور وطن دوست سرکاری ملازمین اس تنظیم کی غیر قانونی مجرمانہ حرکات کا نوٹس لینے لگے ہیں تو فوراً ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔

اُس نے حکومتِ وقت کو مجبور کر دیا تھا کہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے
لیے اُسے کھل کھیلنے کی اجازت دیتی رہے اور کوئی اس پر گرفت نہ کرے۔

یہ وہ کم از کم قیمت تھی اور جو حکومت ادا کر رہی تھی۔

امن و امان کی بحالی کے نام پر ملکی سالمیت کو ان وحشیوں کے آگے گروی
رکھ کر عاقبت نا اندیش حکمران یہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح وہ اپنے اقتدار
کو دوام بخش رہے ہیں۔

رخسانہ کو بابا صاحب کی ناسازیٔ طبع کا حوالہ دے کر یہاں فوراً پہنچنے
کی تلقین کی گئی تھی۔ تب اس نے یہی سمجھا تھا کہ بابا صاحب نے ضرور آج رات
ڈاکٹر کی ہدایات کی حسبِ معمول خلاف ورزی کرتے ہوئے کچھ زیادہ چڑھا لی ہوگی
یا پھر اپنے گردوں کی ـــــ تکلیف کی پرواہ کیے بغیر حرام کاری میں جُت گئے
ہوں گے۔

ابھی اُسے صورتِ حال کی سنگینی کا ادراک نہیں تھا۔

اس نے ٹیلی فون پر ہی فوراً بابا صاحب کے خصوصی معالج کو وہاں پہنچنے کا
حکم دیا تھا اور اب مسلح گارڈ کی حفاظت میں بابا صاحب کی رہائش گاہ کی طرف
جا رہی تھی۔

ڈاکٹر اس کی آمد سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا جس کے ساتھ ہی بابا صاحب
کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"اسے کیوں بُلا لیا؟"

ڈاکٹر کی شکل پر نظر پڑتے ہی بابا صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"میں نے بلایا ہے بابا صاحب!"

خدا جانے رخسانہ کے لہجے میں کیا چھپا تھا کہ بابا صاحب دوسرے ہی

لیے نارمل ہو گیا۔

ڈاکٹر نے رخسانہ کی ہدایت پر اس کا بلڈ پریشر وغیرہ چیک کیا اور اسے مطمئن
رکھنے کے لیے ایک ٹیکہ لگا کر چلا گیا۔ اس ٹیکے نے بابا صاحب کو قدرے پُرسکون
کر دیا تھا۔ بابا صاحب نے جب رخسانہ کو گزری رات ٹوٹنے والی قیامتوں کا احوال
سنایا تو پہلی مرتبہ وہ بھی ضرورت سے زیادہ ہی پریشان ہو گئی۔

"بابا صاحب اب واقعی وقت آ گیا ہے کہ آپ سنجیدگی سے اس حرکت کا نوٹس
لیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کم بخت افسرِ اعلیٰ کے پیچھے کوئی بڑا مضبوط ہاتھ ہے۔
ورنہ اس طرح وہ ....."

"ارے کون سا ہاتھ میرے ہاتھ سے زیادہ مضبوط ہو سکتا ہے۔ سالے کا دماغ
آج ہی درست کرتا ہوں۔ بلاؤ ذرا چیف منسٹر کو اُس سے کھل کر بات ہو جانی چاہیے۔"

بابا صاحب نے رخسانہ کی بات کو غصے اور نخوت سے کاٹتے ہوئے کہا۔

رخسانہ نے بابا صاحب کے سامنے ہی فون پر چیف منسٹر ہاؤس سے رابطہ
کیا اور چیف منسٹر صاحب کو آج ہی بابا صاحب کی طرف سے فوراً ملاقات کا پیغام
دے دیا۔

چیف منسٹر نے یہ پیغام بڑے دھڑکتے دل کے ساتھ موصول کیا تھا اور
بابا صاحب کی طرف روانگی سے پہلے اپنے "بڑوں" سے اچھی طرح بریفنگ بھی
لے لی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے طور پر بابا صاحب سے کوئی وعدہ کر سکیں۔
کیونکہ اب اس کھیل میں ایک تیسرا کھلاڑی بھی شامل ہو گیا تھا۔

یہ تیسرا کھلاڑی بادلِ نخواستہ اس وقت میدان میں اُترا تھا جب سیاسی
بازی گروں نے ملکی نظم و نسق کو تماشا بنا کر رکھ دیا تھا۔ لا اینڈ آرڈر کی صورتِ حال
اتنی گھمبیر ہو گئی تھی کہ لوگوں کا اعتماد ملکی سلامتی سے متعلق متزلزل ہونے لگا تھا۔

اب سیاسی بندر کچھ چوکنے ہو گئے تھے۔

انہوں نے اپنی حرام کاریاں بند تو نہیں کی تھیں البتہ محتاط ضرور ہو گئے تھے اور کچھ کرنے سے پہلے دائیں بائیں نظر دوڑا لیا کرتے تھے۔

چیف منسٹر صاحب اگلے ایک گھنٹے کے بعد باباصاحب کی خدمت میں حاضر تھے جو بیماری کا بہانہ کر کے صاحبِ فراش تھے اور انہوں نے بستر پہ لیٹے لیٹے ہی چیف منسٹر صاحب سے ہاتھ ملایا تھا۔

"خیریت باباصاحب ـــــ"

چیف منسٹر صاحب کو انٹیلی جنس کی طرف سے رپورٹ مل چکی تھی کہ باباصاحب کے کہیں کوئی گولی نہیں لگی اور انہوں نے گولی لگنے کا محض ڈرامہ رچایا ہوا ہے۔

"خیریت کیا خاک ہوگی۔ بہت مشکل ہو گیا ہے۔ میرے لیے کارکنوں کو سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں ہمارے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہیں محض ایک شخص کے اشارے پر ـــــ اور یہ ہمیں کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ کس جرم کی سزا؟ کیا ہم اس لیے معتوب ہیں کہ حکومت کی حمایت کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے چیف منسٹر صاحب سوچیے اگر میں نے کارکنوں کو قابو نہ کیا تو کیا بنے گا ـــــ اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے وہ لوگ ـــــ اور پھر یہ آپ کی چیف منسٹری کہاں جائے گی؟ آپ کو علم ہے کن کے سر پہ حکومت چلا رہے ہیں ـــــ کچھ علم ہے آپ کو۔"

باباصاحب بکتے بکتے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

"باباصاحب آپ کچھ بتائیے بھی۔"

چیف منسٹر پر آخری بات نے گھبراہٹ طاری کر دی تھی۔

"اچھا ـــــ اب بتاؤں گا بھی میں ہی ـــــ گویا آپ کو کسی بات کی خبر ہی نہیں۔ آپ کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ اس افسرِ اعلیٰ کے بچے نے گھروں سے ہمارے

دس کارکن اغوا کر لیے اب ان پہ تشدد کر کے ان سے اپنی مرضی کے بیانات حاصل کریں گے پھر مجھے غدار بنا دیں گے ـــــ ارے میں کہتا ہوں بھئی اگر میں غدار ہوں تو کیا لینے آئے ہو میرے پاس۔ مجھے چوراہے میں پھانسی کیوں نہیں لگا دیتے۔ ہاں ـــــ ارے کیا گناہ کیا تھا اس نے ـــــ وہ کیا نام ہے اس کا ملک اختر نے۔ صرف یہی کہ اس افسرِ اعلیٰ کے برعکس ہمارے ساتھ انسانی برتاؤ کیا اور کسی کے پریشر کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ ہم پر غداری کے مقدمے بنا دیتا تو ان کا محبوب بن جاتا ـــــ اگر کوئی قانون کے مطابق ہمارے ساتھ کچھ نرم برتاؤ کرے تو غدار ـــــ ارے اسے بھی پکڑ لیا ـــــ اسے بھی پکڑ کر لے گئے۔ اب کوئی بڑی سازش بنے گی ـــــ اب یہ لوگ اس کے ڈانڈے ملائیں گے بھارت سے اور ہمیں غدار بنا دیں گے۔ جن کے آباؤ اجداد کی قربانیوں کے صدقے یہ ملک بنا تھا۔ اور سزا دو ان کی اولادوں کو ـــــ ان کے ساتھ اتنے ظلم کرو کہ یہ لوگ پاکستان کے غدار بننے پہ مجبور ہو جائیں ـــــ"

باباصاحب کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

چیف منسٹر صاحب کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔

انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس مصیبت سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں۔

چیف منسٹر صاحب بھی کوئی معمولی شاطر نہیں تھے۔ انہوں نے بھی اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے تھے۔ سیاست کے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ اب تک چار پارٹیاں تبدیل کر چکے تھے۔ یہ تو سیاسی کرائسس تھا جس کے صدقے وہ اس عہدے تک پہنچ گئے تھے ورنہ انہیں زندگی میں شاید ایم پی اے کی سیٹ سے زیادہ کچھ حاصل نہ ہوتا۔

یہاں اُن کا سارا سیاسی دھندہ باباصاحب کی مہربانیوں کا مرہونِ منت تھا۔

بابا صاحب کی ہر نا جائز خواہش پوری کرتے رہنا ہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا سیاسی مشن تھا۔ اُن کی سیاسی دکانداری اگر چل رہی تھی تو بابا صاحب کے طفیل۔

انہیں بابا صاحب کو ہر صورت خوش رکھنا تھا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑتی۔

لیکن ——

ایک خطرناک بات یہ تھی کہ بابا صاحب کے ساتھیوں کے خلاف اس مرتبہ جو کارروائی ہوئی تھی وہ انہیں اندھیرے میں رکھ کر کی گئی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ کارروائی کرنے والوں کو ان پر اعتماد نہیں رہا تھا۔

اور یہ بے اعتمادی بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔

چیف منسٹر صاحب کو اپنا سنگھاسن بھی ڈانواں ڈول ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ انہیں اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔

اب تو بابا صاحب کو خوش رکھنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔

"بابا صاحب آپ بے فکر ہو جائیے۔ میں مرکز والوں کو کیا سمجھتا ہوں۔ ہم نے اپنی سیاست اسی صوبے اور شہر میں کرنی ہے۔ ہمیں مرکز سے کیا لینا دینا آپ حکم دیجئے اس کی تعمیل ہو گی ——"

اس نے یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اوقات جتلائی۔

"ٹھیک ہے —— میری طرف سے اپنے بڑوں کو صاف صاف کہہ دو اگر کل صبح تک ملک اختر اور بندو خان سمیت تمام لوگوں کو رہا نہ کیا تو نتائج کی ذمہ داری اُن پر ہو گی ——"

بابا صاحب نے پھنکارتے ہوئے زہر فشانی کی۔

"بابا صاحب وہ لوگ آج رات تک رہا ہو جائیں گے مطمئن رہیے۔"

چیف منسٹر نے بے شرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس دیکھ لو —— تمہاری چیف منسٹری بھی اس وقت تک مضبوط رہے گی جب تک ہمارے ساتھی آزاد رہیں گے۔ ورنہ پھر وہی۔۔۔۔۔"

بابا صاحب نے بات نامکمل چھوڑ کر اس کی طرف مسکراہٹ اُچھال دی۔

تھوڑی دیر بعد چیف منسٹر صاحب منہ لٹکائے واپس آ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے آفس میں پہنچتے ہی اعلیٰ قیادت سے رابطہ کر کے پہلے تو اس بات کا گلہ کیا کہ انہیں اعتماد میں لیے بغیر اتنی بڑی کارروائی کیوں کی ہے؟ اس کے بعد بابا صاحب کی وارننگ بڑھا چڑھا کر انہیں پہنچا دی۔

دوسری طرف سے جو جواب انہیں ملا تھا اس کے بعد تو چیف منسٹر صاحب ٹیلیفون ہاتھ میں پکڑے رکھنے کی طاقت بھی جواب دے گئی تھی۔ انہوں نے بمشکل خدا حافظ کہہ کر کپکپاتے ہاتھوں سے فون کریڈل پر رکھ دیا اور دھڑام سے صوفے پر گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگے۔

بات ہی ایسی تھی جس نے اُن کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

انہیں مرکز نے بتایا تھا کہ یہ معاملہ ملکی سلامتی کے لیے فوج کو سونپ دیا گیا ہے۔ اور فوج نے اس شرط کے ساتھ اس معاملے میں ہاتھ ڈالا ہے کہ اُن کے کام میں غیر ضروری مداخلت نہ کی جائے۔

"بابا صاحب کو کس طرح مطمئن کیا جائے؟"

جب انہوں نے مرکز والوں سے پوچھا تو دوسری طرف سے بڑی سرد مہری سے کہا گیا تھا۔

"یہ آپ کا دردِ سر ہے ——"

چیف منسٹر صاحب جانتے تھے کہ ہنگامہ آرائی کی صورت میں اُن کی چھٹی بھی ہو جائے گی دوسری طرف مرکز نے بھی معذوری ظاہر کر دی۔

لیکن ـــــ

انہیں بابا صاحب کو کنٹرول میں رکھنا تھا بھلے اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑتی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اُن کی چیف منسٹری بابا صاحب ہی کے دم قدم سے ہے۔

اغوا

ملزموں کو ٹھکانے تک پہنچانے کے بعد گل شیر خان قدرے مطمئن ہو کر گھر پہنچا تو آدھی رات ڈھل چکی تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی فقرے کی تکرار ہو رہی تھی جو ملک اختر نے اس سے کہا تھا کہ وہ اُسے زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال قید کی سزا دلا دیں گے لیکن اس سے اسے کیا فرق پڑے گا۔ اس کے پاس جتنی دولت ہے اُس کے لیے یہ کوئی مہنگا سودا نہیں۔

کتنا زہر بلا طنز کیا تھا اس نے ـــــ

گل شیر خان نے سوچا واقعی اسے دس بارہ سال قید کی سزا ملے گی۔ جو قانوناً ہی چھ سات سال کی ہوتی ہے اور اس میں سے بھی دو تین سال کی رعایت ملک اختر حاصل کر لے گا۔ تین چار سال بعد وہ جیل سے باہر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہوگا اور ڈی ایس پی گل شیر خان انہی سڑکوں پہ جوتیاں چٹخاتا گھوم رہا ہوگا۔

ان لوگوں نے تو قانون کو کھلونا بنا کر رکھ دیا تھا۔

کتنا بے بس تھا وہ بھی ـــــ

کاش اُس نے گرفتار کرتے وقت ہی ملک اختر کو گولی مار دی ہوتی تو اس کو کم از کم سزا بھی تھی۔

اگر ملک سے غداری کی قیمت یہی ادا کرنی پڑتی ہے تو ملک اختر جیسے لوگ روزانہ جنم لیتے رہیں گے۔

صبح ڈھلنے تک اس پر یاسیت طاری رہی۔

صبح ڈھل رہی تھی جب اُسے نیند نے آلیا اور دوپہر تک وہ گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔ آنکھیں بند ہوتے ہی اس کا تحت الشعور گل شیر خان کو اُن وادیوں میں لے گیا جہاں کے شگوفوں سے محبت پھوٹتی تھی اور جہاں درختوں اور پودوں پر خوشیاں اُگتی تھیں۔ اس سفر میں اُسے عارفہ کا ساتھ میسّر تھا۔

دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے بادلوں کی سڑک پر اُڑتے چلے جارہے تھے۔ آسمان نے اپنی بلندیوں کے سارے اسرار اُن پر منکشف کر دیے تھے۔ زندگی کا سارا حسن قدرت نے اُن کی جھولی میں ڈال دیا تھا اور دونوں کی رفاقت نے ان لمحات کو امر کر دیا تھا۔

اسی روز خواب میں اُس نے اپنی ساری خواہشات کو عارفہ کے ساتھ حقیقت کا روپ بدلتے دیکھ لیا۔ اُس کے اختیار میں ہوتا تو اُس خواب کو کبھی نہ بکھرنے دیتا۔

لیکن ـــــ

خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔

بالآخر آنکھ کھل جاتی ہے ـــــ

خوبصورت مناظر کو جیسے موت آگئی تھی اور زندگی اپنی تمام تر تلخیوں سمیت اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

اُسے احساس ہوا کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے کل سے اُس نے عارفہ کے گھر والوں سے ملاقات نہیں کی تھی خدا جانے وہ لوگ کس حال میں ہیں۔ ابھی تک ان کا بیٹا بھی نہیں پہنچا تھا۔ معلوم نہیں وہ ہوسٹل سے آگیا ہے یا نہیں۔

پہلے تو اُس نے چاہا کہ فون کر کے اُن کی خیریت دریافت کرے لیکن پھر فیصلہ بدل دیا اور چائے کے ساتھ ایک ٹوسٹ زہر مار کر کے اپنی ماں کے سوالات کے جواب ہوں، ہاں میں دیتا وہ "سیف ہاؤس" کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہر کی ایک دُور دراز لیکن جدید سہولیات سے آراستہ کالونی کے ایک بنگلے میں موجود اُس کوٹھی کے دروازے پر بظاہر عام چوکیدار پہرہ دیتا دکھائی دیتا تھا لیکن ان دروازوں کے اندر سیکورٹی کا جدید نظام موجود تھا اور یہاں مکینوں کو آہنی ہاتھوں کی حفاظت میسّر تھی۔

ڈرائنگ روم میں میر صاحب کی ساری فیملی بے چینی سے شاید اسی کی منتظر تھی۔

"بیٹا ابھی تک لیاقت نہیں آیا۔"

"آپ مطمئن رہیے انکل ـــــ وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ شاید ہوسٹل میں کہیں رہ گیا ہو، میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔"

اس نے دوسرے کمرے میں موجود فون پر اپنے اُن ساتھیوں سے رابطہ کیا جنہیں لیاقت کو بحفاظت یہاں تک پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

"سر! ہم آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔ اچھی خبر نہیں ہے۔ آپ آفس آجائیں تو بات کرتے ہیں، کہیں یہ لوگ پریشان نہ ہو جائیں۔"

انسپکٹر کمال نے جواب دیا جو اس آپریشن کا انچارج تھا۔

"ہوں ـــ ٹھیک ہے ـــ تم لوگ وہاں پہنچو میں ایک گھنٹے تک آتا ہوں۔"

فی الوقت وہ اس سے زیادہ کوئی بات فون پر نہیں کر سکتا تھا عین ممکن تھا کہ میر صاحب یا اُن کی کوئی بیٹی اُس کی گفتگو سُن لے اور وہ لوگ مزید پریشان ہوں۔

فون رکھ کر وہ دوسرے کمرے میں آگیا۔ اس نے منقدور بھر کوشش کی تھی
کہ اُن کی پریشانی کی خبران لوگوں کو نہ ہو اور خود کو نارمل رکھا ہُوا تھا حالانکہ
انسپکٹر کمال اُسے جو بتانا چاہتا تھا اُس کا اندازہ اُس نے کمال کی بات سُن کر ہی
کر لیا تھا۔

"کیا ہُوا — کہاں ہے لیاقت ؟"

بوڑھی ماں نے بیقراری سے اُسکی طرف لپکتے ہوئے پوچھا۔

بالکل خیریت سے ہے اور میں اُسے لینے جا رہا ہوں"۔

"گل شیر خان کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ اُنہیں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

عارفہ کا ستا ہوا چہرہ اور چہرے پر پھیلی ہوئی آنکھوں سے جھانکتی ہیبت
نے ایک مرتبہ تو گل شیر کو کاٹ کر ہی رکھ دیا۔

اس نے سوگوار حسن سے متعلق جتنی مثالیں سُنی تھیں آج اُن کا عملی نمونہ اُس
کے سامنے تھا۔

جامنی رنگ کی عارفہ کو دیکھ کر سارنانخ کے مندروں میں رہنے والی ان وحشی
کیشاؤں کی تصویر سامنے آجاتی تھی جو آنکھوں میں وصال کے خواب سجائے
لامبے بال شانوں پر بکھیرے ہجر کے گیت جانے والے شہزادوں کی یاد میں گایا کرتی
تھیں۔

دونوں اس وقت کمرے میں اکیلے تھے اس کی بہنیں، بچی میں بچیں اور والدین
دوسرے کمرے میں ایک دوسرے کو دلاسہ دے رہے تھے۔

"میں جانتا ہوں عارفہ تم پریشان ہو۔ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس
کے لیے میں خود کو بھی ....."

"خدا کے لیے ایسی بات کر کے مجھے میری نظروں سے نہ گرائیے یہ میرا فیصلہ

یا ہیں اپنے کسی فیصلے پر شرمندہ نہیں ہوں۔ مجھے علم تھا کہ اس کا انجام موجودہ
ات سے مختلف نہیں ہو گا لیکن میں اپنے ضمیر کو مردہ رکھ کر جینے کا تصور نہیں
کر ہی سکتی تھی۔ — تنظیم سے وفاداری کا مطلب ہوتا ہے وطن سے دُشمنی اور
لیے یہ سودا ہرگز قبول نہیں تھا —"

عارفہ نے تڑپ کر اُس کی بات کاٹ دی۔

"میں سلام کرتا ہوں تمہارے جذبے کو عارفہ — میں گل شیر خان تمہیں
ین دلاتا ہوں کہ کوئی میرے جیتے جی تم میں سے کسی کا بال بیکا نہیں کر سکے
— اس ملک کی بنیادوں میں میرے اور تمہارے اجداد کا خون ہے۔
اس کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں عارفہ — بہت مضبوط — اگر یہ چھرے
ہے کچھ بے غیرت سانڈ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے سر ان بنیادوں پر کھڑی عمارت
سے ٹکرا کر اسے منہدم کر دیں گے تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں
یا نہیں ہو سکتا — ایسا ہرگز نہیں ہو گا — کم سے کم میرے جیتے جی کسی غدار
ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ اس کے لیے خواہ مجھے اپنے آپ سے،
سے یا کسی بھی طاقت سے ٹکرانا پڑے عارفہ تم بہادروں کی طرح میرا
دینا۔ میری بات ہمت حوصلے سے سُننا۔ مجھے شک ہے کہ لیاقت کو ان
لوں نے اغوا کیا ہے۔ وہ اسے یرغمال بنا کر کوئی سودے بازی کریں گے۔
میرا اندازہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے وہ خود کہیں چھپ گیا ہو۔ بہرحال کوشش
کہ اپنے گھر والوں کو مطمئن کر سکو۔ گو یہ مشکل کام ہے لیکن تمہی کو کرنا ہے۔
داری کے ساتھ۔"

گل شیر خان نے کہا۔

"میں جانتی ہوں گل شیر۔ ہم حالتِ جنگ میں ہیں کچھ بھی ممکن ہے، لیکن

میرا ایمان ہے کہ زندگی موت کا فیصلہ انسان نہیں کرتے کوئی اور ذات کرتی ہے اگر اللہ تعالیٰ نے لیاقت کو اپنے پاس بلانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔"

اُس لمحے عارفہ اُسے بدلی ہوئی عورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلے بے پناہ اعتماد نے گل شیر خان کو یقین دلا دیا تھا کہ جبر کے سامنے یہ کمزور لڑکی دیوار بن چکی ہے۔

عارفہ کے والدین کمرے میں اس طرح سر جھکائے داخل ہوئے تھے جیسے اُن سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔

گل شیر خان خود کو اُن کے سامنے شرمندہ محسوس کر رہا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی ان لوگوں کو کس طرح دلاسہ دے اور کس طرح اس بات کا یقین دلائے کہ ان کی واحد اولاد نسرینہ کی زندگی محفوظ ہے۔

اس کے بضد ہونے پر ان لوگوں نے گل شیر خان کے ساتھ چائے کا ایک کپ زہر مار کیا تھا اور اب وہ اُن سے رخصت ہونے کی اجازت لے رہا تھا جب اچانک ہی عارفہ کی بوڑھی ماں سوال بن کر اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"بیٹا ہمارے لیے قربانیاں دینا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے اجداد نے یہ روایت ہمیں نسل در نسل منتقل کی تھی جب ۱۹۴۷ء میں تقسیم پر ادھر آئے تھے تو اتنا کچھ لٹا دیا تھا کہ پھر لٹانے کو بھی کچھ پاس نہیں رہا تب ایک اطمینان ضرور تھا کہ اب ہم ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے ہیں۔ لیکن بیٹا یہاں تو....."

بے چاری بڑھیا سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

گل شیر خان کے لیے اس منظر کی تاب لانا ممکن نہیں تھا۔

"عارفہ ابھی امی کو حوصلہ دو۔ میں جاتا ہوں خدا حافظ۔"

اس نے عارفہ سے کہا اور اُن کی طرف دیکھے بغیر واپس لوٹ آیا۔

○

انسپکٹر کمال بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

"ہوں ___"

گل شیر نے اُس کی طرف یوں دیکھا تھا جیسے اُسے اس بات کا علم ہو رہا ہو کہ انسپکٹر کمال اُسے کیا خبر سنانے جا رہا ہے۔

"بڑے حرامی لوگ ہیں سر! میر صاحب کے اپنے گھر سے رخصت ہونے کے چند منٹ بعد ہی انہوں نے لیاقت کو اغوا کر لیا ___ افسوس ہم بروقت اس کی مدد نہیں کر سکے۔ آپ جانتے ہیں اُنہوں نے ہوسٹل میں اسلحے کے انبار لگا رکھے ہیں ___ یوں بھی کسی کا داخلہ ان لوگوں کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں۔ نواب خان نے کوشش کی تھی سر! اُسے بہت چوٹیں آئی ہیں۔ اگر ہمیں بروقت دیگر ذرائع کی مدد نہ مل جاتی تو شاید وہ سب انسپکٹر نواب خان کو جان سے ہی مار ڈالتے ___"

انسپکٹر کمال نے بغیر رکے اُسے بتا دیا۔

"کون ہے وہاں کا سیکٹر انچارج۔؟"

اس نے پوچھا۔

"جیدا لنگڑا ___ یاسین کونسلر کا بھائی جناب ___ انڈسٹریل ایریا والے ٹارچر سیل کا انچارج اور قتل کی کم از کم پندرہ وارداتوں کا براہِ راست ذمہ دار۔"

انسپکٹر کمال نے اُسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

"گویا یاسین کونسلر ہے اس حرام کاری کے پیچھے ___"

وہ آہستہ سے بڑبڑایا پھر کچھ سوچنے لگا۔ اچانک ہی ایک نتیجے پر پہنچ کر وہ مطمئن ہو گیا۔ اُس نے اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی تین بہنوں کے اکلوتے بھائی کی زندگی کو خطرے میں ڈالے۔ قانونی تقاضے پورے کرنے میں جتنی دیر ہوتی اتنی دیر میں تو وہ لوگ اس کے جسم سے بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دیتے اُسے فوراً کچھ کرنا تھا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

اس خاندان پر عذاب اسی کی وجہ سے آیا تھا۔ اگر اُن کا اکلوتا بیٹا زندگی کی بھینٹ چڑھ جاتا تو گل شیر شاید زندگی بھر اُن کا سامنا نہ کر پاتا۔

"سارے یونٹ کو "سٹینڈ بائی" رکھنا ۔۔ شام تک کچھ کرتے ہیں۔"

اُس نے اپنے ماتحت کو ہدایت دی اور تیزی سے باہر آ گیا ۔۔۔ اس نے جیپ وہیں چھوڑ دی تھی اور اب بڑی موٹر سائیکل کے ذریعے حسن خان کے ہوٹل کی طرف اُڑا چلا جا رہا تھا۔

○

حسن خان کے لیے اس کی اچانک آمد کوئی نئی بات نہیں تھی ۔۔۔ گل شیر کے کام ہمیشہ ہنگامی نوعیت کے ہی ہُوا کرتے تھے۔

ہوٹل کے ایک کمرے سے اُس نے عارف میاں سے رابطہ کر کے اُسے یہیں بلا لیا تھا۔ عارف میاں بھی حالات کی سنگینی کا احساس ہونے پر تیز رفتاری سے کار چلاتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔

"خیریت ہے ۔۔۔"

عارف میاں نے آج پہلی مرتبہ اپنے دوست کو اتنا پریشان دیکھا تھا۔ گل شیر خان نے اُسے مختصر کہانی سُنا کر ہدایت کی کہ لیاقت کا پتہ فوراً لگایا جائے۔

"مرکز میں تو وہ آیا نہیں ۔۔۔ گل شیر بھائی تُم شاید نہیں جانتے یاسین کونسلر اور اس کی قماش کے کچھ لوگ من مانیاں کرنے میں آزاد ہیں۔ یہ لوگ اکثر معاملات میں بابا صاحب کی پرواہ نہیں کرتے۔ یاسین نے تو انتہا کر دی ہے وہ نواب اپنا الگ "جھتہ" حاصل کرنے لگا ہے۔ انڈسٹریل ایریا والے ٹارچر سیل پر ان لوگوں کا مکمل کنٹرول ہے اور جسے جی چاہے بابا صاحب کی اجازت کے بغیر بھی وہیں لے آتے ہیں ۔۔۔ میرے خیال سے اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہے کھیل کو بیلنس کیا جائے۔ جس کے بعد ہی ہم بات کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے لیکن میں تمہارے سامنے جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔ ہم جتنی دیر کریں گے معاملہ اتنا ہی بگڑ جائے گا۔"

عارف میاں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم آنا نہ کرو۔ میں اپنا کام کرتا ہوں"۔

عارف میاں کی بات سمجھتے ہوئے گل شیر نے کہا۔

"ابھی لو ۔۔۔ خدا کرے وہ مِل جائے جس کو میں فون کرنے لگا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے عارف میاں نے اپنی جیبی ڈائری نکالی اور اُس میں سے ایک نمبر تلاش کرنے کے بعد گھمایا۔

دوسری طرف نمبر ملنے پر اُس نے اپنے منہ کے سامنے رومال رکھ کر بات کی تھی۔ گل شیر خان دلچسپی سے اُس کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ عارف میاں نے "۵۹" کے یونٹ انچارج قمر علی کی حیثیت سے بات کرتے ہوئے یاسین کونسلر کے تیسرے بھائی فیروز کو لسانی تنظیم کے ایک خفیہ ٹھکانے پر پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ معاملہ بہت سیریس ہے اور بابا صاحب خود

وہاں موجود ہیں اب سے ایک گھنٹے بعد میٹنگ شروع ہو جائے گی۔

دوسری طرف سے ملنے والے جواب نے اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑا دی تھی اور گل شیر خان نے اندازہ کر لیا تھا کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔

"ویل ڈن"

اس کے فون رکھنے پر گل شیر نے نعرہ تحسین بلند کیا۔

"گل شیر بھائی وقت کم ہے ـــــ میرے خیال سے وہ گدھا چل پڑا ہے۔ کیونکہ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ فون رکھتے ہی کپڑے بدل کر آ رہا ہے۔ اس کی گاڑی کا رنگ سفید ہے۔"

اس نے گل شیر کو جلدی جلدی تمام تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

جس خفیہ ٹھکانے پر عارف میاں نے اسے "۵۹" کے انچارج کی حیثیت سے پہنچنے کی ہدایت کی تھی اس کا سارا نقشہ اس نے گل شیر خان کو پہلے ہی سے سمجھا دیا تھا اور اس مقام کی بھی نشاندہی کر دی تھی جہاں سے وہ فیروز کو قابو کر سکتے تھے۔

اگلے ہی لمحے عارف میاں اپنے ٹھکانے کی طرف اور گل شیر خان کی راہنمائی میں حسن خان کے ساتھی ایک بند ویگن میں لسانی تنظیم کے خفیہ ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے۔

شہر کی معروف شاہراہوں سے ہٹ کر گل شیر خان انہیں اس راستے پر لے آیا تھا جہاں انہوں نے شکار کے لیے جال بچھانا تھا۔ ایک ایک تفصیل اس کے ذہن میں نقش تھی۔ طویل سڑک کے ایک محفوظ موڑ پر اس نے اپنے ساتھیوں کو منصوبے کے مطابق چھپا دیا تھا جس جگہ انہوں نے ناکہ لگایا تھا۔ یہاں سے سڑک کا ایک حصہ ٹوٹا ہونے کے سبب صرف اتنی سی جگہ تھی جہاں

بمشکل ایک بڑی گاڑی نکل سکتی تھی۔

اس سمت آنے والی شاہراہ پر گل شیر خان تقریباً دو اڑھائی کلومیٹر دور کھڑا ہوا تھا۔ اس کی بڑے مضبوط اور زیادہ ہارس پاور والی موٹر سائیکل ی شارٹ تھی اور وہ اس طرح سڑک کنارے کھڑا تھا کہ ایک لمحے میں موٹر سائیکل ہوا کی رفتار سے اڑا سکتا۔

پانچ چھ منٹ کے اعصاب شکن انتظار کے بعد اسے بالآخر ایک سفید شیراڈ ی دور سے آتے دکھائی دی۔ اس دوران یہ تیسری سفید رنگ کی کار تھی۔ دیکھ کر وہ ہوشیار ہوا تھا۔

لیکن ـــــ

قریب آنے پر جب وہ نمبر پڑھتا تو مطلوبہ گاڑی نہیں ہوتی تھی۔

اس کی چھٹی حس نے اس مرتبہ گل شیر خان کو چوکس کر دیا تھا کہ یہی اس طلوبہ گاڑی ہے اور وہ موٹر سائیکل پر اس طرح سوار تھا جیسے ابھی ابھی کوئی ل ٹھیک کرنے سے فارغ ہوا ہو۔

اس مرتبہ اس کا اندازہ واقعی صحیح تھا۔

فیروز اکیلا گاڑی چلاتا آ رہا تھا۔ اس نے اپنی کار کا ٹیپ ریکارڈر پوری سے کھولا ہوا تھا اور ملنگوں کی طرح لہک لہک کر گانے کی دھن پر گاڑی رہا تھا ـــــ عام حالت میں شاید وہ کبھی اکیلا سفر نہ کرتا تھا۔

لیکن ـــــ

آج چونکہ اسے ایک اہم مشن کی تیاری کرنا تھی اور بابا صاحب خود بلائے تھے تو ضرور کوئی اہم بات ایسی ہو گی۔ اس لیے احتیاطاً وہ اکیلا ہی طرف آ رہا تھا۔ وہ شاید میوزک کا کچھ زیادہ ہی شوقین تھا اور گاڑی کو اس

لیے معمول کی رفتار سے چلا رہا تھا کہ میوزک کا مکمل لطف اٹھا سکے۔

گل شیر خان کی تیز رفتار موٹر سائیکل نے اسے چند سیکنڈ میں جا لیا اور اب وہ اسے اوورٹیک کر کے اس کے آگے آگے پائلٹ کی طرح چل رہا تھا جلد ہی حسن خان اور اس کے ساتھیوں نے جو دور ہی لگائے کھڑے تھے اسے دیکھ لیا۔ دوسرے ہی لمحے ان لوگوں نے اپنی وین کو سڑک پر اس طرح ٹیڑھا کھڑا کر دیا کہ اسے ہٹائے بغیر دوسری گاڑی کے نکلنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

حسن خان اور اس کے دو ساتھی اس طرح وین کے پیچھے چھپے تھے کہ کار سوار کو دکھائی نہ دے سکیں۔ جبکہ تیسرے نے وین کا بونٹ اٹھایا ہوا تھا اور اس کی کوئی خرابی دور کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ ان لوگوں کے کھڑے ہونے کا انداز اتنا نیچرل تھا کہ کسی کو شک نہیں گزر سکتا تھا۔

گل شیر خان نے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار اب اتنی کم کر لی تھی کہ فیروز اس سے آگے نکل گیا۔ جیسے ہی اس نے اگلا موڑ مڑنا چاہا اچانک اس کا پاؤں بریک پر گیا اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے گالیوں کا فوارہ ابل پڑا۔ اگر وہ اچانک بریک نہ لگاتا تو سیدھا ویگن سے جا ٹکراتا۔ وہ غصے سے بے قابو ہوا جا رہا تھا اور اب اس نے کھڑکی سے گردن باہر نکال کر وین کے ڈرائیور کو گالیاں دیتے ہوئے اسے پرے ہٹانے کے احکامات بھی جاری کرنے شروع کر دیے تھے۔

"کیا ہوا جناب۔ خیریت تو ہے ——"

اچانک گل شیر نے اس کے نزدیک پہنچ کر دریافت کیا۔

اس دوران بونٹ کے نزدیک کھڑا نوجوان بھی نزدیک آ چکا تھا۔

"صاحب گالیاں کیوں دیتا ہے ——"

اس نے غصے سے کہا۔

فیروز اس کی بات کا جواب مزید گالیوں کی صورت میں دیتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اپنی دانست میں اس نے شاید اس گستاخ کا منہ بند کرنا چاہا تھا۔

لیکن ——

اچانک اسے یوں لگا جیسے آسمان پر تارے نکل آئے ہوں حالانکہ دن کی روشنی میں اس کا امکان نہیں تھا۔ اس کی پشت پر گدی کے نزدیک گل شیر خان نے جانے کس انداز کا ہاتھ مارا تھا کہ فیروز کے اوسان خطا ہو گئے۔

بے ہوش ہوتے فیروز نے آخری منظر یہی دیکھا کہ تین چار ہیولے بیک وقت اسے پکڑنے کو لپکے تھے انہوں نے فیروز کے بے ہوش جسم کو زمین پر گرنے سے پہلے ہی تھام لیا اور بجلی کی سی پھرتی سے وین میں ڈال کر لے گئے۔

ان کا ایک ساتھی وہیں رک گیا تھا جس نے فیروز کی گاڑی سڑک سے نیچے اتار کر جھاڑیوں کے پیچھے اس طرح کھڑی کر دی تھی کہ ڈھونڈنے پر بھی دکھائی نہ دے سکے۔ بعد میں وہ گل شیر خان کی موٹر سائیکل پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ کر آ گیا تھا۔

○

فون یاسین کونسلر نے معمول کے مطابق ہی اٹھایا تھا لیکن دوسری طرف سے "ہیلو" کی آواز نے اسے چونکا کر رکھ دیا۔

"کون ہو تم ——؟"

اس نے اپنی دانست میں فون پر ہی اتنی زور سے ہیلو کہنے والے کو ڈانٹا تھا کہ اس کا دم نکل گیا ہو گا لیکن یاسین کونسلر کے اندازے کے برعکس دوسری طرف کوئی مضبوط اعصاب کا مالک بات کر رہا تھا۔

"میرے خیال میں اس وقت تمہارا دماغ صحیح نہیں شاید ابھی شراب کا نشہ

نہیں اُترا ـــــ خیر! تمہاری مرضی. میں نے تو تمہیں تمہارے چہیتے بھائی فیروز سے متعلق خبر دینی تھی ـــــ"

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"کک کک کیا مطلب۔ کیا ہُوا فیروز کو۔ دیکھو۔ دیکھو۔ تم ...."

فیروز کا نام سُنتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ اُس کے منہ سے عجیب عجیب سے فقرے برآمد ہو رہے تھے۔

"میرا اندازہ صحیح نکلا. تمہارے حواس ابھی بحال نہیں ہوئے خیر ـــــ تم پہلے اس بات کی تصدیق کر لو کہ تمہارا بھائی فیروز ہے کہاں پھر بات کریں گے ـــــ میں آدھ گھنٹے بعد فون کروں گا۔ اس دوران تم شریف پورز کی جھاڑیاں دیکھ لو۔"

یاسین کونسلر ہیلو ہیلو چیختا رہ گیا اور فون کٹ گیا۔

اس نے دیوانہ وار اپنے کارندوں کو آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔

"فیروز کہاں ہے ـــــ؟ کہاں گیا ـــــ"

اپنے سامنے کھڑے کارندوں سے جن کی شکلوں پر لعنت برس رہی تھی اس نے اس طرح چیخ چیخ کر پوچھنا شروع کیا جیسے اُنہوں نے فیروز کو کہیں چھپا رکھا!

"ہمیں علم نہیں بھیا ـــــ"

اُن میں سے ایک نے ہمت کر کے جواب دیا۔

یاسین کونسلر اپنی دانست میں اُسے مارنے کے لیے آگے بڑھا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے خود پر قابو پا لیا اس طرح دیوانگی میں تو بنا بنایا کھیل ہی بگڑ جاتا۔

"شریف پورز کا سارے موڑ چیک کرو فوراً" ـــــ ابھی۔ جہاں منے کی گاڑی

نظر آئے وہیں رُک جانا۔ موبائل فون لے جاؤ اور فوراً مجھ سے رابطہ کرنا۔"

اُس نے اپنے پالتو غنڈوں کو اشارہ کیا اور وہ ایک دوسرے کے تعاقب میں نکل گئے۔

یہاں سے مطلوبہ جگہ کا فاصلہ بمشکل پندرہ بیس منٹ تھا۔ پندرہ منٹ بعد ہی یاسین کونسلر کو اطلاع مل گئی کہ اس کے منّا کی گاڑی کہاں کھڑی ہے۔

اب اس کی عقل واقعی ٹھکانے آگئی تھی اسے سمجھ لگ گئی کہ کسی نے اس شہر میں اس کی غنڈہ گردی کو نہ صرف چیلنج کر دیا ہے بلکہ عمل بھی کر کے دکھا دیا۔

اب اُسے بے چینی سے فون کا انتظار تھا۔ وہ بڑا منجھا ہُوا اور گھاگ شکاری تھا۔ جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں دماغ گرم رکھنے کا فائدے کے بجائے نقصان ہو جاتا ہے۔

اس مرتبہ گھنٹی بجی تو اس نے فون تو بے چینی سے اُٹھایا تھا لیکن خود پر اُسے مکمل کنٹرول تھا۔

"کیوں یاسین بھیا۔ پتہ لگ گیا کہ منّا ہمارے پاس ہے۔"

دوسری طرف سے طنزیہ لہجے میں کہا گیا تھا۔

"تم جو کوئی بھی ہو یا تو پاگل ہو یا پھر اس شہر میں تم نے آج ہی جنم لیا ہے ـــــ تم نہیں جانتے کہ کیا کر گزرے ہو ـــــ بہت تباہی پھیلے گی۔ میں تمہیں...."

اس نے خود ہی دانت پیستے ہوئے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا وہ فون پر تو غصہ نہیں نکال سکتا تھا۔

"ہاں ہاں کہو کہو ـــــ چُپ کیوں ہو گئے. یاسین میرے خیال سے ابھی تمہارا دماغ ٹھیک نہیں ہُوا بہرحال فی الوقت تمہارے لیے یہی حکم ہے کہ اگر منے کی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو اپنے قبضے میں موجود انجنیئرنگ یونیورسٹی کے نوجوان لیاقت کے جسم پر خراش نہ آنے دینا ورنہ یاد رکھنا اُدھر وہی حال تمہارے منّا کا ہو گا ـــــ"

دوسری طرف سے بات کرنے والے کا لہجہ بڑا خونخوار تھا۔

یاسین کونسلر کو فوراً ہی ساری بات کی سمجھ آگئی۔ تب اس نے بھی اندازہ لگایا تھا کہ جس ایجنسی نے میر صاحب کی بیٹیوں کو اس کی درندگی سے محفوظ رکھا ہے یقیناً انہی لوگوں نے اس کے بھائی کو اغوا کیا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ اب یہ لوگ اپنی بات منوائے بغیر اسے رہا نہیں کریں گے۔

"یاسین بھیا میر صاحب کی لونڈیاں بھاگی نہیں جا رہیں فی الوقت اپنے منا کو بچاؤ۔"

کسی نادیدہ قوت نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"تم کیا چاہتے ہو ___"

اس نے بڑے جبر سے خود پر قابو پایا ہوا تھا۔

"تبادلہ ___ تمہارے بھائی منا کے ساتھ لیاقت کا تبادلہ ___ لیکن اپنی شرائط پر ___"

"دیکھو مجھے اتنا مجبور نہ سمجھو ___ اگر تم اتنے بہادر ہو تو کھل کر سامنے کیوں نہیں آتے ___"

یاسین نے اپنی دانست میں اس کی غیرت کو للکارا تھا۔

لیکن ___

خدا جانے فون کرنے والا کس مٹی کا بنا ہوا تھا وہ جواب میں قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"یاسین بھیا تمہاری طرح ابھی میرا دماغ خراب نہیں ہوا ___"

اس نے کہا۔

یہ کم بخت کسی طرح قابو آنے والا نہیں۔ یاسین بھیا کے شیطانی ذہن نے

راہ سجھائی۔ اس نے انتقام کا بہت بھیانک طریقہ سوچا تھا بس منا کی واپسی کی دیر تھی۔

"کب چاہتے ہو ___"

اس نے فون پر پوچھا۔

"آج ___ بلکہ ابھی ___"

جواب ملا۔

"کہاں ___ کیسے ___؟"

یاسین نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"ہاں یہ ہے سوچنے کی بات۔ تم ایسا کرو۔ اپنی گاڑی میں باہر نکلو اپنا موبائل فون ساتھ رکھنا۔ لیاقت کو گاڑی میں بٹھاؤ اور بڑی شاہراہ پر نواحی آبادی کی طرف سفر کا آغاز کر دو۔ جہاں تمہیں پیغام ملے وہاں رک جانا ___ وہاں تمہارا منا موجود ہو گا ___"

دوسری طرف سے کہا گیا۔

بہت مکار لوگ تھے۔ انہوں نے یاسین بھیا کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی تھی۔

"لیکن ....."

"لیکن ویکن کے چکر میں نہ پڑو۔ ہم کوئی فارغ لوگ نہیں ہیں نہ ہی ہماری لیاقت سے وہ رشتہ داری ہے جو تمہاری اپنے منا یعنی فیروز سے۔ فون رکھنے کے پندرہ منٹ بعد اپنے گھر سے روانہ ہو جانا ورنہ رات کے پہلے پہر شہر کے کسی چوراہے سے اپنے منا کو اس حالت میں وصول کر لینا جس حالت میں تم اپنے شکار کو پھینکا کرتے ہو ___ سمجھے ___ ٹھیک پندرہ منٹ بعد گھڑی سے

وقت ملا تو ـــــ"

دوسری طرف سے اس کی بات کاٹ کر بڑی دُرشتی سے کہا گیا۔

یاسین کونسلر ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا اور دوسری طرف کھٹاک سے سلسلہ کٹ گیا۔

اُس کا بس چلتا تو اس شخص کی بوٹیاں نوچ لیتا جس نے اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی شدت سے بے بسی کا احساس دلایا تھا۔

لیکن ـــــ

اب ان باتوں کا وقت نہیں تھا۔

اس دنیا میں اس کی واحد کمزوری منا تھا اور منا کو کوئی نقصان پہنچ جاتا تو اس کا ازالہ لیاقت جیسے ایک ہزار نوجوانوں کو قتل کرنے سے بھی نہ ہوتا۔ یوں بھی اس نے سوچا اس شہر پر اُن کی بادشاہت کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ وقتی طور پر تو لیاقت بچ نکلے گا لیکن پھر؟

اور پھر میر صاحب بھی کب تک اپنی لڑکیوں کے ساتھ چھپتا پھرے گا۔ اُن کا اُسے بہرحال واپس لوٹنا پڑے گا۔ اُس کی یہ جرأت کہ اُس نے تنظیم کے آقاؤں کے حکم کے بغیر اپنی لڑکیوں کے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کا ناقابلِ معافی جرم کیا ـــــ اُس نے میر صاحب کے لڑکے لیاقت کو اسی لیے اُٹھایا تھا کہ اس کے ذریعے میر صاحب سے سودے بازی کر کے اُنہیں واپس آکر معافی مانگنے پر مجبور کر سکے۔

یہ وحشی درندے حکمرانی میں بھی نمرود کی خدائی کے قائل تھے۔ اُس کی حس درندگی کو تب ہی تسکین پہنچتی جب وہ میر صاحب کی بیٹیوں کی عصمت دری کر کے اپنی ہوس اور انتقام کی آگ بجھاتا ـــــ اس طرح وہ اس کیس کو اسی

علاقے میں "ٹسٹ کیس" بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا تا کہ آئندہ اگر کسی کے دماغ میں بغاوت کے جراثیم پرورش پا رہے ہوں تو ابھی سے مر جائیں۔

لیکن ـــــ

فی الوقت تو اس کے ارادوں پر پانی پھر گیا تھا۔

"کوئی بات نہیں میر صاحب۔ میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں ـــــ یاد رکھنا جس روز قابو آ گئے گن گن کر سارے حساب چکا دوں گا ـــــ"

اس نے دل ہی دل میں کہا اور اپنا موبائل فون اُٹھا کر غصے سے پیر پٹختا باہر نکل گیا ـــــ!

○

یاسین کونسلر کے ساتھی اپنے آقا کا موڈ دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔ انہوں نے چاہا کہ اپنی جاں نثاری ثابت کرنے کے لیے اظہارِ ہمدردی کریں لیکن دوسری طرف سے سوائے مغلظات کے [illegible] ہو رہا تھا۔

وہ اپنے [illegible] ہاؤس تک آیا تھا جہاں سے اُس نے لیاقت [illegible] پہنچایا تھا۔ خدا کا شکر ہوا کہ اس پر زیادہ تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ شاید ابھی وہ تازہ تازہ ہی اُن کے قابو آیا تھا۔

بادلِ ناخواستہ اسے لیاقت سے کہنا پڑا کہ اُسے رہا کرنے کے لیے جا رہا ہے اور وہ مطمئن ہو کر بیٹھا رہے۔

خوف سے لیاقت کے منہ سے لفظ بھی نہیں نکل پا رہا تھا۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ یاسین بھیا کو شکریہ ہی کہہ دیتا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم سے رُوح نکال لی ہے اور ڈھانچہ چلنے پھرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

یاسین کونسلر اپنی حفاظت سے غافل نہیں تھا اور اس نے اپنی دانست میں

بڑی چالاکی دکھائی تھی۔

لیکن ——

اس کا مقابلہ نجانے دُنیا کی کس مخلوق سے تھا جیسے ہی وہ انڈسٹریل ایریا سے باہر نکلا فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ہاں ——"

اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

اپنی گاڑی کو سکیم نمبر ایک کی مین سڑک سے چلاتے سکیم نمبر پانچ تک لے جاؤ ——"

دوسری طرف سے حکم ملا اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فون بند ہو گیا۔

یاسین کو نسدر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے غصّے سے اُس کے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔ ان لوگوں نے اسے پاگل کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

وہ دیوانہ وار گالیاں بک رہا تھا اور کار کی پچھلی سیٹ پہ سہما ہُوا لیاقت مزید سہم کر رہ گیا تھا۔ ابھی وہ سکیم نمبر ۳ تک ہی پہنچا تھا جب دوبارہ فون کی گھنٹی بجی۔

"اب کیا مصیبت آگئی ہے"

اس نے فون اُٹھاتے ہی پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"دیکھو یاسین بھیّا اپنے دماغ کو قابو میں رکھو۔ بعد میں جب تم جی بھر کے پچھتاؤ گے تب غصہ بھی کھا لینا۔ فی الوقت اپنے ہوش و حواس قائم رکھو یہ منّا کی جان کی سلامتی کے لیے بہت ضروری ہے۔"

دوسری طرف سے اس طرح کہا گیا جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے کسی مریض کو مشورہ دے رہا ہو۔

"اچھا! اچھا۔ زیادہ نصیحتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے ہتھیار پھینک دیے۔

"تو سنو —— ہمارے اور تمہارے معاہدے میں یہ بات کہیں شامل نہیں تھی کہ تم اپنے ساتھ حفاظتی فوج لے کر آؤ گے۔ تمہیں اکیلے آنے کا حکم دیا گیا تھا —— تم نے نورنگ آباد میں اپنی کم از کم چھ کاریں پہلے سے الرٹ کر دی ہیں —— اور اب بھی تمہارے تعاقب میں گہرے رنگ کی جو گاڑی آ رہی ہے اس میں تمہارے لوگ سوار ہیں —— یاسین بھیّا اگر میں چاہوں تو ابھی یہ معاہدہ منسوخ ہو سکتا ہے لیکن ایک پہلی اور آخری معافی تمہیں دی جا رہی ہے —— اپنی گاڑی اور ان گدھوں کو گھر واپس بھیج کر پہلی چورنگی پہ آ جاؤ —— ہم نے پلان بدل دیا ہے۔"

اس مرتبہ بھی اس نے یاسین کی بات سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

یاسین بھیّا نے زندگی میں پہلی مرتبہ خود کو کسی حد تک خوفزدہ محسوس کیا تھا۔ خدا جانے اس کا پالا کس بلا سے پڑ گیا تھا جس سے اس کی کوئی حرکت چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اُس نے اپنی دانست میں بہت چالاکی سے سارا جال بُنا تھا۔

لیکن ——

یہاں تو سب تدبیریں اُلٹی ہو رہی تھیں۔

اس نے اپنی کار کو بریک لگا کر روکا اور اپنے تعاقب میں آنے والی کار کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"اُلو کے پٹھو —— تمہیں میں نے اپنی نگرانی کے لیے کہا تھا —— اپنے ساتھ چپکے رہنے کے لیے نہیں ——

"دفع ہو جاؤ —— چلے جاؤ ——"

اُس نے دیوانوں کی طرح چلاتے ہوئے کہا۔

یاسین اپنی گاڑی میں ابھی بیٹھا ہی تھا جب اچانک ایک وین نے

اس کا راستہ روک لیا۔

یہ وین اتنی تیزی سے اچانک اُس کے سامنے آئی تھی کہ اگر وہ بریک لگانے میں معمولی سی کوتاہی کا مظاہرہ کرتا تو اُس سے ٹکرا جاتا۔

وین کا دروازہ کھلا تو اُس کی نظر مُنّا پر پڑی جس کے سرہانے ایک نقاب پوش پستول تانے کھڑا تھا۔

دو نقاب پوش اُتر کر نیچے آ گئے۔

"لڑکے کو باہر نکالو ——"

اُن میں سے ایک نے اس کی طرف پستول تان کر کہا۔

یاسین اس اچانک صورتحال سے گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ اس نے دوسرے ہی لمحے بلا ارادہ ہاتھ کھڑے کر دیے۔ لیاقت شاید اس لمحے کا منتظر تھا۔ وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

"ہم اگر چاہیں تو اسے یوں بھی لے جا سکتے ہیں لیکن ہم تمہاری طرح بزدل اور بے غیرت نہیں ہیں —— یہ لو اپنا مُنّا سنبھالو —— اور یاد رکھنا اب مظلوموں نے ہتھیار اُٹھا لیے ہیں۔"

نقاب پوش اس سے باتیں کرتا رہا جبکہ اس کے دوسرے ساتھیوں نے سہمے ہوئے مُنّا کو نیچے اُتار کر اُس کے بھائی کی گاڑی میں سوار کروا دیا۔

یاسین کا جی چاہتا تھا ان کی بوٹیاں نوچ لے۔

لیکن ——

وہ بے بس تھا۔

یہ لوگ مسلح اور انتہائی چالاک دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی ذرا سی بے وقوفی دونوں بھائیوں کی جان لے سکتی تھی۔

اُسے چند سیکنڈ کی مہلت درکار تھی جس کے بعد اس کے ایک اشارے پر اس بن کے سواروں سمیت پرخچے اُڑ جاتے۔

لیاقت کو ان لوگوں نے بازو سے پکڑ کر وین کے اندر بند کیا تھا جو شاید ل سے بھاگنے کی فکر میں تھا۔

اچانک ہی وہ سب بجلی کی سی پھرتی سے وین میں سوار ہو گئے تھے جس ڈرائیور نے ابھی تک انجن بند نہیں کیا تھا۔ وین جھٹکے سے آگے نکل گئی یاسین اس کی نمبر پلیٹ پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ کر لیا تھا کہ نمبر پلیٹ نقلی ہے۔

اس نے اپنے بھائی کو گالیاں دیتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کی بمشکل چند گز چلنے ہی اُسے احساس ہُوا کہ ان کا ٹائر پنکچر ہے۔

وہ لوگ جاتے جاتے اس کے ٹائر میں سوراخ کر گئے تھے۔ یاسین کونسلر نے یں اپنا سر سٹیرنگ سے دے مارا۔ پھر اس کے منہ سے 'سی' کی آواز نکلی اور وہ ایاں بکتا گاڑی بند کر کے نیچے اُتر آیا۔

اپنے موبائل فون پر وہ دیوانہ وار انگلیاں مار رہا تھا۔

لیکن ——

اس کے اپنے بدمعاشوں سے رابطہ کرنے تک وین اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور اس کی دسترس سے باہر ——"

○

وین دو تین گلیوں کا چکر لگا کر ایک جگہ رُک گئی۔ اس میں موجود لیاقت ابھی تک سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ان لوگوں کو دوست سمجھے یا دُشمن۔

یہ اس کے ہم زبان نہیں تھے۔ اس کا اندازہ اُسے فوراً ہی ہو گیا تھا۔

"کون ہیں آپ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟"

اس نے ہمت کر کے بالآخر ایک نقاب پوش سے پوچھ ہی لیا۔

"ہم تمہارے دوست ہیں۔ تمہیں اس بدمعاش کے چنگل سے نکال کر تمہارے والدین تک پہنچا رہے ہیں۔ اب کوئی سوال نہ کرنا۔۔۔"

اُسے بڑی سرد مہری سے جواب دیا گیا اور واقعی اُس نے کوئی سوال دوبارہ نہیں کیا۔ فی الوقت اس کے پاس خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ویگن رُکنے پر ایک گاڑی اُسے دکھائی دی اور ویگن سواروں نے اُسے اس میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ لیاقت کے لیے سوائے اُن کے احکامات پر عمل کرنے کے کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔ وہ بلاچوں چراں کار کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔

ویگن برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔

"گھبراؤ نہیں تم میر صاحب اور اپنی بہنوں کے پاس جا رہے ہو۔۔۔ مجھے افسوس ہے تمہیں کچھ دیر ان لوگوں کی قید میں رہنا پڑا۔"

بات کرنے والے کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔

"میں آپ کو جانتا نہیں لیکن آپ جو کوئی بھی ہیں میرے لیے تو خدا کی رحمت بن کر آئے ہیں۔ آپ نے مجھے ان موذیوں سے بچا لیا ورنہ یہ۔۔۔"

اس کی بات نامکمل تھی جب اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکیاں لے کر رونے لگا۔

"حوصلہ کرو یار تم نوجوان آدمی ہو۔۔۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر تمہارے گھر والوں پر کیا گزرے گی۔۔۔ وہ بےچارے پہلے ہی پریشان ہیں۔"

گل شیر خان نے اُسے حوصلہ دیا جو ڈرائیور کے روپ میں اُس کے

ساتھ موجود تھا۔

تھوڑی دیر بعد واقعی وہ اپنے والدین کے پاس پہنچ چکا تھا جن کی زبانیں گل شیر کا شکریہ ادا کرتے نہیں تھکتی تھیں۔

"ابھی اللہ تعالیٰ نے اس شہر کے سر سے اپنا ہاتھ نہیں اٹھایا ماں جی۔۔۔ بابا صاحب یا اس کے غنڈے اتنے طاقتور نہیں کہ زمین پر خدا بن بیٹھیں۔۔۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کی موت بہت نزدیک ہے۔۔۔ انشاء اللہ بہت جلد اس شہر پر بہار آئے گی۔۔۔ یہ شہر نگاراں زندگی کی رعنائیوں سے منور ہو گا۔ بہت جلد انشاء اللہ۔۔۔"

"انشاء اللہ"۔

اُس کی بات کا جواب غمزدہ انسانوں نے بے ساختہ دیا۔

تھوڑی دیر تک اُن کے ساتھ رہنے کے بعد گل شیر خان وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اُس نے میر صاحب اور لیاقت کو کچھ ہدایات دی تھیں اور انہیں سختی سے تاکید کی تھی کہ ابھی اس گھر سے باہر نہ نکلیں۔

میر صاحب نے اس سے جاتے جاتے درخواست کی تھی کہ اگر ممکن ہو تو اُن کا گھر فروخت کروا دے۔ اب وہ لوگ اس محلّے میں نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں اُن پر زندگی اجیرن ہو جاتی۔ وہ جہاندیدہ آدمی تھے۔ ایک زمانہ دیکھا ہوا تھا انہوں نے۔۔۔ اور جانتے تھے کہ ان وحشیوں کی دسترس سے جتنا محفوظ رہا جائے غنیمت ہے۔۔۔

انجام

عین اُن لمحات میں جب گل شبراانہیں تسلی دے کر رخصت کر رہا تھا کہ کوئی اُن کا بال بیکا نہیں کرسکتا اور وہ اپنے ہی گھر میں واپس لوٹیں گے۔

میر صاحب کا گھر نذرِ آتش کیا جارہا تھا۔

یاسین کونسلر کے بھائی سرفراز منّا کی کمان میں لسانی تنظیم کے وحشیوں کا گروہ اُن کی زندگی بھر کی کمائی کے حاصل اس واحد گھر میں موجود مال اسباب لوٹنے کے بعد اُس پر پٹرول چھڑک کر اُسے آگ دکھارہے تھے۔

اس شہرِ بے مثال میں "غداروں" کی کم از کم سزا یہی تھی ــــ

سارا محلہ سہم کر اپنے گھروں میں دبک گیا تھا ــــ

شعلے بلند ہورہے تھے ــــ

لپٹیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔

درندوں کے قہقہے بھی اسی رفتار سے فضاؤں کا کلیجہ چھلنی کر رہے تھے۔

فائر بریگیڈ محلے کے باہر غنڈوں کے احکامات کا منتظر تھا۔ انہیں اس وقت مکان تک پہنچنے کی اجازت ملی جب اس میں موجود ہر شے جل کر راکھ ہوچکی تھی۔ اور اب یہ آگ دوسرے مکانات کو بھی اپنے دامن میں لپیٹنے کو بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

وہاں اب راکھ کے ڈھیر، چٹختی لکڑیاں اور اُن میں سے اُٹھتے دھوئیں کے سوا کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

صبح ڈھل رہی تھی۔

یہاں کے مکین سہمی سہمی نظروں سے جلے ہوئے مکان کے کھنڈرات پر دل ہی دل میں کفِ افسوس مل رہے تھے۔

لیکن ــــ

بے چاروں کو با دلِ نخواستہ لسانی تنظیم کے غنڈوں کی ہاں میں ہاں ملا کر میر صاحب جیسے تنظیم کے غداروں کو ملنے والی اس سزا پر مصنوعی خوشی کا اظہار کرنا پڑ رہا تھا۔

کتنے بے بس تھے یہ بے چارے لوگ ــــ

○

اختر ملک کے یہ سارے اندازے پہلے ہی روز غلط ثابت ہوگئے تھے۔

پہلے ہی روز دورانِ تفتیش اس کا واسطہ جن لوگوں سے پڑا وہ شاید گونگے بہرے تھے۔ کیونکہ ملک اختر کی کوئی بات سُننے یا سمجھنے کے بجائے وہ اپنی بات اُسے سُنانے یا سمجھانے پر لگے رہے۔

یہاں اس کی حیثیت ایک غدار اور گھٹیا درجے کے مجرم کی سی تھی۔

کسی کو اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ وہ کون ہے اور کس کا بیٹا ہے؟

وہ لوگ اُس سے بار بار ایک ہی سوال کر رہے تھے کہ اس نے اب تک ملک کو کس حد تک نقصان پہنچایا ہے۔

کس کس کے اشارے پر کون کون سے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کیا ہے؟

انہوں نے پہلے ہی روز اس کے سامنے بنا کشتی کے "بھائیوں" اور "رشتہ داروں"

کے ساتھ اس کی ملاقات کی فلمیں چلا کر دکھا دیں۔

اس کی ریکارڈ شدہ گفتگو اُسے سُنا دی۔

اس بات پر کوئی شک نہیں تھا کہ اختر ملک پر آج پہلی مرتبہ انکشاف ہو رہا تھا کہ پروین کا اصلی نام بینا کشی ہے اور وہ بھارتی انٹیلی جنس "را" کی تربیت یافتہ ایجنٹ ہے جسے اس ملک میں داخل ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ ملک اختر جیسے گدھوں کو اپنی جنسیت کے جال میں پھنسا کر اپنا اُلو سیدھا کرتی رہے۔

اس کے لیے تو یہ بھی انکشاف ہی تھا کہ بینا کشی کے بھائی اور رشتہ دار دراصل بھارتی ہائی کمیشن کے وہ ملازمین تھے جو یہاں سفارت کاروں کے روپ میں جاسوسی کا جال پھیلائے بیٹھے ہیں۔

اس بات سے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا کہ لسانی تنظیم ایک دہشت گرد، ملک دشمن اور غیر ملکی طاقتوں کی آلۂ کار جماعت ہے۔ جس کا مقصد ہی ملک کی تباہی اور ایک الگ ملک کا قیام ہے۔ ملک اختر نے مان لیا تھا کہ ان لوگوں کے پاس جتنے ثبوت اُس کے خلاف جمع ہو چکے ہیں اس کے بعد ملک اختر کا بچ نکلنا ناممکن تھا۔

اس کی دولت، رشتہ داریاں، اثر و رسوخ کچھ بھی یہاں کام نہیں آ سکتا تھا۔ یہ لوگ تو نجانے کس مٹی کے بنے ہوئے تھے۔

ان کا افسرِ اعلیٰ خود تفتیش کی نگرانی کر رہا تھا۔ اور کیا مجال جو ایک لمحے کے لیے بھی اُس نے کسی مرحلے پر غفلت کا مظاہرہ کیا ہو۔

ملک اختر نے اپنے جسم کو اذیتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کے سامنے تمام حقائق کا اعتراف کر لیا۔

اس کی زبان جب کھلی تو انکشافات کے دریا بہاتی چلی گئی۔

ایسے ایسے بھیانک انکشافات جنہوں نے اُس کا بیان قلمبند کرنے والی خصوصی کمیٹی کو بھی لرزا کر رکھ دیا۔

اس کمیٹی میں ملک کی قریباً سب ہی اہم ایجنسیوں کے نمائندے موجود تھے۔

یہ "افسرِ اعلیٰ" کا کمالِ فن تھا کہ انہوں نے ابھی تک ملک اختر پر تھرڈ ڈگری طریقے استعمال نہیں کیے تھے۔ اور اس کی زبان کھول لی تھی۔

اُن کی درخواست پر ہی جی ایچ کیو نے ایک خصوصی ٹیم ملک اختر کا بیان قلمبند کرنے کے لیے تشکیل دی تھی۔

اس ٹیم کے اراکین جب ملک اختر کا بیان ریکارڈ کر رہے تھے تو ان میں سے ہر کسی کا دل چاہتا تھا کہ ابھی اُٹھے اور اس موذی کا گلا گھونٹ دے۔ جس نے محض اپنی ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر مادرِ وطن کو درندوں کے سامنے گروی رکھ دیا تھا۔

یہ شخص اُن کے نزدیک واجب القتل تھا جس نے ملک دشمن دہشت گردوں کو ایسی محفوظ آڑ بہم پہنچائی تھی جس کے پس پردہ وہ آسانی سے اپنے شیطانی عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے تھے۔

ملک اختر کا طویل بیان جو سلولائیڈ کے فیتوں پر محفوظ ہوا تھا اب کاغذات پر منتقل کیا جا رہا تھا تاکہ اس کے سیاہ کارناموں کی فائل اربابِ بست و کشاد کی خدمت میں پہنچا کر اُن سے درخواست کی جائے کہ وہ ان وحشیوں کے خلاف کارروائی کی اجازت دے دیں۔

○

بینا کشی کے سامنے وہ ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا جس پر ملک اختر کی آواز

میں ریکارڈ ٹیپ چل رہی تھی اور اُس نے بینا کشی کے ساتھ اپنی سیاہ کاریوں کا سارا کچا چٹھا بیان کر دیا تھا۔

"بکواس کرتا ہے ـــ جھوٹ بولتا ہے یہ ـــ"

اُس نے چلاتے ہوئے کہا اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

"دیکھو بینا کشی ـــ اچھے یا برے بہرحال ہم نے کچھ دن اکٹھے گزارے ہیں۔ میں جانتی ہوں تم اپنے وطن سے وفادار تھیں اور میں اپنا فرض ادا کر رہی تھی۔ اب تک اگر تم پر تھرڈ ڈگری طریقے استعمال نہیں کیے گئے تو اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ میں نے ان لوگوں کو یقین دلا رکھا ہے کہ تم میری بات مان لو گی ـــ لیکن کب تک؟ آخر تمہیں زبان کھولنا ہو گی ـــ میرے سامنے نہیں تو اُن کے سامنے۔ تم ان لوگوں کو نہیں جانتی۔ تمہارا واسطہ اس ملک میں ابھی تک ملک اختر اور لسانی تنظیم کے غداروں میں سے رہا ہے۔ ابھی اس زمین کی کوکھ ایسی بانجھ بھی نہیں ہوئی کہ یہاں کی مائیں وطن کی آن پر مٹنے والوں کو جنم دینا ہی چھوڑ گئی ہوں ـــ یہ لوگ عورت کا بہت احترام کرتے ہیں، لیکن عورت کا۔ تم ان کے نزدیک ہرگز عورت نہیں ہو۔ تم جانتی ہو تم کیا ہو؟ میں جا رہی ہوں۔ اب یہ لوگ تم سے خود سچ اگلوا لیں گے ـــ تمہیں بتانا تو ہو گا ہی ـــ سب کچھ بتانا ہو گا۔ ایک ایک تفصیل بیان کرنی ہو گی۔ تمہارے منہ میں تو زبان لگی ہے یہاں تو گونگے بول پڑتے ہیں۔ ان لوگوں کو تو دیواروں سے کہلوا لینے کا فن آتا ہے اگر تمہارے دماغ میں ابھی تک یہ فتور سمایا ہوا ہے کہ تم انہیں بیوقوف بنا لو گی تو میں سمجھوں گی کہ "را" کے لوگ بہت احمق ہیں جنہوں نے تمہارا انتخاب کیا تھا۔ انہیں سب کچھ بتا دو۔ یہی صورت ہے تمہارے وجود کی سلامتی کی۔ تمہیں سزائے موت نہیں ہو گی۔ ممکن ہے کسی سطح پر کوئی سودے بازی دونوں ملکوں کے درمیان ہو جائے۔

اور تم کسی کے تبادلے میں رہا ہو کر اپنے ملک چلی جاؤ ـــ لیکن اپاہج زندگی جینے کا کیا فائدہ ـــ"

انسپکٹر آصفہ نے بینا کشی سے کہا۔

آصفہ کو پہلے ہی روز سے اس کی تفتیش پر مامور کر دیا گیا تھا۔

لیکن ـــ

ان لوگوں کے اندازوں کے برعکس بینا کشی نے زبان کھولنے سے انکار کر دیا۔

اس نے اپنی شناخت تک بتانے سے انکار کر دیا۔

یہ "افسرِ اعلیٰ" کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بھارتی انٹیلی جنس کی جو فاحشائیں یہاں بھیجی جاتی تھیں انہیں ذہنی ہی نہیں جسمانی مشقت کے بھی صبر آزما لمحات سے گزارنے اور مکمل اطمینان حاصل کرنے کے بعد ہی اپنے مشن پر روانہ کیا جاتا تھا۔

○

بینا کشی نے پانچویں ہی روز ہتھیار ڈال دیے کیونکہ اس کا واسطہ بھی اپنے سے بہت زیادہ مضبوط لوگوں سے تھا۔

جب اُس کی زبان کھلی تو حیرت انگیز اور لرزا دینے والے ایسے ایسے انکشافات کر دیا اس نے بہلائے کہ سننے والوں کو ششدر کر کے رکھ دیا۔

اس نے بہت سے ایسے رازوں کا انکشاف بھی کیا جن کے متعلق عارف میاں کو گمان ہی نہیں گزر سکتا تھا۔ آج اعلیٰ قیادت کے علم میں بالآخر یہ بات آ گئی تھی کہ جس بابا صاحب کی چوکھٹ پر سر جھکا کر وہ اقتدار کی بھیک مانگا کرتے تھے وہ ملک دشمن، غدار اور درندہ تھا۔

اس نے مادرِ وطن کا سودا بہت سستے داموں اغیار کے ساتھ کیا تھا اور خود

ایک الگ مملکت بنا کر اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا۔

○

کور ہیڈ کوارٹرز میں یہ ہنگامی اجلاس جو صبح شروع ہوا تھا رات گئے تک جاری رہا۔ "افسرِ اعلیٰ" نے مجرموں کے ایک ایک گناہ کو بے نقاب کیا۔ ایسے ایسے ثبوت فراہم کیے کہ جن کے بعد اُن کے بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"جنابِ والا! آج ہم لوگ جو یہاں اکٹھے ہوئے ہیں تو اسے معمولی کارروائی نہ سمجھا جائے۔ مجھے آخر میں صرف یہی عرض کرنا ہے کہ مجرم آپ کے سامنے ہے۔ اس کے گناہ ایسے نہیں کہ اُس پر ایک لمحے کے لیے بھی رحم کیا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں کچھ چہروں پر شکنیں نمودار ہوئی ہیں۔ افسوس میرا تعلق اربابِ سیاست سے نہیں۔ میں صرف اس ملک کا ادنیٰ سا غلام ہوں جسے حکومت ملکی سالمیت کو برقرار رکھنے کی تنخواہ دیتی ہے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آج بھی اگر ہم نے مصلحتوں سے دامن نہ چھڑایا اور منافقت کا شکار رہے تو خدا کا ایسا عذاب ہم پر نازل ہوگا کہ پھر نہ کوئی بستی بچے گی اور نہ اس کے مکین۔ نہ ایوانِ اقتدار بچیں گے نہ ان کے مسند نشین۔ اس سے پہلے کہ قدرت کا اپنا نظام روبہ عمل ہو میری درخواست ہے کہ تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر فوراً مجرموں کی گرفتاری کا حکم دیا جائے۔ اور اُنہیں قرار واقعی سزا بھی دی جائے۔"——

وہ اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

"لونڈا ہے —— سالا —— ہمیں بیوقوف سمجھتا ہے۔ کل کے بچے اب ہمیں حکومت کرنے کے طریقے سکھائیں گے۔"

وزیرِاعلیٰ نے اپنے پہلو سے چھٹے پولیس کے اعلیٰ افسر سے کہا جس نے طنزیہ مسکراہٹ بہت پہلے سے چہرے پر سجا رکھی تھی۔

یہاں موجود بہت سے لوگ اس دوران پہلو بدل کر رہ گئے تھے۔ انہیں شاید ایک سرکاری افسر کا یہ اندازِ گفتگو بہت پسند نہیں آیا تھا۔

وہ چاہتے تھے کہ غداروں کے لیے بھی سرکاری القابات استعمال کیے جائیں اور اُنہیں دورانِ گفتگو بھی وہی عزت دی جائے جو اُنہیں سرکار دربار میں بعض مصلحتوں کے تحت حاصل تھی۔

ایک کور کمانڈر کی ہستی ایسی ضرور تھی جس نے اس درد کو اپنا درد جانا تھا اس کے بھی یہی جذبات تھے جو "افسرِ اعلیٰ" کے تھے۔

"کوئی غدار بچ نہیں پائے گا میرے نوجوان دوست۔"

انہوں نے اپنی گھنی مونچھوں والے بارعب چہرے کے ساتھ باری باری اہلِ محفل پر نظر ڈالی۔

"میرے خیال سے اب کوئی گنجائش باقی نہیں بچی۔ مجھے اُمید ہے وزیرِاعلیٰ صاحب ہمارے ساتھ تعاون کریں گے۔"

کور کمانڈر کی آواز کیا تھی گویا پگھلتا ہوا سیسہ تھا جو وزیرِاعلیٰ کے کانوں میں کسی نے انڈیل دیا تھا۔

"ٹھیک ہے جنرل صاحب۔ ٹھیک ہے لیکن میں یہی کہوں گا کہ عجلت سے کام نہ لیجیے۔ میں مرکز میں بات کرتا ہوں کوئی فیصلہ اگر ہوگا تو اعلیٰ قیادت کے مشورے سے ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ اکیلا میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ کوئی فیصلہ کر سکوں۔"

اُس نے منافقت بھری مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بچھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ہمیں کل تک حکومت کی مرضی سے آگاہ کر دیجئے ۔ میں اس سلسلے میں ۴۸ گھنٹے سے زیادہ مہلت نہیں دے سکتا ۔"

کور کمانڈر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

یہ اجلاس برخاست کرنے کا اشارہ بھی تھا۔

○

بابا صاحب کو وزیرِ اعلیٰ کا ہنگامی پیغام اس میٹنگ کے خاتمے کے بمشکل چند منٹ بعد ہی مل گیا تھا۔

"بابا صاحب فی الوقت آپ نکل جایئے معاملات ہمارے قابو میں نہیں ہے۔ میں نے بمشکل ۴۸ گھنٹے کی مہلت لی ہے اس درمیان بندوبست مکمل ہے۔ آپ کو فی الوقت منظر سے ہٹنا ہوگا۔ ورنہ کچھ بھی ممکن ہے۔"

بابا صاحب کو اس بات کا علم تو تھا کہ کوئی گڑبڑ چل رہی ہے۔

لیکن ـــــ

اس طرح اچانک پانسہ ہی پلٹ جائے گا۔ اس کا اندازہ وہ نہ کر سکے۔ اُن کی ہٹ دھرمی اور انا اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ اس طرح دُم دبا کر بھاگ جائیں۔

ابھی وہ اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے کہ اچانک مختلف دفاتر سے گرفتاریوں کے فون آنے لگے۔

فوج نے اُن کے خلاف آپریشن شروع کر دیا تھا۔

"بابا صاحب آپ تیاری کیجئے۔ انتظامات مکمل ہیں۔ ایک گھنٹہ بعد کی فلائیٹ سے آپ عمرہ کرنے جدہ جا رہے ہیں جہاں سے پھر یورپ کی طرف نکل جایئے گا۔"

رخسانہ نے اچانک ہی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"او ۔۔ کے"

بابا صاحب کی زبان نے بمشکل دو لفظ ادا کیے۔

چند منٹ بعد ہی بابا صاحب اپنے خصوصی محافظ دستے کے ساتھ ایئرپورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ "مرکز" والوں کو بھی بتایا گیا تھا کہ ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے اور فوراً ان کا آپریشن کرنا پڑے گا۔ دو ڈاکٹر بھی اُن کے ساتھ جا رہے تھے۔ بابا صاحب کی شدید خواہش پر انہیں پہلے عمرہ ادا کرنے کے لیے جدہ لے جایا جا رہا تھا۔

عارف میاں اُس محافظ دستے کی کمان کر رہے تھے جس نے بابا صاحب کو جدہ پہنچانا تھا جس کے بعد رخسانہ اور ڈاکٹروں کے روپ میں دو دہشت گردوں نے اُن کے ساتھ یہاں سے فرار ہونا تھا۔

گل شیر خان کو عارف میاں نے جان پر کھیل کر فون کیا تھا۔

"خان بھائی ـــــ بھاگ رہا ہے۔ جانے نہ دینا۔ فوراً ایئرپورٹ پہنچو۔ فوراً"

گل شیر خان کا خون کھول رہا تھا۔

"بھاگ رہا ہے!"

وطن فروش، ہزاروں بے گناہوں کا قاتل، خونی درندہ، مادرِ وطن کو دشمن کے ہاتھ گروی رکھ کر بھاگ رہا تھا۔

اور یہ سیاست دان، حکمران۔ آج بھی اُسے اس اُمید پہ بھگا رہے تھے ابھی یہ ترُپ کا پتہ پھر چل جائے گا۔

"نہیں بابا صاحب ـــــ نہیں ـــــ"

اس نے دیوانہ وار اپنی جیپ کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں زندہ بچ کر نہیں جانے دوں گا۔ وحشی۔ درندے۔ دہشت گرد۔"

گل شبیر خان پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔

ائرپورٹ پہنچنے تک۔ وہ دو معمولی ایکسیڈنٹ بھی کر چکا تھا اور جس انداز سے ڈرائیونگ کرتا یہاں تک آیا تھا اس کے بعد اس کا زندہ بچ جانا ہی معجزے سے کم نہیں تھا۔ !

جزا و سزا کا اختیار اُسے نہیں تھا۔ وہ سرکاری ملازم تھا۔ اس کا کام گناہ گار کو پکڑ کر قانون کے حوالے کرنا تھا۔

لیکن ——

اُس نے نوکری کے آغاز پر ریاست سے وفاداری کا جو حلف اُٹھایا تھا اس میں یہ کہیں نہیں لکھا تھا کہ وہ کسی وطن فروش کو محض اس لیے بھاگ جانے کا موقع دے دے کہ اس میں کچھ سیاسی مصلحتیں کارفرما تھیں۔

اس نے ریاست سے وفاداری کا عہد کیا تھا حکمرانوں سے نہیں۔

اور آج وہ یہی عہد نبھانے جا رہا تھا۔

اس نے جیپ پارکنگ میں کھڑی کی اور اس طرف دوڑتا چلا گیا جدھر سے باباصاحب نے لاؤنج میں جانا تھا۔

اچانک ہی جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

سامنے کی سیڑھیوں سے باباصاحب کا خون آلود جسم لڑھکنیاں کھاتا نیچے آ رہا تھا۔ اس کے تعاقب میں عارف میاں چلے آ رہے تھے۔

عارف میاں کے ہاتھوں میں پکڑی آٹومیٹک گن سے گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ انہوں نے شاید زندگی کے مضبوط ترین لمحات میں یہ عظیم ترین فیصلہ کیا تھا۔

ابھی تک انہیں یہاں قانون کا ایسا کوئی محافظ دکھائی نہیں دیا تھا جو

باباصاحب کو روکنے کی ہمت کرتا۔

وہ وی آئی پی لاؤنج سے سیدھے جہاز میں سوار ہو جاتے اور عارف میاں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بھیڑیا بچ کر جانے پائے۔

"باباصاحب —— ابھی اس زمین کی کوکھ بانجھ نہیں ہوئی۔ ماؤں نے ابھی وطن پرستوں کو جنم دینا بند نہیں کیا۔ تم اس زمین کے غدار تھے۔ تمہارا حساب یہیں ہونا تھا —— ہو گیا —— ہو گیا ——"

اُس نے مُردہ باباصاحب کے جسم کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

اچانک ہی عارف میاں کو اپنے پہلو میں انگارے اُترنے کا جان لیوا احساس ہوا۔ حفاظتی دستے میں باباصاحب کے کسی جانثار نے حساب برابر کر دیا تھا ——!!

اس نے بمشکل گردن گھمائی۔

سامنے سے گل شبیر خان بھاگتا آ رہا تھا ——!

مینارِ پاکستان کی طرح عارف میاں اپنے قدموں پر جم کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے دوست کے استقبال میں دونوں بازو پھیلا دیے۔

"خان بھائی —— میں نے مار دیا۔ میں نے اس کتے کو جہنم رسید کر دیا۔ خدا میرے گناہ معاف کرے۔ خدا میرے وطن کی حفاظت کرے ....."

اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"تو بازی لے گیا —— مجھ سے بازی لے گیا —— عارف —— عارف ——"

گل شبیر خان نے اس کے مردہ جسم کو اپنے سینے پر تھام رکھا تھا —— مینارِ پاکستان اپنی پوری عظمت اور جاہ و جلال کے ساتھ اس کے کلیجے سے چمٹ گیا تھا۔

"ہٹ جاؤ —— پرے ہٹ جاؤ —— بزدلو —— بے غیرتو —— دفع ہو جاؤ۔ غدارو تم اس قابل نہیں ہو کہ اور وطن کے اس شہید کے چہرے کی زیارت کر سکو۔"

اس نے عارف میاں کا لاشہ ابھی تک کلیجے سے لگا رکھا تھا۔

اِک عالمِ وحشت تھا ___ جس نے اس کے بدن میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ وہ کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دے رہا تھا۔

اس طرح عارف میاں کا لاشہ اپنے کلیجے سے لگائے وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے کھڑے کھڑے اپنا پستول ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔

مختلف ایجنسیوں کے لوگ ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ انہوں نے فائرنگ کرنے والے کو قابو کر لیا تھا۔ بابا صاحب کے ساتھ جانے والوں کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ بابا صاحب کے چہرے پر لعنت برسنے لگی تھی۔

کوئی اس کی طرف ایک لمحے سے زیادہ نہیں دیکھ رہا تھا۔

یہ مقامِ عبرت تھا۔

کل تک اس شہر کے بلا شرکتِ غیرے حاکم کی لاش بے یار و مددگار پڑی تھی۔

"بیٹا یہ مر چکا ہے ___ بس اس کا کام ختم ہوا۔ اسے آرام کرنے دو۔ دیر نہ کرو۔ آسمانوں پر اس کا انتظار ہو رہا ہے عارف میاں اب یہاں نہیں ہیں۔ اللہ نے اُن سے جو کام لینا تھا لے لیا۔ ہم کون ہوتے ہیں اس کے کاموں میں مداخلت کرنے والے۔ یہ بدن اب زمین کی امانت ہے۔ آؤ اسے زمین کو واپس لوٹا دیں۔"

گل شیر کو اپنے کندھے پر مہربان ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔

یہ اس کے انچارج آفیسر تھے۔ جن کے نورانی چہرے کو وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے گل شیر کے ہاتھ سے پستول پکڑ کر اس کے ہولسٹر میں واپس

ڈال دیا اور اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے عارف میاں کا لاشہ بڑے احترام سے اس سٹریچر پر بچھا دیا جو یہاں تک لایا گیا تھا۔

گل شیر کا سارا بدن لرز رہا تھا۔

اس کے کپڑے عارف میاں کے خون سے رنگین ہو رہے تھے۔

وہ دونوں پاؤں پر عارف میاں کے سرہانے بیٹھ گیا۔ ہلالِ احمر والوں نے ایک چادر اس کے جسم پر ڈال دی تھی۔

اچانک جیسے گل شیر کا کلیجہ پھٹ گیا۔

اُس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

وہ بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگا تھا۔ پھر اس نے اپنی حالت پر بہادروں کی طرح قابو پا لیا۔

ہلالِ احمر والے اب لاش ایمبولینس میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس نے عارف میاں کے چہرے پر پڑی چادر سرکا دی۔ نور کا ایک ہالہ اس کے چہرے کے گرد تن گیا تھا۔ اس نے زندگی میں ایسا پُرسکون چہرہ نہیں دیکھا تھا ___!!

جھک کر گل شیر خان نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کھڑے ہو کر اس کو سیلوٹ کیا۔

اس کے تعاقب میں کھٹاک کھٹاک کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ یہاں موجود ہر شخص اس کی تقلید میں عارف میاں کی عظمت کو سیلوٹ مار رہا تھا۔

ہلالِ احمر کے رضاکار عارف میاں کا جوان لاشہ اُٹھائے ٹرمینل سے باہر جا رہے تھے۔

یہاں موجود لوگ دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہو کر جیسے اُسے گارڈ آف آنر پیش کر رہے تھے ___!!

لاش ایمبولینس میں رکھ دی گئی ـــــ ساڑھے نو بجے اور عارف میاں اپنی ابدی آرام گاہ کی طرف چل دیے۔

اُن کی ایمبولینس کے تعاقب میں سرکاری ایجنسیوں کی گاڑیاں جلوس کی صورت میں جارہی تھیں۔ بالکل یوں جیسے حاکمِ شہر کو تکریم دی جاتی ہے۔

وہی تو تھا۔

حاکمِ شہر ـــــ!!

شہرِ نگاراں کی آن، پہچان۔

وہی تو تھا ـــــ!!